گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

ساوان نمبر

ستمبر 2022

قیمت 150 روپے

بانی

معراج رسول

دلشاد نسیم اور ناہید سلطانہ اختر کے دلنشیں ناول

شبینہ گل، ہاجرہ ریحان و نبیلہ ابر راجا کی دلکش تحریریں

ڈاکٹر طیبہ صفی علوی کی خوشگوار آمد

اداریہ

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

منی ناول

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: خیشل رسول صفا، اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313 ,35802552, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

وہ بولے اگر اس نے چرایا ہے تو یقیناً اس سے پہلے اس کا بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔ پس یوسفؑ نے اس کو اپنے دل میں چھپائے رکھا اور اسے ان پر ظاہر نہ کیا۔ اس نے کہا تم بہت ہی برے لوگ ہو، اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔ (۷۷) وہ بولے اے عزیز! یقیناً اس کا باپ بہت بوڑھا ہے۔ پس تو اس کی جگہ ہم میں سے ایک کو لے لے۔ بے شک ہم تجھے احسان کرنے والوں میں سے دیکھتے ہیں۔ (۷۸) اس نے کہا اس بات سے خدا کی پناہ کہ جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے، اس کے سوا کسی اور کو پکڑ لیں۔ تب یقیناً ہم بھی ظالم ہوں گے۔ (۷۹) پھر جب وہ اس (یوسف) سے ناامید ہو گئے۔ تو مشورے کے لیے الگ ہو بیٹھے۔ ان میں سب سے بڑے نے کہا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے تم سے خدا کے سامنے ایک پختہ عہد لیا تھا۔ اور پہلے سے ہی تم یوسف کے بارے میں کیا کچھ زیادتی کر چکے ہو۔ پس میں اس زمین کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ میرا باپ مجھے اجازت نہ دے گا یا اللہ ہی میرے لیے کوئی فیصلہ نہ کرے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (۸۰) تم سب اپنے باپ کے لوٹ جاؤ۔ پھر کہو اے ہمارے باپ یقیناً تیرے بیٹے نے چوری کی۔ اور ہم نے نہیں گواہی دی مگر اس چیز کی جس کا ہمیں علم ہوا۔ اور ہم غیب کے نگہبان نہیں تھے۔ (۸۱) اور تو اس بستی سے پوچھ لو جس میں کہ ہم تھے۔ اور اس قافلہ سے (بھی) جس میں ہم آئے۔ اور ہم یقیناً سچے ہیں۔ (۸۲) (یعقوبؑ نے) کہا (ایسا نہیں ہے) بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے ایک بات بنالی ہے۔ پس صبر ہی بہتر ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس لے آئے۔ یقیناً وہ بہت جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔ (۸۳) اور اس نے ان سے منہ پھیر لیا اور کہنے لگا ہائے افسوس یوسف پر، اور غم واندوہ کی وجہ سے اس کی دونوں آنکھیں سفید ہو گئیں۔ پس وہ غصے کو بہت پینے والا تھا۔ (۸۴) وہ بولے خدا کی قسم تو ہمیشہ یوسف ہی کا ذکر کرتا رہے گا، تا اینکہ تم مضمحل ہو جاؤ، یا ہلاک ہونے والوں میں ہو جاؤ۔ (۸۵) اس نے کہا سوائے اس کے نہیں کہ میں اپنی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت اللہ سے کرتا ہوں اور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔ (۸۶) اے میرے بیٹو! جاؤ پھر یوسف اور اس کے (سگے) بھائی کی خبر لو۔ اور تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ یقیناً کافروں کی قوم کے سوا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کوئی بھی ناامید نہیں ہوتا۔ (۸۷) پھر جب وہ اس (یوسفؑ) کے پاس آئے تو انہوں نے کہا اے عزیز ہمیں اور ہمارے کنبہ والوں کو تکلیف پہنچی ہے، اور ہم تھوڑی پونجی لے کر آئے ہیں، پس تو ہمیں پورا ماپ (غلہ) دے اور ہم پر احسان کر یقیناً اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو (نیک) جزا دیتا ہے۔ (۸۸) اس نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے (سگے) بھائی کے ساتھ کیا (سلوک) کیا تھا جبکہ تم نادان تھے۔ وہ بولے کہ کیا تو ہی یوسف ہے؟ اس نے کہا میں (ہی) یوسفؑ ہوں، اور یہ میرا (سگا) بھائی ہے۔ یقیناً ہم پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا ہے۔ بے شک جو پرہیزگار رہے اور صبر کرے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (۹۰)

(سورۂ یوسف ۱۲، پارہ ۱۳، آیات ۷۷ تا ۹۰)
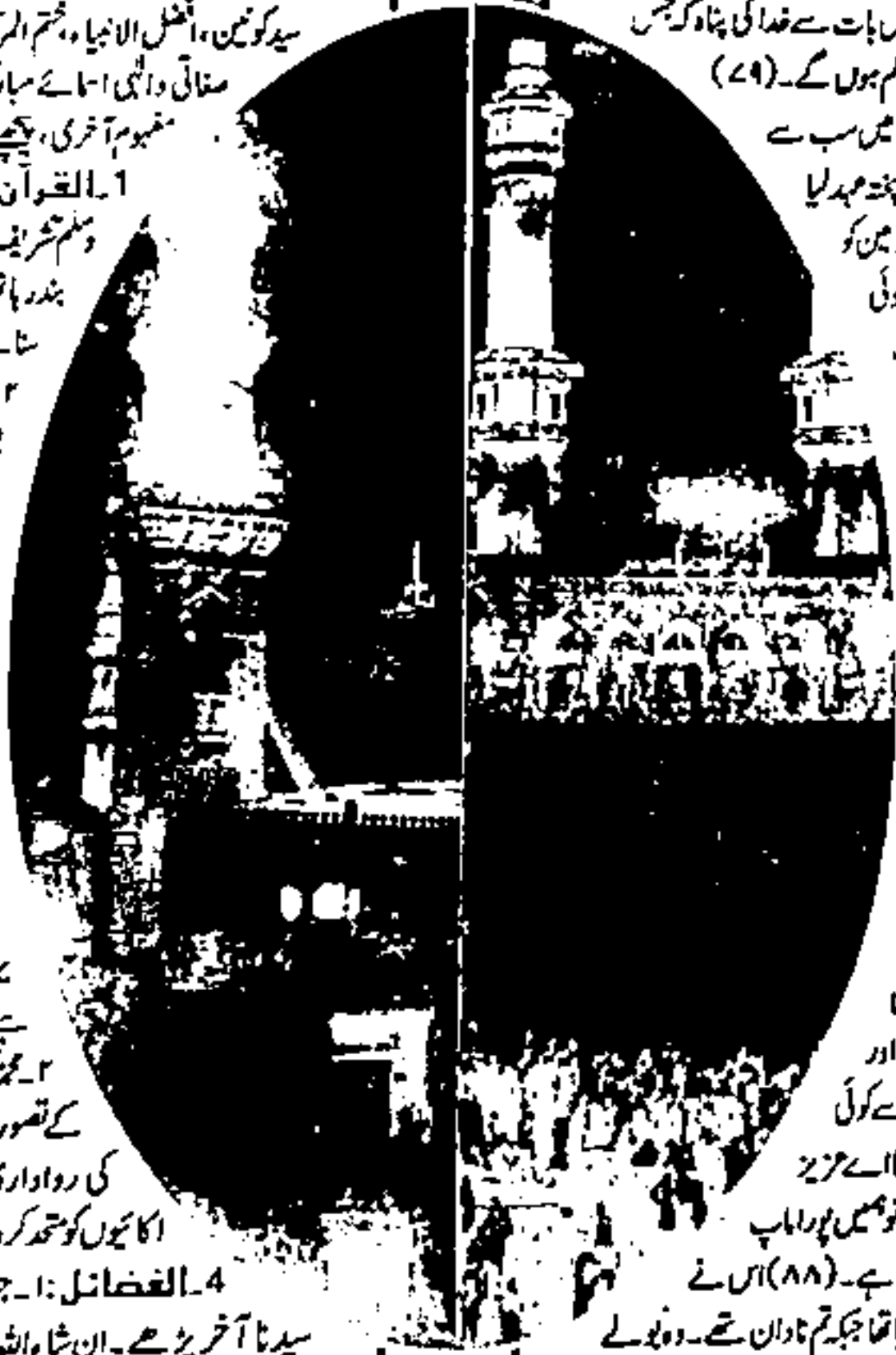
آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْاٰخِرِيْنَ

سید کونین، افضل الانبیاء، ختم المرسلین، رحمۃ العالمین، نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی والٰہی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم آخری، پیچھے کے ہیں۔

1۔ **القرآن:** ۱۔ اے اہل کتاب! بے شک تمہارے پاس ہمارے یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے کہ تم پر ہمارے احکام ظاہر فرماتے ہیں۔ بعد اس کے کہ رسولوں کا آنا مدتوں بند رہا تھا تاکہ تم یہ نہ کہو کہ تمہارے پاس کوئی خوشی یا ڈر سنانے، الانہیں آیا تو یہ خوشی اور ڈر سنانے والے تمہارے پاس تشریف لائے ہیں اور اللہ کو سب پر قدرت ہے۔

۲۔ اور ہم نے تم سے پہلے اگلی امتوں میں بھی پیغمبر بھیجے تھے۔

2۔ **الحدیث:** ۱۔ حضرت مصعبؓ بن سعد، حضرت کعبؓ الاحبار سے روایت کرتے ہیں کہ پہلا شخص جو بہشت کے کنڈے کو تھامے گا اور بہشت کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا جائے۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں پھر انہوں نے تورات پڑھی کہ وہ آخری نبی ہیں جو پہلوں اور پچھلوں کے سردار ہیں۔
(ابن عساکر)

۲۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں۔ (بخاری و مسلم)

3۔ **الواقعے:** ۱۔ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ کا دین عیسائیت سے نکلا ہے جبکہ محمدؐ فرماتے ہیں کہ یہودیت، مسیحیت اور اسلام سب ایک ہی خدا کے بھیجے ہوئے پیغامات ہیں البتہ اسلام آخری اور کامل دین ہے۔ روحانیت یہاں اپنی معراج پر ہے۔ یہاں جنت بخشش کے طور پر عطا نہیں ہوتی۔ البتہ ایمان اور اعمال کے نتیجے میں ملتی ہے جس سے انسانیت کی بلکہ مخلوق کی بھلائی کا سامان ہوتا ہے۔ (تھامس کارلائل)

۲۔ محمدؐ بلاشبہ شک وشبے کے بغیر، اپنے عہد سے کئی صدیاں آگے تھے وہ اپنے خدا کے تصور میں ایک ماڈرن (جدید) انسان تھے۔ بیسویں صدی کے جدید انسان، یہ ان کی رواداری تھی جس نے اسلام کو ایک ایسی روحانی قوت بنادیا جس نے بہت سی قومی اکائیوں کو متحد کر دیا۔ (اے جی لیونارڈ)

4۔ **الفضائل:** ۱۔ جو کوئی چاہے کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو تو وہ ہر نماز کے بعد 200 مرتبہ یہ اسم پاک سیدنا آخر پڑھے۔ ان شاء اللہ اس کا خاتمہ ایمان کی حالت میں ہوگا۔

۲۔ جو چاہے کہ اس کے دل میں اس کے پیارے رسولؐ کی محبت موجزن ہو جائے تو وہ روزانہ باوضو حالت میں ایک ہزار مرتبہ اس اسم پاک کو پڑھنے کا معمول بنالے ان شاء اللہ مطلوبہ مقصد میں کامیابی ہوگی۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس)

اذنِ بہار

ناہید سلطانہ اختر

پیام آئے ہیں اس یارِ بے وفا کے مجھے..... جسے قرار نہ آیا کہیں بھلا کے مجھے
جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عمر بھر نہ ملیں..... فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے
میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے..... اداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

انسانی زندگی مجموعہ ہے رشتوں کا، ناتوں کا، باہمی سماجی تعلقات کا... یہ رشتے خون کے رشتے بھی ہوتے ہیں... سلوک اور سمجھوتے کی کبھی مضبوط تو کبھی کمزور ڈور سے بھی بندھے ہوتے ہیں مگر پھر بھی آخری سانسوں تک چلتے ہیں۔ ان آتی جاتی سانسوں کے بیچ زمانے گزرتے چلے جاتے ہیں، کتنی ہی رُتیں، کتنے ہی موسم بیتتے چلے جاتے ہیں شاید یہی زندگی کی اصل کہانی ہے۔

مگر انہی کہانیوں میں کبھی خزاں کا موسم چھا جاتا ہے تو کبھی بہار اپنے رنگ و خوشبو بکھیرتی ہے اور انسانی رشتے ناتے اسی کے زیرِ اثر بنتے چلے جاتے ہیں

انہی رشتوں میں ایک انوکھا آفاقی رشتہ خوب صورت سا ناتا شوہر اور بیوی کا ہے جو صرف حسن سلوک، سمجھوتے، مروت اور رواداری کے آبِ حیات کا متقاضی ہوتا ہے۔ جبھی اس سے دیگر دلکش رشتے جنم لیتے ہیں۔ آبِ حیات پر موسم کے تغیرات کیسے، کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ سب جاننے کے لیے پڑھیے...

رشتوں کا نشیب و فراز اور زیر و بم سمجھاتی ایک دلفریب داستان......

قسط 08

وقت کی اڑان حیرت انگیز تھی... پر لگا کر اڑا تھا...... چھ سال گزر گئے تھے۔ دُرّیہ کو تو یوں لگتا جیسے کل ہی کی بات تھی جب وہ طالب سے شادی کے بعد اس گھر میں آئی تھی... مگر اب تو یہ احساس تھا جیسے وہ ہمیشہ سے اسی گھر میں رہ رہی تھی۔ میکے جاتی تو تھوڑی ہی دیر میں دل اچاٹ ہونے لگتا...... اپنا گھر، اپنا کمرا یاد آتا۔

''دُرّیہ کبھی تو ایک رات کو رک جایا کرو یہاں...'' امی کبھی، کبھی بہت پیار، بہت لجاجت سے کہتیں۔

''امی اپنے کمرے کے سوا مجھے کہیں نیند نہیں آتی......'' وہ عذر تراشتی۔

''ہاں...... جیسے یہاں تو تم کبھی رہی ہی نہیں......'' امی خفگی سے کہتیں۔

''سوری امی...... اصل میں صبح کو طالب کو ناشتا وغیرہ بھی تو دینا ہوتا ہے۔''

''ایک دن تم نہ دو گی تو کیا...... باپ بیٹا مل کر کر لیں گے ناشتا...... نوکر بنا دے گا ناشتا......''

''وہ تو بنا دے گا مگر انہیں میرے ہاتھ کے بنے ناشتے کی عادت ہو گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے جاؤ بیٹی جاؤ......'' ابو اس کی حمایت میں کہتے...... ''تمہاری امی اپنی محبت سے مجبور ہیں ورنہ یہ تو ان کو بھی معلوم ہے کہ طالب کے لیے تمہارے جیسا ناشتا کوئی دوسرا نہیں بنا سکتا...... ایک عمر یہ مجھے ناشتا بنا کر دیتی رہی ہیں کہ نہیں، ان کے ہاتھ کا مزہ لاجواب ہوتا تھا...... مرد دو عورتوں کے ہاتھ کا ذائقہ کبھی نہیں بھولتا...... ایک اپنی ماں کے ہاتھ کا ذائقہ...... دوسرا اپنی بیوی کے ہاتھ کا......''

''ارے ہاتھ پاؤں ساتھ دیتے تو میں تو اب بھی آپ کو ناشتا، کھانا خود ہی دیتی......'' امی روہانسی ہو جاتیں۔

''کوئی بات نہیں شفیقہ بیگم...... جنت میں ملیں گے تب تو آپ جوان ہوں گی۔''

''وہاں عورتوں کو ناشتا اور کھانا پکانے کی علت تھوڑی ہوگی...... دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوں گی...... پھلوں کے خوشے ہوں گے...... ارے جنت کے میووں کا ذائقہ تو ماں اور بیوی کے ہاتھ کا ذائقہ بھی بھلا دے گا۔''

ابو، دُرّیہ کو معنی خیز اشارہ دیتے کہ وہ موضوع بدلنے کا فائدہ اٹھا سکتی تھی۔

''اچھا امی...... جا رہی ہوں......''

''جاؤ...... فی امان اللہ......!'' امی بھول جاتیں کہ ابھی ذرا دیر پہلے وہ دُرّیہ کو ایک رات میکے میں روکنے کو کتنی مصر ہو رہی تھیں۔

دُرّیہ کی شادی کے بعد چھ برسوں میں امی اور ابو دونوں ہی مزید بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ امی کی تو اب گردن ہلنے لگی تھی۔ ابو چلتے تو ہر قدم یوں دیکھ بھال کر اور احتیاط سے اٹھاتے جیسے کوئی بچہ چلنا سیکھ رہا ہو...... دُرّیہ کو امی، ابو دونوں پر بہت ترس آتا...... یہ وہ ہستیاں تھیں جنہوں نے اسے اور اس کے بھائی، بہنوں کو زندگی کے راستے پر صرف چلنا نہیں بھاگنا دوڑنا سکھایا تھا...... راہِ حیات کی اونچ نیچ سے آشنا کیا تھا...... ناہمواریوں سے بچنے اور ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی سنبھل جانے کے گُر بتائے تھے...... دُرّیہ کو جب امی اور ابو کی ضعیفی کا احساس رنجور کرتا تو وہ وہی آیت دل ہی دل میں دُہراتی جس کا ترجمہ ہے۔

''اے اللہ میرے ماں، باپ پر اسی طرح رحم فرما جیسے میرے بچپن میں انہوں نے میری پرورش کی۔'' (سورۂ بنی اسرائیل آیت 24 کا آخری حصہ)

گزرے چھ برسوں کے دوران زینب کے ہاں بیٹے عبدالوارث کے بعد ایک بیٹی عنایہ نے دنیا میں آ کر بقول حارث فیملی کو مکمل کر دیا تھا۔ عجیب بات تھی۔ پچھلی نسلوں میں دس، دس، بارہ، بارہ بچے پیدا کرنے والے ماں، باپ بھی کنبے میں مزید اضافے کے تمنائی رہا کرتے اور اب ایک بیٹا، ایک بیٹی ہونے کے بعد مائیں بالخصوص اپنی واٹس ایپ آئی ڈی پر ''الحمدللہ یو کمپلیٹڈ اَس۔'' کا اسٹیٹس لگا دیتی ہیں...... زینب کی طرح...... جبکہ فیضان اور ہانیہ تو

ایک بیٹے کے بعد دوسرے بچے کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ریحان تو فیضان سے بھی دو ہاتھ آگے جاتا نظر آتا تھا۔ ایک مقامی ادارے میں بحیثیت فنانس منیجر ملازمت کر رہا تھا۔ مزید برآں انفارمیشن ٹیکنالوجی میں اپنی مہارت کے باعث آن لائن بھی کام کرتا تھا مگر طالب اس سے جب بھی شادی کی بات کرتے وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال جاتا۔

''جلدی کیا ہے پاپا......''

''دیر کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں......'' طالب کہتے۔

''بس ریحان اب شادی کر لو......'' دُرّیہ بھی ریحان کو اکساتی...... وہ اسے بھی ہنس کر ٹال جاتا۔ ''ریحان کی شادی کریں...... وہ ٹال جاتے ہیں اور آپ بھی خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' دُرّیہ طالب سے کہتی۔

''تو پھر کیا کروں......؟''

''زبردستی کریں......''

''شادی کے لیے آمادگی ضروری ہے...... اس کا شادی سے انکار کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ ابھی شادی کے لیے تیار نہیں...... تم آمادہ کر سکتی ہو تو کر لو...... ہمارا کام تو یہی ہوگا کہ اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کی شادی کر دیں......''

''بہت دفعہ کہہ چکی ہوں، مجھے تو وہ ہنس کر ٹال دیتے ہیں...... آپ زبردستی کریں، دباؤ ڈالیں...... بچوں کی شادی وقت پر کر دینی چاہیے۔''

''اچھا دیکھو...... پھر کرتا ہوں بات اس سے......''

اس یقین دہانی کے بعد اسی روز رات کے کھانے کے دوران طالب نے ریحان کو مخاطب کیا۔

''ریحان بس اب تم انکار نہیں کرو گے...... تمہاری شادی ہو جانی چاہیے......''

''کیوں پاپا......؟'' اس نے بے ساختہ چونک کر باپ کو دیکھا پھر دُرّیہ کو ایک نظر دیکھتے ہوئے باپ سے بولا۔ ''کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے......؟''

''کیا مطلب......؟'' طالب اسے دیکھنے لگے۔

''میرا مطلب ہے...... میری کس غلطی کی سزا میں میری شادی ہو جانی چاہیے......''

''غلطی......؟'' طالب نے توجہ اپنی پلیٹ پر مبذول رکھی۔ ''غلطی یہ ہے۔ بیٹا کہ ماشاء اللہ شادی کی عمر ہے...... خود کفیل ہو...... تم سے بڑے دونوں بھائی بہن کی شادی ہو چکی ہے...... اب تمہارا نمبر ہے...... دیر کیوں کی جائے......''

''پہلے میرب کی ہو جائے......''

''میرب کی بھی ہو جائے گی...... ویسے بھی وہ تم سے چھوٹی ہے۔''

''کوئی بات نہیں پاپا...... مجھ سے چھوٹی ہے تو کیا شادی تو اس کی کرنی ہے ناں......''

''کرنی تو تمہاری بھی ہے...... بہت ہو چکا...... تمہاری آنٹی اور میں تمہارے لیے مناسب رشتہ دیکھنے جا رہے ہیں......''

''کہاں جا رہے ہیں؟'' ریحان نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا۔

''جا کہیں نہیں رہے...... تمہارے لیے مناسب رشتہ دیکھتے ہیں...... لڑکیاں رشتے داروں میں بھی ہیں...... فیملی فرینڈ گھرانوں میں بھی...... تمہیں بتا کر ہی بات کریں گے......'' طالب مسکرائے۔

ریحان نے پہلو بدلا اور قدرے مضطرب دکھائی دینے لگا۔

''ابھی نہیں پاپا......'' اس نے دبی زبان سے کہا۔

''یار لڑکی دیکھنا بھی ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے...... اس مرحلے سے تو گزریں......'' وہ خاموش رہا...... دُرّیہ چپ

چاپ دونوں کی گفتگو سنتی رہی۔
اگلے دن ریحان معمول کے مطابق وقت پر دفتر جانے کے بجائے کچھ دیر سے تیار ہونے کے بعد دُرّیہ کے پاس آیا۔
''آنٹی! آپ سے کچھ بات کرنی ہے مجھے......''
دُرّیہ جو طالب کے جانے کے بعد اپنے روزمرہ معمولات میں مصروف تھی چونکی کہ ریحان کا لہجہ خاصا معنی خیز تھا۔
''ہاں...... بولو......''
''ایسے نہیں......''
''تو پھر کیسے؟''
''آپ اپنے کام چھوڑیں...... میری بات سنیں......''
''اوکے......!'' دُرّیہ مسکرائی۔
دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے...... ریحان کشمکش میں نظر آتا تھا۔ دُرّیہ سمجھ گئی وہ کچھ خاص ہی بات کرنا چاہتا تھا اور اسے اپنے تجربۂ حیات کے پیشِ نظر یہ اندازہ بھی تھا کہ وہ خاص بات کیا ہو سکتی تھی۔
''ہاں ریحان...... بولو......'' اس نے کہا۔
اس نے ایک نظر دُرّیہ کو دیکھا پھر گومگو کیفیت میں گویا ہوا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کیسے بتاؤں......''
''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھو اور شروع ہو جاؤ......'' دُرّیہ لائٹ موڈ میں بولی۔ ریحان نے پہلو بدلا اور اسے مددطلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔
''کوئی لڑکی پسند ہے......؟'' دُرّیہ نے کہا۔
''آپ کو کیسے معلوم......؟'' ریحان نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا اور بے ساختہ بولا۔
''کسی شاعر نے کہا ہے...... آدمی پہچانا جاتا ہے قیافہ دیکھ کر...... خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر......'' دُرّیہ مسکرائی۔
''پاپا کو مت بتایئے گا ابھی......''
''تو کیا تب بتاؤ گے جب وہ تمہارے لیے کوئی لڑکی دیکھ لیں گے......'' دُرّیہ نے توقف کیا۔ ''بائی داوے کون ہے؟ کہاں ہوتی ہے؟ کب سے جانتے ہو......؟''
''میری کالج فیلو ہے......''
''اچھا...... تو پرانا قصہ ہے...... محلِ وقوع تو تم نے بتا دیا...... اب ذرا حدود اربعہ بھی بیان کر دو......''
''میں سمجھا نہیں......'' ریحان جو بات کھل جانے کے بعد اضطراب سے نکل آیا تھا بولا۔
''یہ بتاؤ کیسی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ والدین؟ بہن، بھائی؟ اور کالج چھوڑے تو کافی عرصہ ہو گیا ہوگا، اب کیا کر رہی ہے؟''
''بتاتا ہوں...... کیسی ہے کا جواب یہ ہے کہ اچھی ہے......''
''تمہاری پسند ہے تو اچھی ہی ہوگی......''
''گارڈن ویسٹ میں رہتی ہے...... فادر ریٹائرڈ فرام گورنمنٹ سروس، مدر ہاؤس وائف...... ایک بھائی اور دو بہنیں...... تینوں اس سے بڑے اور تینوں میریڈ...... وہ خود بینک میں جاب کر رہی ہے......''
''نام؟''
''بتا دوں گا......''

''اوکے......''
''ایک مسئلہ ہے۔'' ریحان کے لہجے میں گہری فکرمندی تھی۔
''وہ کیا؟'' ریحان نے کچھ ہچکچاتے ہوئے مسئلہ بیان کیا...... جس کے تحت لڑکی کا تعلق ایک ایسے روحانی فرقے سے تھا جس کے عقائد و نظریات اسلامی نظریۂ حیات سے مختلف بلکہ متصادم تھے۔ ''بہت ٹیڑھا مسئلہ ہے ریحان......'' دُرّیہ نے مسئلے کی نوعیت جان کر کہا۔
''اتنا ٹیڑھا بھی نہیں......'' ریحان جو ذرا دیر پہلے مسئلہ بیان کرتے بھی ہچکچا رہا تھا اب قدرے دلیری سے بولا۔
''ہے ریحان......''
''نہیں ہے......'' وہ مصر ہوا...... ''میرا ایک دوست ہے اس نے بھی اسی کمیونٹی کی لڑکی سے شادی کی ہے...... بہت خوش ہے...... دونوں کی ایک بیٹی بھی ہو گئی ہے۔''
''تو کیا تم اسی سے انسپائر ہوئے ہو۔'' دُرّیہ نے ریحان کو تنقیدی نظروں سے دیکھا۔
''نہیں نہیں...... میرے دوست نے تو دو سال پہلے شادی کی تھی۔ وہ تو میری کالج فیلو رہی ہے...... میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ اس کمیونٹی کی لڑکی سے شادی کرنا کوئی عجیب بات نہیں...... پاپا کے ایک جاننے والے افتخار علی صاحب نے بھی اسی کمیونٹی میں شادی کی تھی۔ اب تو ان کے بچے بھی شادی شدہ ہیں۔''
''تمہارے پاپا ان مثالوں سے کنونس نہیں ہوں گے ریحان۔''
''آپ کا مطلب ہے، وہ راضی نہیں ہوں گے......''
''جہاں تک میں تمہارے پاپا کے مزاج کو سمجھ سکی ہوں ایسا ہی ہے......''
''آپ ان سے ذکر تو کریں......'' ریحان بولا۔
''میری ہمت نہیں ہوگی۔'' وہ گھبرا کر بولی۔
''آپ تو ایسے پریشان ہو رہی ہیں جیسے میں مریخ پر رہنے والی کسی خلائی مخلوق سے شادی کرنے کی بات کر رہا ہوں......''
''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارے پاپا اپنے دینی عقائد میں کتنے کٹر ہیں......''
''وہ بھی تو مسلمان ہی ہے آنٹی......''
''ان کے عقائد ہم سے بہت مختلف ہیں ریحان...... ایک زمانے میں ہم لوگ ایسے علاقے میں رہا کرتے تھے جہاں نزدیک ہی اس کمیونٹی کی ایک کالونی بھی آباد تھی...... مجھے معلوم ہے ان لوگوں کا بنیادی عقیدہ، شرک کی حدود تک جاتا ہے اور شرک...... ہم مسلمانوں کے عقیدۂ توحید کے مطابق سب سے بڑا اور ناقابلِ معافی گناہ ہے۔''
''آنٹی...... میں...... میں اسے اپنے عقیدے پر لے آؤں گا...... آخر غیر مسلم بھی تو کنورٹ ہو ہی جاتے ہیں...... وہ تو پھر مسلمان ہے۔''
''کہنے کی حد تک......''
''چلیے...... مانے لیتا ہوں......''
''مانتے ہو تو...... اپنے دل کو سمجھاؤ......''
''نہیں آنٹی...... اس سے میری بہت گہری انڈراسٹینڈنگ ہے۔''
''تمہارے پاپا نہیں مانیں گے......''
''پلیز......! آپ بات تو کریں...... انہیں پریشر میں لیں...... قائل کریں...... آپ کو تو قائل کرنا آتا ہے۔''
''نکال باہر کریں گے وہ مجھے اس گھر سے......''

''ارے نہیں...... وہ اتنے عادی ہو گئے ہیں آپ کے کہ ایسا رسک نہیں لے سکتے......''
''غلط فہمی ہے تمہیں......''
''نہیں، نہیں...... سچ کہہ رہا ہوں...... پاپا اب پوری طرح سے آپ کے کنٹرول میں ہیں...... آپ کی بات نہیں ٹال سکتے۔''
''آئی ایم سوری ریحان...... میں یہ بات نہیں کر سکتی ان سے۔'' دُرّیہ نے کچھ عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔
''ہاں، آپ کے چہیتے تو بس فیضان بھائی تھے ناں...... ہانیہ بھابی سے ان کی شادی کے لیے آپ نے پاپا کو کس طرح قائل کیا۔ بلکہ فوری آمادہ کیا۔''
''وہاں ایسی کوئی قباحت نہیں تھی ناں......''
''یہاں بھی نہیں ہے...... بس آپ ایک دفعہ پاپا کو راضی کرلیں باقی کام میرا...... میں اسے نکال لوں گا اس کے غلط عقائد سے۔''
''ریحان...... پلیز، پلیز سمجھنے کی کوشش کرو...... میں نہیں کر سکتی یہ بات......''
''اتنا تو کر سکتی ہیں کہ پاپا سے کہیں...... ریحان کو آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''
''ہاں...... یہ میں ضرور کر سکتی ہوں......''
''چلیے...... اتنا ہی کر دیجیے...... آگے میں خود بات کرلوں گا......''

☆☆☆

''ریحان آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں......'' دُرّیہ نے خاصے محتاط لہجے میں طالب سے کہا۔
طالب نے چونک کر اسے دیکھا۔ زمانہ شناس آدمی تھے۔ سمجھ گئے کہ کوئی غیر معمولی بات ہی ہے جو کہنے سے قبل ریحان کو دُرّیہ سے پیش لفظ بیان کرانے کی ضرورت پڑی۔ گھر میں چھڑا تازہ ترین موضوع ریحان کی شادی تھی سو دُرّیہ کو دیکھتے ہوئے بولے۔
''تمہیں تو معلوم ہوگا...... کیا بات ہے......؟''
وہ شپٹا گئی...... انکار کی ہمت نہ تھی...... امی کی لاتعداد کار آزمودہ باتوں میں سے ایک یہ بات بھی اس کے دامنِ دل سے بندھی تھی کہ بیوی اپنے شوہر سے کچھ مت چھپائے، نہ جھوٹ بولنے کی کوشش کرے...... انسانوں کے تمام رشتے ناتوں میں یہی ایک رشتہ مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا رفیقِ زندگی بناتا ہے...... جسم و جاں کی ایسی قربت کسی اور رشتے میں ہوتی ہے بھلا......! تو جب رفیقِ زندگی بن گئے تو دکھ سکھ، راز و نیاز سب مشترک ہو گیا...... شوہر کتنا ہی سادہ اور سیدھا کیوں نہ دکھائی دے بیوی اسے بیوقوف ہرگز نہ سمجھے۔ عورت اس کی پسلی سے تو پیدا ہوئی ہے...... اس کے جسم کا حصہ ہے...... یہ کیسے ممکن ہے کہ پسلی کی کسی حرکت کا باقی جسم کو پتا نہ چلے...... عورت کو چاہیے اپنے مرد سے ہمیشہ سچ بولے۔
''جی......'' دُرّیہ کو انکار کی جا نہ ملی۔
''کوئی لڑکی ہے جسے وہ پسند کرتا ہے؟'' طالب نے پوچھا۔
''آپ کو کیسے معلوم......؟'' دُرّیہ نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا۔
''اور کیا معاملہ ہو سکتا ہے جس میں اسے بات کرنے کے لیے پہلے تم سے یہ کہلوانے کی ضرورت پڑے کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''
''جی......'' دُرّیہ نے ان کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''یہی بات ہے۔''

''کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟''
''ریحان خود بتائیں گے آپ کو......''
''تمہیں تو بتا دیا ہوگا......''
''جی......''
''ٹھیک ہے...... اس سے کہو...... بات کرے مجھ سے......''
''ایک ریکوئسٹ کر سکتی ہوں......؟'' دُرّیہ کے محتاط لہجے نے طالب کو چونکا دیا۔
''ہاں...... بولو......''
''ناراض نہ ہوئیے گا آپ ریحان پر...... تحمل سے سن لیجیے گا......'' وہ دبی زبان سے بولی۔
''کیا ایسی کوئی بات ہے؟''
''ہو سکتا ہے آپ کو اچھا نہ لگے۔''
''دیکھتے ہیں......''

☆☆☆

رات کھانا کھانے کے بعد کھانے کی میز پر ہی طالب نے ریحان کو مخاطب کیا۔
''ہاں بھئی ریحان تمہاری آنٹی کہہ رہی تھیں...... تم کچھ بات کرنا چاہتے ہو مجھ سے......؟''
ریحان اور دُرّیہ نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا...... اور طالب نے ان دونوں کو۔
ریحان نے پہلو بدلا اور دُرّیہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔
''کہاں چلیں؟'' طالب نے اسے دیکھا۔
''آپ لوگ بات کریں...... میں آتی ہوں......''
''بیٹھو......'' طالب بولے۔
دُرّیہ نے کسی روبوٹ کی طرح طالب کے حکم کی تعمیل کی۔
''جی صاحبزادے......!'' طالب کا روئے سخن ریحان کی جانب تھا۔ ''فرمایئے......؟''
ریحان متذبذب دکھائی دینے لگا۔
''میں منتظر ہوں......'' طالب نے کچھ دیر بعد کہا۔
''آپ بتایئے......'' ریحان نے دُرّیہ سے مدد چاہی۔
''تم خود بتاؤ......''
''لڑکی کا معاملہ ہے......'' طالب نے دونوں کی مشکل آسان کی۔
''جی پاپا......'' ریحان کی آواز دھیمی تھی۔
''کون ہے؟ تفصیل بتاؤ......''
''جی پاپا......'' ریحان سنبھل کر بیٹھا اور اس نے دھیرے، دھیرے تفصیل باپ کے گوش گزار کرنا شروع کی۔
دُرّیہ ڈر رہی تھی کہ جونہی ریحان لڑکی کے ایک مخصوص کمیونٹی سے تعلق کا ذکر کرے گا طالب بھڑک اٹھیں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ طالب خاصے متحمل رہے۔ انہیں متحمل دیکھ کر ریحان بھی کچھ مطمئن سا دکھائی دینے لگا۔ طالب اس کی ساری بات سننے کے بعد گویا ہوئے۔
''بس...... یا کچھ اور......؟''

''جی پاپا......''

''جی پاپا کا مطلب؟''

''بس یہی سب کچھ بتانا تھا مجھے......''

''دیکھو بیٹے......'' طالب دھیرے سے کھنکھارنے کے بعد گویا ہوئے......'' مجھے اس لڑکی کے لیے تمہارے جذبات کا پورا احترام ہے...... ساتھ پڑھنے والوں میں اکثر اس طرح کی انسیت ہو جاتی ہے کہ وہ تمام زندگی ایک دوسرے کا ساتھی بننے کا فیصلہ کر لیتے ہیں...... تم نے اگر یہ فیصلہ کر لیا ہے تو میں تمہارے آڑے آنے کی کوشش نہیں کروں گا...... تم دیکھ چکے ہو کہ ہانیہ سے فیضان کا رشتہ مجھے اگرچہ پسند نہیں تھا اور اس کی وجہ صرف اور صرف تمہاری امی کی اس خواہش کا احترام تھا کہ وہ فیضان کے لیے کسی خوب صورت لڑکی کا انتخاب کرنا چاہتی تھیں حالانکہ میں خود حسنِ صورت سے زیادہ حسنِ سیرت کا قائل ہوں...... خیر میں نے اس معاملے کو الجھایا نہیں...... فیضان کی شادی وہیں کر دی جہاں وہ چاہتے تھے۔ تمہاری آنٹی سامنے بیٹھی ہیں...... انہوں نے اس سلسلے میں فیضان کی بھرپور وکالت کی...... مجھے یقین ہے تمہارے معاملے میں فیضان کے معاملے سے بڑھ کر کرتیں مگر شاید اب نہیں کریں گی......''

''کیوں پاپا......؟''

''کیونکہ جس کمیونٹی کی لڑکی میں تم انٹرسٹڈ ہو اس کے مذہبی عقائد، تہذیب و تمدن، رسوم و رواج ہم سے بہت مختلف ہیں...... اگرچہ ان کی کمیونٹی محدود ہے اور وہ بھی زیادہ تر اپنے ہی روحانی عقائد کے مطابق رشتے کرتے ہیں۔ اور کرنے بھی چاہئیں۔ ایسی شادیاں اگر ہو بھی جاتی ہیں مگر خلفشار رہتا ہے اگلی نسلوں کو اپنی درست سمت کا علم ہی نہیں ہونے پاتا۔ ماں کہتی ہے میرے نقشِ قدم پر چلو...... باپ کہتا ہے میری سمت درست ہے، بچے الجھ جاتے ہیں اور اس الجھاوے میں کبھی، کبھی یکسر گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں......''

''پاپا...... آپ کے دوست افتخار علی انکل نے بھی تو......''

''ہاں......'' طالب نے تائید میں سر ہلایا...... ''جانتے ہو کیا انجام ہوا...... افتخار علی بچوں کو اپنے راستے پر چلانے کے خواہاں تھے بیگم انہیں اپنے عقائد کا پیرو دیکھنا چاہتی تھیں...... بس نتیجہ کیا ہوا بیٹا ملحد ہو گیا...... بیٹی نے غیر مسلم گورے سے شادی کی...... اگلی نسل کا خدا ہی جانے......''

''پاپا...... وہ ہمارے راستے پر چلے گی۔''

''بعض باتیں کہہ دینا آسان ہوتی ہیں......'' طالب نے ریحان کو گہری نظروں سے دیکھا اور بولے۔

''وہ بہت سمجھدار، بہت کوآپریٹو ہے پاپا......''

''یقیناً ہو گی......''

''تو پھر؟''

''تو پھر یہ کہ...... جیسا میں نے تم سے کہا...... میں تمہارے راستے میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کروں گا...... شاید تمہاری شادی میں بادلِ ناخواستہ شریک بھی رہوں...... مگر خوش نہیں ہوں گا......''

''ٹھیک ہے پاپا......'' ریحان نے کہا۔

''ٹھیک ہے'' سے اس کا کیا مطلب تھا وُرّیہ سمجھ نہ پائی مگر حیران تھی کہ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ ریحان کے بات کرتے ہی گھر میں طوفان آ جائے گا...... طالب گرجیں گے، برسیں گے...... بیٹے پر خفا ہوں گے...... عاق کر دینے کی دھمکی دیں گے...... پھر شاید ریحان بھی باپ کا سامنا کرنے کو تن کر کھڑا ہو جائے...... گھر چھوڑ جانے کی دھمکی دے...... مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا...... باپ، بیٹا بیٹھے...... دونوں میں نہایت تہذیب سے مکالمہ ہوا...... کوئی لمبی چوڑی

بحث نہیں... دونوں نے شائستگی سے اپنا اپنا نقطۂ نظر بیان کیا اور بات ختم ہوگئی۔ ضد، نہ ہٹ دھرمی... نہ انا کا بت کھڑا کیا گیا، نہ تعلق داؤ پر لگایا گیا۔ نہ باپ نے بیٹے سے نظر بگاڑی نہ بیٹے نے ناک بھوں چڑھائی... خدا جانے یہ مصلحت کوشی تھی... دھیما پن تھا یا مسائل کو افہام و تفہیم سے حل کرنے اور راہ نکالنے کی مہذبانہ روش۔
دونوں بغیر کسی ناگواری کے اٹھ گئے۔
''ایسا نہ ہو کہ ریحان جذبات میں آکر خود کو کوئی نقصان پہنچا لے'' دُرّیہ کے دل میں عجیب سے واہمے نے سر اٹھایا... میڈیا میں آئے دن ایسی خبریں آتی رہتی تھیں کہ نوجوان نے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے ناراضی پر خود اپنی ہی جان لے لی... ریحان کی دل جوئی کو وہ سونے سے پہلے اوپر اس کے کمرے میں پہنچی۔
''اب کیا ہوگا ریحان؟'' دُرّیہ نے خاصی تشویش سے پوچھا۔
''کس سلسلے میں؟'' وہ مسکرایا۔ دُرّیہ کو اس کی مسکراہٹ میں پُراسراریت محسوس ہوئی۔
''وہی... جس سلسلے میں تم نے اپنے پاپا سے بات کی۔''
''کچھ نہیں...'' اب اس کی مسکراہٹ میں ملال تھا۔
''کچھ نہیں...'' دُرّیہ کو تعجب ہوا... ''کیا مطلب...؟'' اس نے وضاحت چاہی۔
''میں ایسا کوئی کام نہیں کرسکتا۔ جس میں پاپا کی خوشی شامل نہ ہو...'' ریحان نے بہت اطمینان سے کہا۔
دُرّیہ کو حیرت ہوئی... یہ کیسی محبت تھی ریحان کی اس لڑکی سے جو باپ کے ساتھ نصف گھنٹے سے بھی کم کی نشست میں رفو چکر ہوگئی تھی۔
''وہ کیا سوچے گی ریحان۔'' دُرّیہ کو ریحان کی ان دیکھی محبوبہ سے ہمدردی محسوس ہوئی۔
''کچھ بھی نہیں... وہ اس کے لیے تیار تھی۔''
''کیا مطلب...؟''
''وہ خود کہتی تھی... ہم دو مختلف دنیاؤں کے باسی ہیں... تمہارے گھر والے آسانی سے راضی ہوں گے نہ میرے گھر والے...''
''تمہیں دکھ ہوا؟''
''نہیں...''
''کیوں...؟'' دُرّیہ چونکی۔
''پاپا اگر مجھے ڈانٹتے، ناراض ہوتے اور کہتے یہ ہرگز نہیں ہوگا تو شاید مجھے دکھ بھی ہوتا اور مجھے غصہ بھی آتا... لیکن آپ کے سامنے پاپا نے کتنے اطمینان، سکون سے بات کی... میرے راستے کی رکاوٹ نہ بننے کی بات کی بلکہ یہ تک کہہ دیا کہ ہوسکتا ہے میں تمہاری شادی میں با دلِ ناخواستہ شریک بھی رہوں مگر... ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ خوش نہیں ہوں گے...'' ریحان نے توقف کیا پھر بولا۔ ''اتنے اچھے، اتنے ڈیسنٹ اور کیپرڈ مائنڈنگ باپ کو میں ناخوش کیسے کرسکتا ہوں آنٹی...''
''سچ کہہ رہے ہو؟'' دُرّیہ کے دل سے ہنوز وہم رفع نہ ہوا۔
''honestly... بالکل سچ...''
''آئی وش تمہیں اتنی اچھی لائف پارٹنر ملے کہ تم اسے بھول جاؤ...'' دُرّیہ نے تنو کی سی کیفیت میں اپنا ہاتھ ریحان کے شانے پر دھر دیا۔
''آپ مجھے دلاسا دے رہی ہیں...'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''نہیں... میں حیران ہو رہی ہوں کہ تم اور تمہارے پاپا ایک ایسے معاملے سے جو مجھے نہایت مشکل اور طوفان خیز لگ رہا تھا کتنے اطمینان سے نکل آئے۔''
''ایک بات بتاؤں آپ کو...؟'' ریحان نے توقف کیا۔ ''پاپا کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں...''
''میں جانتی ہوں... جانتی ہوں ریحان کہ اپنے پاپا سے تمہاری محبت ہی تمہیں یہاں روکے ہوئے ہے ورنہ شاید... تم بھی... سات سمندر پار بیٹھے ہوتے۔''
''کتنا ٹھیک سمجھتی ہیں آپ...''
''اب تمہارے لیے کوئی اور لڑکی دیکھی جائے؟''
''ابھی نہیں...''
''کیوں؟ ابھی نہیں تو پھر کب؟''
''ایک نظم سنیے...'' وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھا اور اس نے ایک کاغذ اٹھا کر اس پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔
دُرّیہ اسے گومگو کیفیت میں دیکھنے لگی۔ ریحان نے کاغذ پر درج تحریر پڑھنا شروع کی۔
''دل زخمی ہے
اسے مت چھیڑو
جو زخم لگا ہے کاری ہے
اسے دھیرے، دھیرے بھرنے دو
جب ٹیس اٹھے گی دل میں تو
ہم دل پہ پتھر رکھ لیں گے
اور خود کو یہ سمجھائیں گے
کبھی فیصلہ کرنا پڑتا ہے
جیتے جی مرنا پڑتا ہے
کبھی زہر کو امرت جان کر
چپ چاپ بھی پینا پڑتا ہے
ہمیں بزدل نہ سمجھے کوئی
ہم اپنی میت رو دیے ہیں
ہم ایک محبت کی خاطر
دو جی کو قلم کر بیٹھے ہیں''
ریحان نے کاغذ میز پر واپس رکھ دیا۔
''کس کی شاعری ہے ریحان؟'' دُرّیہ نے پوچھا۔
''کس کی ہوسکتی ہے؟''
''تم بتاؤ...''
''سنا تھا دل کی چوٹ آدمی کو شاعر بنا دیتی ہے... آج اس کا تجربہ بھی ہوگیا۔''
''تو کیا... تمہاری اپنی...؟''

ریحان نے اثبات میں سر ہلایا۔
"زبردست ریحان۔۔۔" دُرّیہ نے اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔ "میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں...... آئی ٹیل سوری فار یو......"
"اٹ از اوور ناؤ......" اس نے توقف کیا۔ "ہاں...... پاپا سے ذکر مت کیجیے گا۔"
"کس بات کا......؟"
"اس کا......" اس نے میز پر رکھے کاغذ کی طرف انگلی اٹھائی۔
"کیا تم مجھے اتنا ناقابلِ بھروسا سمجھتے ہو کہ میں ان سے ذکر کروں گی۔"
"اوہ نو......" ریحان شرمندہ سا ہو گیا۔ "میں نے احتیاطاً کہا۔"
"اطمینان رکھو...... ویسے آپس کی بات ہے ریحان...... برا مت ماننا...... اچھا ہی ہوا...... اس قسم کی شادیوں میں بعد میں بہت مسائل ہوتے ہیں۔ میرے کالج کی ایک کولیگ اور ان کے ہزبینڈ کی لو میرج تھی...... دونوں تھے تو مسلمان مگر مختلف مسالک سے تعلق تھا...... بچوں کو دونوں ہی اپنے، اپنے راستے کا پابند رکھنا چاہتے تھے...... اکثر جھگڑا رہتا تھا دونوں میں......"
"مطلب اب تو آپ خوش ہیں......"
"کہہ سکتے ہو...... میں تو بہت ڈر رہی تھی کہ پتا نہیں کتنا بڑا طوفان اٹھے گا گھر میں۔"
"پاپا از گریٹ......" ریحان نے بلا توقف کہا۔ "انہوں نے کبھی بڑے سے بڑے معاملے پر بھی ہمارے گھر کا سسٹم اپ سیٹ نہیں ہونے دیا...... نہ کبھی کسی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا۔ سب سے بڑی بات جو ہمارے گھر کے نظام کو ڈسٹرب کر سکتی تھی...... وہ آپ کی اور پاپا کی شادی تھی...... وقتی طور پر ہم بہن، بھائی اپ سیٹ ضرور تھے مگر پاپا نے اپنی سمجھداری سے معاملات ہینڈل کیے کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔"
"سب کہاں؟" دُرّیہ نے سوچا۔
میرب تو اب بھی وہیں کھڑی تھی جہاں پہلے دن تھی۔

☆☆☆

میرب کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ جاب کر رہی تھی۔ طالب پاکستان میں کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے مگر وہ فی الحال شادی کرنے کے حق میں نہ تھی۔ اور اس بارے میں اس کی باپ سے کئی مرتبہ نہایت بے تکلفی سے بات ہو چکی تھی۔
"پہلے مجھے اسٹیبلشڈ ہونے دیں پاپا۔" اس نے طالب سے کہا تھا۔
"بیٹا...... تعلیم مکمل کر چکی ہو...... جاب کر رہی ہو...... اور کتنا اسٹیبلشڈ ہونا چاہتی ہو......"
"مجھے اپنا گھر بنانا ہے......"
"گھر بنانا ہمارے فیملی سسٹم کے مطابق مرد کی ذمے داری ہوتی ہے اور وہاں جہاں تم رہ رہی ہو ہسبینڈ اور وائف مل جل کر گھر بناتے ہیں...... کسی اچھے لڑکے سے تمہاری شادی ہو جائے...... دونوں مل جل کر گھر بنا لینا......"
"میں کسی کے ساتھ شیئرنگ میں نہیں اپنا گھر بنانا چاہتی ہوں پاپا...... اپنا گھر...... اپنا ڈریم ہاؤس......"
"لڑکی کی شادی کی ایک عمر ہوتی ہے بیٹا جب مناسب اور اپنی مرضی کے رشتے ملتے ہیں...... عمر نکل جائے تو پھر مشکل ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ وقت تمہاری شادی کے لیے نہایت موزوں ہے...... اور یہ کس ڈریم ہاؤس کی بات کر رہی ہو تم...... شادی کے بعد لڑکی کے لیے اس کے شوہر کا گھر ہی ڈریم ہاؤس بن جاتا ہے...... دیر کرو گی تو

اچھے رشتے گنوا دو گی......"
"کوئی بات نہیں...... شادی اینڈ آف لائف نہیں ہے......"
"بگننگ آف لائف تو ہے......"
"ریحان بھائی مجھ سے بڑے ہیں پہلے ان کی کیجیے...... مجھے جب شادی کرنا ہو گی بتا دوں گی آپ کو......"
"میں نہ ہوا تو......؟"
"فار گاڈ سیک...... ایسی بات نہ کریں...... ماما کے بعد ایک آپ ہی تو ہیں ہم بہن، بھائیوں کے لیے سب کچھ......"
"آپشنز ہونے چاہئیں......"
"کیا مطلب......؟"
"تمہاری ماما کے جانے کے بعد تو میں تھا...... میں گیا تو کس کے شانے پر سر رکھ کر رو ؤ گی۔"
"پلیز پاپا......" وہ گڑگڑائی۔
"او کے......"
طالب کا منشا اسے شادی کے لیے آمادہ کرنا تھا مگر جبر سے نہیں...... میرب کے شادی سے انکار کے باوجود وہ اپنے فرض سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ میرب سے ان کی فون پر تقریباً روزانہ ہی بات ہوتی تھی اکثر یہی موضوع چھیڑ دیتے اور وہ اپنے موقف پر قائم تھی۔ "مجھے ابھی شادی نہیں کرنی......"
ریحان کی شادی کا معاملہ چھڑا تو وہیں کا وہیں رہ گیا۔

☆☆☆

"ہاں بھئی! ریحان نے کوئی بات کی تم سے؟" دو چار دن خاموشی رہی۔ پھر طالب نے دُرّیہ سے پوچھا۔
"کس سلسلے میں؟" وہ تجاہلِ عارفانہ سے بولی۔
"اپنی شادی کے سلسلے میں......"
"نہیں......"
"تم نے کی ہوتی۔"
"ریحان نے اس لڑکی سے شادی کا خیال ترک کر دیا ہے۔"
"کیوں......؟" طالب چونکے۔
"ریحان آپ کو ناخوش نہیں دیکھنا چاہتے۔"
"میں نے تو اجازت دے دی تھی۔"
"بے دلی سے۔"
"ہاں۔" طالب نے اعتراف کیا۔ "خوش تو نہیں تھا میں......"
"آپ کے چاروں بچوں میں ریحان کو آپ سے سب سے زیادہ محبت ہے۔"
"مجھے اندازہ ہے۔"
"میں تو حیران تھی کہ آپ نے ریحان کو کسی گرما گرمی کے بغیر اجازت کیسے دے دی تھی۔"
"جوان اولاد سے الجھا نہیں جاتا دُرّیہ...... اسے سمجھایا جاتا ہے...... اچھا برا سمجھا کر اس کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے...... یہ جو آئے دن اخبارات میں لڑکیوں کے گھر سے فرار اور پسند کی شادی...... رشتے کے تنازعے پر قتل، خونریزی اور مرضی کا رشتہ نہ ہونے پر لڑکے یا لڑکی کی خودکشی کی خبریں چھپتی ہیں اس کی بنا یہی ہے کہ ماں، باپ،

بچوں سے مکالمہ کرتے ہیں نہ انہیں راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں...... یہ شادی نہیں ہوسکتی کہہ دینے سے ایسے مسائل حل نہیں ہوتے...... بچوں کو سمجھانا چاہیے کہ تم جو کرنا چاہتے ہو اس کے یہ، یہ عواقب اور نتائج ہوسکتے ہیں۔''

''جوان بچے کہاں سمجھتے ہیں...... ان پر تو اپنی مرضی کا بھوت سوار ہوتا ہے...... ہر بچہ ریحان کی طرح باادب اور باپ سے اتنی محبت کرنے والا تھوڑی ہوتا ہے۔'' دُرّیہ بولی۔

''الحمد للہ...... ریحان کیا، چاروں بچے ہی میرا ادب بھی کرتے ہیں اور مجھ سے قربت بھی رکھتے ہیں...... اور میں اس کا کریڈٹ مرحومہ جہاں آرا کو دیتا ہوں...... اسی نے بچوں کے دل میں میری محبت ڈالی اور... باادب بنایا۔ واحد موقع جب میں نے ان کے اور اپنے درمیان خلیج حائل ہوتے محسوس کی وہ تھا جب تم میری زندگی میں داخل ہوئیں لیکن خدا کے بعد تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے اس خلیج کو پاٹنے میں اپنا کردار خوبی سے ادا کیا۔''

''جزاک اللہ...... ویسے آپ خاصی انکساری سے کام لے گئے ہیں جو کریڈٹ آپ اپنی مرحومہ بیگم کو اور مجھے دے گئے ہیں اس کے اصل حقدار تو آپ ہی ہیں...... مرد کو سمجھدار ہونا چاہیے...... ہم عورتوں کو تو آپ کے پیچھے ہی چلنا ہوتا ہے...... کوئی بات تو ہوگی ایسی آپ میں جس نے جہاں آرا کو آپ کا ادب اور محبت بچوں کے دل میں ڈالنے پر مجبور کیا ہوگا...... اور رہی میں تو جناب...... اگر آپ نے مجھے اپنے گھر میں جگہ بنانے کے لیے راستہ نہ دیا ہوتا...... اپنے بچوں کے ساتھ مل کر میرے خلاف اپوزیشن بینچوں پر جا بیٹھتے...... تو مجھ بیچاری کا کہاں ٹھکانا ہوتا......''

طالب بے ساختہ ہنس دیے۔

''میں اپوزیشن میں ہوتا تو تم لامحالہ اقتدار میں ہوتیں یا نہیں......؟'' پھر وہ دُرّیہ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''بیچاری کیوں کہا خود کو......'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد انہوں نے مزید کہا۔ ''خوش قسمت ہوں کہ مجھے دونوں ہی عورتیں اچھی ملیں...... ورنہ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی ایک عورت ہی عذاب کر دیتی ہے۔ بچوں کے دل میں باپ کا ادب واحترام ڈالتی ہے نہ انہیں اس بیچارے سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔'' طالب جہاندیدہ اور تجربہ کار تھے ان کے حلقۂ احباب میں ایسے کئی مرد تھے جن کی کم وبیش یہی بدنصیبی تھی۔

☆☆☆

اگلے چند دن دُرّیہ متعجب رہی کہ طالب اور ریحان کے آپس کے تعلق میں سرمو فرق نہ آیا تھا...... طالب کی بیٹے سے وہی پہلے کی سی انسیت اور شفقت اور ریحان کا باپ کے ساتھ وہی ادب واحترام والا رویہ...... دونوں اختلافِ نظر کی رمق بھی ظاہر کیے بغیر پہلے کی طرح ساتھ اٹھتے بیٹھے، بات چیت کرتے اور نارمل دکھائی دیتے۔

چند دن گزرے پھر ایک روز کھانے کی میز پر ہی طالب نے ریحان کو مخاطب کیا۔ ''ریحان میاں...... اب کیا پروگرام ہے؟''

''کس سلسلے میں پاپا؟'' ریحان نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بھئی...... تمہاری شادی کے سلسلے میں......''

اب دُرّیہ نے بھی چونک کر طالب کو دیکھا جو بظاہر پوری توجہ اپنی کھانے کی پلیٹ پر مرکوز کیے ہوئے تھے۔

ریحان نے پہلو بدلتے ہوئے دُرّیہ کو دیکھا۔

''بات کب آگے بڑھا رہے ہو؟'' طالب کی توجہ بدستور اپنی پلیٹ پر ہی مرکوز رہی اور دُرّیہ نے پہلے سے بھی زیادہ تعجب سے انہیں دیکھا۔

''پاپا...... آپ ٹھیک کہتے ہیں...... میں نے...... میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ہے۔'' ریحان نے کہا۔

''کیوں بھئی؟'' اب طالب نے یوں چونکتے ہوئے اسے دیکھا جیسے انہیں اس بات کی خبر ہی نہیں تھی......

جبکہ دُرّیہ انہیں بتا چکی تھی اور اس وقت ان کے تجاہلِ عارفانہ پر حیران مگر چپ تھی۔

''میں کوئی ایسا کام تو نہیں کرسکتا ناں پاپا جس میں مجھے آپ کا آشیرباد نہ مل پائے''

''یار...... یہ کیا کہا تم نے...... آشیرباد...... کوئی مناسب، متبادل اردو لفظ بولو''

''سوری پاپا...... کوئی نہیں سوجھ رہا اس وقت...... آپ ہی بتائیں'' ریحان تذبذب میں پڑ گیا۔

''دعائے خیر......'' طالب بولے۔ ''ہماری اردو سے حسین زبان ہے کوئی......؟''

''بے شک......'' ریحان نے تائید سے اپنی سعادت مندی کا اظہار کیا۔

''بیٹا! میں نے تو تمہیں اجازت دے دی تھی۔''

''مگر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔''

''غلطی...... کس غلطی کی بات کر رہے ہو۔''

''بعد میں مسائل ہوتے پاپا......''

''مسائل کے ڈر سے تم نے ارادہ ہی ترک کر دیا...... یہ تو اچھی بات نہیں ہے...... اس وعدے کا کیا ہوگا جو تمہارے اور اس معصوم لڑکی کے درمیان طے پایا ہوگا۔''

''کون سا وعدہ پاپا؟'' ریحان چونکا۔

''شادی کا...... اور کون سا......''

ریحان نے پھر پہلو بدلا اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے پاپا...... مگر ہمارے درمیان کوئی وعدہ نہیں ہوا تھا...... وہ بھی جانتی تھی اور میں بھی کہ...... ہمیں اپنی فیملی سے سپورٹ نہیں ملے گی...... اس کی کمیونٹی اپنے عقائد کے سلسلے میں خاصی کٹر ہے۔''

''تو پھر اب کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں......''

''تم نے اسے بتا دیا؟''

''کیا......؟''

''یہی کہ تم...... پیچھے ہٹ رہے ہو...... پسپا ہو رہے ہو......''

''بتانا ضروری نہیں......''

''ہونا چاہیے...... زندگی میں ہر ڈیل فیئر ہونی چاہیے، دل پر بوجھ نہیں رہتا...... اور مقابل کو گلہ نہیں ہوتا......''

دُرّیہ چپ چاپ سن رہی تھی...... حیران تھی کہ باپ اور بیٹے میں نہایت اہم اور نازک مسئلے پر کس بے تکلفی اور دوستانہ انداز میں گفتگو ہو رہی تھی۔

''بتا دوں گا......'' دُرّیہ کو ریحان کا لہجہ درد میں ڈوبا محسوس ہوا۔

''ضروری ہے بیٹا......''

''اوکے پاپا......''

دُرّیہ اس افہام وتفہیم سے متعجب تھی...... مسائل یوں بھی سلجھائے جاسکتے ہیں...... تدبر اور فہم سے...... وہ خود بھی تدبر اور فہم سے عاری نہ تھی تبھی تو اس گھر میں جڑ پکڑ گئی تھی مگر آج اسے اندازہ ہوا کہ طالب تو تدبر اور فہم میں اس پر بھی سبقت رکھتے تھے۔ اور ریحان باپ سے اپنی محبت میں کتنا صادق تھا۔

زیادہ نہیں دو چار دن بعد ہی طالب، ریحان سے نہایت دوستانہ انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ''ریحان

میاں.....لڑکی دیکھی جائے آپ کے لیے؟"
"ابھی نہیں پاپا......"
"کیوں؟"
"میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"
"فیضان تو بیٹے کا باپ بن گیا......تم دونوں بھائیوں میں عمر کا کوئی بہت زیادہ فرق نہیں ہے...... سچ پوچھو تو اب بھی تاخیر ہو چکی ہے تمہاری شادی میں...... اب ہو جانی چاہیے۔ تمہاری شادی ہو تو میرب کا گھیراؤ کریں...... اس سے جب بات کرو ہر پھر کر اس کی تان اسی بات پر آ کر ٹوٹتی ہے کہ ریحان بھائی مجھ سے بڑے ہیں آپ پہلے ان کی کیوں نہیں کرتے...... تمہاری شادی ہو تو اس کے پاس یہ بہانہ نہ رہے۔"
"پاپا! وہ تو...... عجیب ہو گئی ہے...... کہتی ہے ڈریم ہاؤس بناؤں گی...... نہ جانے کس ڈریم ہاؤس کا خواب دیکھتی ہے......نٹی از میڈ......" ریحان نے آخری فقرے پر اپنے سر کو جھٹکا۔
"خواب دیکھنے میں کیا حرج ہے بیٹا......خواب ہی تو تعبیر بنتے ہیں......"
"یعنی آپ بھی اس کے حامی ہو گئے......"
"سب سے چھوٹی ہے ناں بیٹا......فیملی کے آخری فرد کو مارجن دینا پڑتا ہے......تمہاری ماما اس وقت گئیں جب میرب اس عمر میں تھی جب کھونے نہیں، پانے کی چاہ ہوتی ہے...... ماں کو کھو کر وہ شدید نفسیاتی صدمے میں چلی گئی تھی بلکہ اب تک ہے......نوعمری میں کسی گہرے نفسیاتی صدمے کا شکار افراد کبھی، کبھی اپنی گمشدہ قیمتی متاع کی تلاش میں اپنی تسکین کے لیے یونہی بڑی، بڑی آرزوؤں کے محل تعمیر کرنے لگتے ہیں جیسے ہماری میرب کر رہی ہے...... مجھے تو کبھی، کبھی اس پر ترس آنے لگتا ہے...... وہ عمر جو اسے اپنوں کے سائے میں ہنستے کھیلتے گزارنی چاہیے تھی اس نے پردیس کے ہاسٹلوں میں گزار دی۔ یہاں کیا کمی تھی اس کے لیے......"
وُزریہ کو طالب بہت دکھی سے لگے۔
"آئی ایم سوری پاپا...... میں نے...... بلکہ شاید آپ کے سوا ہم میں سے کسی نے بھی میرب کے نفسیاتی مسئلے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی...... آج آپ نے بات کی ہے تو مجھے میرب سے واقعی ہمدردی محسوس ہو رہی ہے۔"
"اب اسے ہماری ہمدردی کی نہیں...... اس کی ذات کے احترام کی ضرورت ہے......آئندہ مت کہنا کہ نٹی از میڈ......"
"سوری پاپا......" ریحان نے معذرت کرنے میں دیر نہیں کی۔
"وزریہ......" باپ، بیٹے کی باتوں میں گم وزریہ، طالب کے مخاطب کرنے پر بے ساختہ چونکی۔ "دیکھو بھئی ریحان کے لیے کوئی لڑکی...... ہمارا انتخاب ان کے دل کو لگ جاتا ہے تو ٹھیک ورنہ اور سہی...... اور سہی...... یہ خود بھی نظر دوڑائیں......"
"کیا کہتے ہو ریحان؟" وزریہ نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
"میرا ارادہ تو نہیں تھا ابھی۔"
"تھا......" طالب مسکرائے۔ "گویا اب ہے ارادہ......"
"جیسے آپ کی مرضی......"
"یہ ہوئی ناں بات...... جیتے رہو...... خوش رہو...... بیٹا والدین کے فرائض میں ایک یہ فریضہ بھی ہے کہ وقت پر اولاد کو اس کے گھر بار کا کر دیں...... تاخیر کی کوئی وجہ نہیں تو تاخیر کیوں کی جائے...... ویسے بھی گھر میں کوئی خوشی

ہوئے کافی عرصہ ہو گیا......"

☆☆☆

فیضان اور ہانیہ کی بیٹے کے ساتھ پاکستان آنے کی خبر گرم تھی طالب خوش تھے کہ ان کا پوتا پہلی بار ان کے گھر میں رونق بکھیرنے آ رہا تھا۔ امی کہا کرتی تھیں بیٹے کی اولاد زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ فیضان اور ہانیہ کے نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے کمرے کی آرائش اور صفائی ستھرائی کا خیال وزریہ یوں رکھتی جیسے گھر میں رہنے والے دیگر افراد کے کمروں کی آراستگی اور جھاڑ پونچھ کا رکھا جاتا تھا۔ اب جو کئی سال بعد ان کے آنے کی خبر ملی تو وُزریہ نے ان کے کمرے کی نئی آرائش ضروری سمجھی...... نیا رنگ و روغن، نئے پردے، نیا بستر، نئی دیوار گیر آرائشیں اور ان کے بیٹے کے لیے بنک بیڈ...... دوری تو تھی مگر اسکائپ پر مستقل رابطہ رہتا تھا۔ فیضان کا کہنا تھا کہ بنک بیڈ اس کے بیٹے اذلان کی سب سے پسندیدہ جگہ تھی۔ ہانیہ کے بقول اذلان بندر کی طرح بنک بیڈ پر چڑھتا، اترتا رہتا تھا۔ گھر کے ایک کمرے میں وُزریہ اور ریحان نے باہم مل جل کر انٹرنیٹ پر موجود بچوں کی نرسری کی لاتعداد تصاویر کی مدد سے اذلان کے لیے ایک نرسری سجانے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ دونوں اپنے، اپنے طور پر اذلان کی عمر کے بچوں کی دلچسپی کے کھلونے، آرائشیں اور چھوٹی، چھوٹی باتصویر اسٹوری بکس خریدنے میں لگے تھے۔ وُزریہ نے نرسری کی چھت کو چاند تاروں سے مزین چھوٹا سا آسمان بنانے میں ریحان اور گھر کے ملازم لڑکے سے مدد لی تھی۔ نرسری کے در و دیوار کو اس نے تصویروں اور آرائشوں سے گل و گلزار کر دیا تھا۔ کہیں رنگ برنگی تتلیاں، کہیں بچوں کے جانے پہچانے کارٹونز تو کہیں بچوں سے آشنائی رکھنے والے طلسماتی کرداروں کی رنگ برنگی شبیہیں...... نرسری کی ایک دیوار تو چڑیا گھر کا منظر پیش کرتی تھی۔
"تمہیں نئی اسائنمنٹس ملتی رہتی ہیں......" طالب نرسری کی آراستگی میں وُزریہ کی دلچسپی دیکھ کر ایک دن بولے۔

''شکر ہے خدا کا۔'' دُرّیہ نے کہا۔''مصروفیت بھی اللہ کی عنایت ہے اپنے بندوں پر.....''
''بے شک.....'' طالب نے تائید کی پھر بولے.....''فیضان اور ہانیہ تو آ ہی رہے ہیں..... ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریحان کا کچھ سلسلہ نہ کر دیا جائے.....''
''آپ کا مطلب ہے.....'' دُرّیہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
''شادی اتنی جلدی ممکن نہ ہو تو منگنی ہی سہی.....'' طالب بولے۔
''ہونے کو تو شادی بھی ہو سکتی ہے..... ہماری امی کہا کرتی ہیں..... بیٹے کی بری بازار میں کھڑی۔''
''یعنی .....؟''
''یعنی یہ کہ..... بیٹے کی شادی کی تیاری زیادہ وقت نہیں لیتی..... بازار جاؤ اور فٹافٹ خریداری..... لڑکے کی بری میں ہوتا ہی کیا ہے..... آنے والی دلہن کے کپڑے، جوتے، زیورات، کاسمیٹکس..... اللہ، اللہ خیر صلا.....''
''تو پھر اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا جائے.....''
''پہلے لڑکی تو دیکھیں.....''
''ریحان سے تم اپنی بھانجی کے بارے میں بات کر کے دیکھو.....''
دُرّیہ ہڑبڑا کر طالب کو دیکھنے لگی۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن کی رفتار یک لخت تیز ہوتی لگی.....''کیا..... کیا کہا آپ نے؟'' اس نے آنکھیں پھاڑ کر طالب کو دیکھا۔
''بریہ کی بیٹی کے بارے میں پوچھو ریحان سے۔''
کتنی آسانی سے بات کر رہے تھے طالب..... جیسے کوئی عام سی، معمولی سی بات ہو۔
''تمہیں بھی آسانی رہے گی..... آنے والی بچی کو بھی تمہارے ساتھ مل جل کر رہنے میں مشکل نہیں ہوگی۔''
دُرّیہ کو طالب سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی..... بلکہ توقع کیا..... وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کبھی کہ طالب اپنے خوبرو، اعلیٰ حسب و نسب کے حامل، تعلیم یافتہ، ویل سیٹلڈ چشم و چراغ کے لیے اس کی بہن کی عام سی شکل صورت کی حامل، بی کام پاس، متوسط گھرانے کی سادہ سی بیٹی سے رشتہ کرنے کی تجویز دیں گے..... تشکر کے احساس سے اس کا جی چاہا طالب کے قدموں میں بیٹھ جائے۔
''نہیں.....'' اس نے نفی میں سر ہلایا.....''میں ریحان سے ایسی بات نہیں کر سکتی.....''
''کیوں بھئی؟''
''بہت فرق ہے دونوں میں.....''
''کیا فرق ہے.....؟''
''آپ خود جانتے ہیں.....''
''میں تو نہیں جانتا..... آپ سمجھائیں مجھے۔'' طالب عموماً اس سے صیغۂ تم سے مخاطبت رکھتے تھے ماسوا غیر معمولی مواقع کے۔
''نیہا سیدھی سادی، معمولی شکل صورت کی بچی ہے..... تعلیم بھی بس واجبی سی ہے..... سمپل گریجویٹ، آج کل تو اعلیٰ تعلیم کا دور ہے..... اور..... بریہ کے میاں کی کوئی خاص پوزیشن بھی نہیں..... اوسط درجے کا کاروبار ہے بس..... اور.....''
''ہاں بولو..... رک کیوں گئیں.....؟''
دُرّیہ نے ایک نظر انہیں دیکھا..... کمتری کے احساس کے ساتھ..... پھر دھیمے لہجے میں بولی۔''ریحان ماشاءاللہ

ویل اسٹیبلشڈ گھرانے کا ویل سیٹلڈ بیٹا ہے..... ریحان کے لیے اس کے جوڑ کی لڑکی ہونی چاہیے.....''
''جوڑ کیا ہوتا ہے؟''
''ہم پلہ.....''
''اور ہم پلہ کیا ہوتا ہے؟''
''ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہیں..... کسی کا جھکاؤ زیادہ نہ ہو.....'' طالب کا ہاتھ دُرّیہ کے شانے پر آ.....
''بیوی'' وہ بڑے پیار سے بولے۔''شادی کے بعد سے اب تک تم مجھے اپنی امی کی بے شمار آزمودہ براجمان ہوا..... ضرب الامثال اور حکایتیں سنا چکی ہو..... آج میری مرحومہ و مغفورہ والدہ خدا انہیں غریق رحمت کرے..... ان کی دو آزمودہ کار باتیں بھی سن لو..... کہا کرتی تھیں..... دیگ سے چاول کا بس ایک دانہ دیکھا جاتا ہے.....'' طالب تھے اور مسکراتے ہوئے دُرّیہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر خوشگوار لہجے میں بولے۔''بات آئی عقل شریف میں.....''
''وضاحت فرمائیں.....'' دُرّیہ مسکرائی۔
''نیہا تمہاری بہن کی بیٹی ہے..... تم اچھی ہو تو وہ بھی اچھی ہوگی..... اور اگر خدانخواستہ کوئی کمی ہوئی بھی تو مجھے یقین ہے تم اسے سدھا لوگی.....''
''اور دوسری بات؟'' دُرّیہ نے سوالیہ نظروں سے طالب کو دیکھا۔
''ہاں..... دوسری بات جو میں نے ان سے سنی یہ تھی کہ..... بیوی اور جوتی آرام دہ ہونی چاہیے.....'' طالب نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر بولے۔
''نیہا اپنی بچی ہے..... دوسرے گھر کی لڑکی لانے کے بجائے ہم ریحان کے لیے اپنے ہی گھر کی بچی کیوں نہ لائیں..... وہ بھی آرام سے رہے گی..... شوہر کو بھی سکون سے رکھے گی..... خوب صورتی، اعلیٰ ڈگریاں، مالی حیثیت، ثانوی باتیں ہیں..... میں نیہا کو زیادہ نہیں جانتا مگر اتنا یقین ہے کہ تمہاری صحبت اور تربیت اسے ریحان کے لیے ایک اچھی شریکِ زندگی بنانے میں معاون ہوگی، تم ریحان سے بات کرو.....''
''جی نہیں..... میں ہرگز بات نہیں کروں گی.....'' دُرّیہ نے انکار کیا۔
''کیوں؟''
''کیونکہ نیہا میری بہن کی بچی ہے..... ہو سکتا ہے ریحان مروتاً مجھے انکار نہ کریں..... آپ کو خود بات کرنا ہوگی اور..... پلیز ریحان پر دباؤ مت ڈالیے گا..... تجویز دے دیں..... ماننا یا انکار کرنا ریحان کی اپنی صوابدید پر چھوڑیں۔ اور دوسرے میں اس لیے بھی ریحان سے بات نہیں کروں گی کہ ریحان کی اپنے بھائی، بہنوں سے بہت قربت ہے..... وہ یہ بات فیضان، زینب اور میرب کو ضرور بتائیں گے اور وہ یہ سوچیں گی کہ میں اپنی بھانجی کو ریحان کے سر تھوپنے کی کوشش کر رہی ہوں.....''
''یہ تو میرے بات کرنے پر بھی سوچا جا سکتا ہے۔''
''ہاں..... مگر تھوڑی بہت بچت ہو جائے گی میری.....''
''نیت نیک ہو تو اپنی بچت کی فکر نہیں ہونی چاہیے.....'' طالب مسکرائے۔
''نیت نیک مگر پوزیشن ویک ہو تو بندے کو اپنی بچت کی فکر ضرور کرنی چاہیے۔'' دُرّیہ بولی۔
''کیا مطلب؟''
''آپ کے گھر میں میری حیثیت سوتیلی ماں کی ہے..... اور سوتیلی ماں کا رشتہ بے انتہا خوفناک اور خونچکاں کہانیوں سے جڑا ہے۔''

"اچھا بھئی آپ اپنی بحث کی فکر کریں...... میں ریحان سے خود بات کرلوں گا......" طالب مسکرا دیے۔
دریہ خوش تھی مگر کوئی واضح صورتِ حال سامنے آنے تک اپنے میکے میں یہ بات کسی سے نہیں کرنا چاہتی تھی۔
خدا جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا۔

☆☆☆

ریحان سے طالب نے خود بات کی...... ریحان کو خود بھی اس بات کا گمان نہ تھا۔ اپنے اور دُرّیہ کے گھر والوں کے طبقاتی فرق سے وہ بھی بخوبی آگاہ تھا۔ اس کا اپنا گھرانا معاشی اور معاشرتی ہر دو اعتبار سے ایک اعلیٰ گھرانا تھا۔ رہن سہن، تہذیب اور رویوں میں دریہ کے گھر والوں سے یکسر مختلف...... دُرّیہ کی بہنوں اور ان کے بچوں سے اس کا کچھ واسطہ نہیں رہا تھا۔ کسی خاص موقع پر ملنا جلنا ہوا بھی تو رسمی علیک سلیک تک واسطہ رہا۔

"لڑکی کو تو تم نے دیکھا ہوگا......" طالب اس سے اسی دوستانہ انداز میں مخاطب تھے۔

"یاد نہیں پاپا......"

"عجیب آدمی ہو یار...... لڑکیوں کو یاد نہیں رکھتے......" طالب کی حسِ مزاح پھڑکی۔

"پاپا...... اگر میں کہتا...... دیکھ رکھا ہے...... یاد ہے...... تو آپ کہتے لڑکیوں کو اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہو۔"

"نہیں...... بندہ جب تک کنوارا ہے لڑکیوں کو نظر میں رکھنا چاہیے...... انتخاب میں آسانی ہوتی ہے...... خیر...... میں نے تم سے تمہاری آنٹی کی بھانجی کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اپنے ہی خاندان کی بچی ہے...... گو ہمارا میل جول زیادہ نہیں رہا مگر ہم ایک ہی شجر کی شاخیں اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہیں...... لڑکی حسین وجمیل نہیں ہے...... پروفیشنل ڈگری ہولڈر بھی نہیں...... مگر ہمیں کون سا کوئی نوکری کروانی ہے اس سے...... جہاں تک صورت شکل کا معاملہ ہے...... شادی کے بعد ساری عورتیں ایک جیسی ہو جاتی ہیں...... بیوی وہ اچھی جو شوہر کو آرام دے...... اس کی عزت کرے، اسے اپنے سر کا تاج سمجھے...... کوئی غیر لڑکی گھر میں آئے گی تو اسے ہمارے گھر کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں کچھ وقت ضرور لگے گا...... کتنی بھی اچھی ہوئی...... کہیں نہ کہیں وہ اپنا راستہ ہم سے الگ رکھنا چاہے گی...... اس لڑکی کو گھر کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کے لیے تمہاری آنٹی کافی ہیں...... خالہ بھانجی ایک گھر میں شیر و شکر ہو کر خوش و خرم رہیں گی...... میں بھی مطمئن بھی تم بھی خوش......"

"دیکھ لیں پاپا......"

"میں نے تو خوب سوچ سمجھ لیا ہے...... تم اپنی بتاؤ......"

"جو آپ کی خوشی......"

"نہیں، نہیں...... ایسی سپردگی اچھی نہیں...... کھل کر اپنی مرضی بتاؤ......"

"گستاخی معاف...... فیضان بھائی کے لیے تو آپ کی چوائس کچھ اور تھی پاپا......"

"وہ میری نہیں...... تمہاری ماں کی خواہش تھی کہ فیضان کی دلہن خوب صورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو...... تمہارے لیے میری چوائس ایک ایسی لڑکی ہوگی جو گھر کے نظام کو درہم برہم نہ کرے...... نئی آنے والی لڑکیاں اکثر رسہ کشی میں لگ جاتی ہیں...... خود کو نئے گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کرتیں...... دوسروں کو اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کرتی ہیں...... اسی میں حالات اکثر اس حد تک خراب ہو جاتے ہیں کہ یا تو نیا رشتہ بگڑ جاتا ہے یا پرانے رشتے ٹھکانے سے لگ جاتے ہیں......"

"پاپا، سچی بات یہ ہے کہ میں تو ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا......" ریحان نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں فیضان اور ہانیہ کی آمد کا فائدہ اٹھایا جائے، جانتے ہو ناں کتنے سال بعد آ رہے ہیں دونوں؟"

"جی پاپا......"

"تو...... اتنی دور سے بار، بار آنا جانا آسان نہیں ہوتا...... ملازمت انسان کے پاؤں کی بیڑی بنی رہتی ہے...... پھر نہ جانے کتنے عرصے بعد آئیں...... ان کی موجودگی میں تمہاری شادی ہو جائے تو اچھا ہے...... بس میرب کو اور آنا پڑے گا باہر سے......" طالب نے اپنا پروگرام بیٹے کے سامنے رکھ دیا۔

وہ چپ رہا۔

"ہاں...... یہ مت سمجھنا کہ اس لڑکی کا انتخاب میں نے تمہاری آنٹی کے کہنے پر کیا ہے...... یہ کلی طور پر میرا انتخاب ہے اور میں نے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے...... تاہم میں تم پر کوئی جبر نہیں کرنا چاہتا...... اگر تم انکار کرنا چاہو تو تمہیں پورا اختیار ہے۔"

"آپ نے آنٹی سے بات کی؟"

"ابھی نہیں......" طالب نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے غلط بیانی کی۔ "پہلے میں تم سے بات کر کے تمہاری مرضی معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

"مجھے کچھ وقت دیں گے آپ؟"

"بھائی، بہنوں سے مشورہ کرنے کے لیے؟"

ریحان نے چونک کر باپ کو دیکھا کہ اس کے دل کی بات کیونکر تاڑ گئے تھے وہ۔

"جی......" اس نے دھیرے سے کہا۔

"ٹھیک ہے...... کرلو مشورہ...... لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا...... تمہارے باپ کا تجربہ تمہارے بھائی، بہنوں کے تجربے سے کہیں زیادہ ہے...... وہ بھی دوسرے کے بھلے کے لیے تمہارا برا نہیں چاہے گا...... سمجھ رہے ہو ناں میرا مطلب......"

"جی پاپا......"

"کیا بھلا...... سمجھاؤ تو ذرا......"

"یہ کہ آنٹی کو خوش کرنے کے لیے ان کی بھانجی...... سے میری شادی کر کے آپ مجھے کسی آزمائش میں نہیں ڈالیں گے۔"

"گڈ...... میرا یہی مطلب تھا۔"

☆☆☆

میرب کی تو بات ہی کیا زینب اور فیضان نے بھی بھرپور مخالفت کی اور اپنے، اپنے طور پر جواز و دلائل دیے۔

"ریحان، ہرگز یہ حماقت مت کرنا...... میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے...... اس میں خوب کیا ہے...... تمہارے لیے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل جائے گی...... میری اپنے سسرال میں اتنی اچھی، اچھی لڑکیاں موجود ہیں......" زینب نے سمجھایا۔

"پاپا گھر کا کنٹرول پورے طور پر اپنی بیگم کے ہاتھ میں دے دینا چاہتے ہیں...... اس لڑکی سے تمہاری شادی کا مطلب ہوگا...... ٹوٹل کنٹرول......" فیضان نے کہا۔

میرب نے فون پر دل کی بھڑاس نکالی۔

"ریحان بھائی! آپ ہرگز پاپا کی باتوں میں مت آیئے گا...... اس عورت نے پاپا کو یہ پٹی پڑھائی ہوگی...... جادو کر دیا ہے اس نے پاپا پر......"

”پاپا تو کہہ رہے تھے ابھی اس بات کی آنٹی کو خبر نہیں ...“ ریحان نے کہا۔
”ارے چھوڑیں..... پاپا اس عورت کی فیس سیونگ کے لیے کہہ رہے ہوں گے..... اس نے پہلے پاپا کو قابو کیا اب اپنی بھانجی کے ذریعے ہمارے بھائی کو ہم سے چھین لینا چاہتی ہے.....“ میرب کے لہجے میں نفرت بھری تھی۔
”ریحان..... آنٹی کی عزت کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دو ... اس لڑکی سے تمہارا کوئی جوڑ نہیں..... کیا بتاؤ گے تم اپنے دوستوں کو کہ..... تم نے ایک معمولی سے شاپ کیپر کی بیٹی سے شادی کی ہے۔“ زینب کے دل میں دُرِّیہ سے سابقہ رنجش پھر عود کر آئی تھی۔
”یار..... تم اچھے بھلے سمجھدار آدمی ہو..... پاپا کا احترام اپنی جگہ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دو..... ہزبینڈ اور وائف کا لیول ایک ہونا چاہیے..... سمپل گریجویٹ، لوئر مڈل کلاس لڑکی کی سوچ کیا ہو سکتی ہے.....بس منع کر دو.....“ فیضان نے کہا۔
”اسٹینڈ لو ریحان..... فیضان بھائی کو دیکھا تھا تم نے..... اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے پاپا کی مخالفت کے سامنے ڈٹ گئے تھے..... آخرکار پاپا کو ماننا پڑا..... تم بھی ڈٹ جاؤ..... پاپا پریشر میں لینے کی کوشش کریں تو صاف منع کر دو.....“ زینب نے صلاح دی۔ ”یہ پٹی پاپا کو ان کی بیگم نے ہی پڑھائی ہو گی۔“
”اگر آپ کی وہاں شادی ہوئی تو میں بائیکاٹ کروں گی..... آپ کی شادی میں شریک ہی نہیں ہوں گی ریحان بھائی.....“ میرب نے دھمکی بھی دے ڈالی۔
ہانیہ نے رائے کا اظہار نہیں کیا۔
ریحان الجھن کا شکار ہو گیا۔ وہ بھائی اور بہن بھی جو بظاہر دُرِّیہ کے مداح تھے مخالفت کر رہے تھے۔
طالب نے ریحان سے جواب مانگا تو اس نے دبی زبان سے کہا۔ ”پاپا، سارے ووٹ مخالفت میں آئے۔“
”مجھے معلوم تھا۔“ طالب دھیرے سے مسکرا دیے اور بولے۔
ریحان نے سوچا کہ کہے..... ”معلوم تھا تو آپ نے ایسی بات کی ہی کیوں؟“ مگر کہہ نہ سکا چپ رہا۔
طالب دھیرے سے کھنکھارنے کے بعد گویا ہوئے۔
”دیکھو بیٹے..... جب کسی بات کی یا کسی فرد کی اتنی شدید مخالفت ہو کہ ایک ووٹ بھی اس کی حمایت میں نہ آئے تو سمجھ جاؤ کہ یا تو اس میں بہت برائی ہے یا پھر کمال کی اچھائی.....“ طالب نے توقف کیا پھر دلسوز لہجے میں بولے۔ ”کیا میں تمہارا برا ہوتا دیکھنا پسند کروں گا؟“
”نہیں پاپا..... ایسا بالکل نہیں.....“ ریحان بے ساختہ بولا۔
”تم نے میری بات سن لی..... بھائی، بہنوں سے مشاورت کر لی..... اب فیصلہ تم پر ہے..... تم اگر انکار کر دو گے تو میں اسے تمہارا جائز حق سمجھوں گا..... تمہاری مرضی کے خلاف ایک قدم آگے نہیں بڑھوں گا..... نہ تمہاری طرف سے اپنا دل برا کروں گا..... تم مجھے بدستور عزیز رہو گے..... دنیا بہت بڑی ہے..... میں نے تو تمہیں اس لڑکی سے بھی شادی کی اجازت دے دی تھی جہاں میرے غیر معمولی تحفظات تھے..... اگلی نسلوں کا معاملہ تھا..... تم خود ہی پیچھے ہٹ گئے..... اب یہ لڑکی نہ سہی اور بہت ہیں..... آخری فیصلہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“
ریحان خاموش رہا۔
”میں کھلے دل سے تمہارا فیصلہ قبول کروں گا بیٹے۔“
ریحان نے ایک نظر باپ کو دیکھا۔ ”تھینک یو پاپا.....“ اس نے مسکرا کر کہا۔

(جاری ہے)

پچھتاوے کی الماری

تسنیم منیر علوی

جب سے شانی (چھوٹی بہن) نے بقول اماں ”عطرفتنہ“ سے دوستی کی پینگیں بڑھائی ہیں ہمارے گھر میں بھونچال آ گیا تھا۔ اب اماں، بہتا مل کر گلابی اردو میں باتیں بگھارتیں اور مجھ سے بھی یہ توقع کرتیں کہ انگلش کے بجائے روز مرہ زبان میں مروج اردو کے الفاظ موجود ہیں تو انگریزی کیوں استعمال کی جائے..... یہ اچھی زبردستی ہے میں کہتا۔ ”آجاؤ بھئی کھانا ٹیبل پہ انتظار کر رہا ہے۔“ جواب آتا ”میز“ نہیں کہہ سکتے.....“ اماں بھی اب مصلے اور قرآن و تسبیح سے فارغ ہو کر ادبی کتابیں پڑھتی نظر آتیں۔ ایک دن میں اپنے موبائل چارجر کی تلاش میں شانی کے کمرے میں جا نکلا اب جو تکیہ اٹھایا تو نیچے سے ”منثورنامہ“ برآمد ہوا۔ اور اب میں سمجھا کہ بے باکی اور زبان طرازی کچھ بے سبب نہیں اب وہ کھانے بیٹھتی تو کھانا کم کھاتی علمی گفتگو کا تڑکا زیادہ لگاتی۔ میری چھٹی حس کہتی کہ اماں بھی اس بھونچال کے اچھال کی نذر ہو گئیں۔ اکثر ان کی خواب گاہ کے سامنے

سے گزر ہوتا تو کمرے میں پرانے گیت بج رہے ہوتے اور اماں ہاتھ میں کوئی کتاب لیے ''بیولی کوکن'' بنی آہستہ، آہستہ پیر ہلا رہی ہوتیں...... اوہ خدایا...... میری ماں ایک ''خاتونِ آہن'' کیسے پگھل کر موم ہوگئیں ہو نہ ہو یہ...... سب شانی چارسوبیس کی کارستانی ہے۔

جب سے یہ محلے میں نئی وارد ہونے والی ایک مختصر کی فیملی سے قریب ہوئی ہے اس کے طور طریقے ہی بدل گئے ہیں۔ اس نے اب اردو فارسی ملی جلی تراکیب والی زبان بولنا شروع کردی ہے۔ مثلاً ''ماہ جبیں، ستارہ جبیں، زلفیں مشکِ ختن، باتیں شیریں سخن اور جانے کتنے جتن......'' اور تو اور اماں معصوم کو بھی اپنے ساتھ ملالیا ہے۔ اردو نہ ہوئی سعدی کی ''گلستان بوستان'' ہوگئی۔ بھئی ہم ''نی دائم'' کی تصویر بنے بوکھلاتے رہتے...... چلیے یہاں تک تو ٹھیک تھا کہ زبان درست کی جارہی تھی لیکن زبان کے ساتھ جو اس کا دین بگڑ رہا تھا اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا۔

☆☆☆

''آپ لوگ بھی ناں معاذ بھائی کی باتوں میں آگئے...... ارے ایسا کچھ نہیں...... چند دن پہلے محلے میں نئے پڑوسیوں کا اضافہ ہوا تو ایک اچھے پڑوسی کی طرح میں اور اماں خیر خیریت کے لیے ان کے گھر جا پہنچے' یہ دو افراد پر مشتمل ایک سیدھا سادہ شریف سا گھرانا تھا۔ ایک ضعیف بیمار ماں اور ستارہ جبیں جیسی حریم...... چھوٹا سا صاف ستھرا گھر...... پُروقار سی ماں، بیٹی گھر میں سلیقے کے ساتھ رہائش پزیر ہیں اور اہم بات ''کتابوں'' کی موجودگی تھی۔ آج کے ڈیجیٹل دور میں ہر طرف شیلف پر کتابیں سجی تھیں۔ بیٹی کے ہاتھ میں بھی موبائل کے بجائے کتاب تھی جو شاید سلائی کرتی ماں کو سنائی جارہی تھی۔ سامنے دروازہ کھلا ہوا تھا وہاں بھی ایک منی لائبریری موجود تھی...... حریم کی والدہ نے تو کم ہی گفتگو میں حصہ لیا لیکن نازک سی حریم نے نہایت شائستگی سے نپی تلی گفتگو کی۔ میں اور اماں تو بہت متاثر ہوکر آئے اور یوں میں ان کے متاثرین میں شامل ہوکر ان کی گرویدہ ہوگئی۔ اماں نے بھی بے ضرر سا گھرانا دیکھ کر روک ٹوک نہ کی۔ یوں میری دوستی بڑھتی چلی گئی...... لیکن جانے محلے والوں کو ان سے کیا پرخاش ہو گئی۔ آج واپسی پر پڑوسن خالہ افسر مجھ سے ٹکرا گئیں۔ میرے ہاتھ میں کتابیں دیکھ کر بولیں۔

''ارے بٹیا شام ڈھلے تم ہاتھ میں کتابیں لیے کہاں سے چلی آرہی ہو۔'' پھر میرے قریب آکر بولیں۔

''تمہارے بھلے کو کہتی ہوں ان سے ذرا دور رہو...... یہ مشکوک لوگ ہیں، میں تو کہتی ہوں کہ کوئی خفیہ ایجنٹ ہیں۔ رات کو اکثر گھر سے باہر گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔''

میں نے حیرت سے ان کو تکا۔

''خالہ خدا کا خوف کریں' ارے وہ پڑھے لکھے سمجھدار لوگ ہیں' آپ اس طرح کی باتیں نہ پھیلائیں۔'' میں نے تیزی سے اپنے قدم آگے بڑھائے۔

''لو یہ میں نہیں کہتی سارا محلہ ہی یہ کہہ رہا ہے...... میں کروں گی تیری ماں سے بات......'' میں تو سنی ان سنی کرتی گھر میں داخل ہوگئی لیکن مجھے ان جاہل خاتون کی سوچ پر افسوس بہت ہوا۔

آج رات کھانے کی میز پر اماں خواہ مخواہ ناراض ہوگئیں۔ میرا تو سارا دھیان بھنے اور چھپٹے قیمے پر تھا۔ بات نکلی۔ ''حریم ناز'' کے کردار اور گفتار کی بس میری جو شامت آئی ایک مصرعہ جو حریم آپی سے ہی سنا تھا۔ ''ہے زلف یار حلقۂ زنجیر ہو بہو۔'' (ایسا ہی یاد رہ گیا ہے) اماں کے گوش گزار کردیا۔ بھائی نے استفہامیہ نگاہوں سے اماں کو دیکھا۔ بس اماں تو میرے پیچھے ہی لٹھ لے کر دوڑ پڑیں۔

''ارے بنو شاعری نہ کر شادی کے بعد تیری گھنی زلف کا ایک بال بھی شوہر نامدار کی پلیٹ سے برآمد ہوگیا ناں تو چندیا پر ایک بھی زلف نہ لہرائے گی اور اس کے بعد شبِ غم کی سحر نہ ہوگی۔ اے میری نئی نکور'' اردو داں......'' ذرا کھانا ختم کر کے کچن صاف کرلینا ورنہ طبیعت صاف کردوں گی معلوم نہیں یہ حریم نازکس جادو نگری سے یہاں آن بسی ہے کہ سارا محلہ تو خوف زدہ ہے مگر ہماری یہ صاحبزادی ان سے انتہائی متاثر۔''

اماں نے اپنی تقریر ختم کی تو میں نے بھائی کی جانب غصے سے دیکھا لیکن میری آنکھیں دکھانے کا جواب انہوں نے زبان سے دیا۔

''جاؤ، جاؤ کچن صاف کرو...... اماں کہتی ہیں صاف کچن عورت کے سلیقے کی نشاندہی کرتا ہے۔'' اب اماں کے نشتر کے بعد بھائی بھی بے باک ہوگئے۔

''کچن تو ہرگز نہیں صاف کروں گی۔''

''ہاں باورچی خانہ دیکھ لیتی ہوں کہ آپ نے کتنا گندا کیا ہے؟'' میں نے تململا کر جواب دیا۔ اور برتن سمیٹتی سامنے پڑی نارنگی کی پھانک منہ میں رکھتی دوسری طرف چلی۔ میں سمجھ گئی کہ اماں اور بھائی کو محلے والوں نے بھی جی بھر کر ''پمپ'' کیا ہے۔ سب کے تیور ہی بدل گئے تھے۔ دونوں نے مشترکہ فیصلہ کرلیا تھا کہ محلے میں آنے والے یہ دونوں افراد مشکوک ہیں۔ اماں کو شکایت تھی کہ میں کیوں ان کا دم بھرتی ہوں اور اس دن کو کوستی تھیں کہ میری کیا شامت آئی تھی کہ اسے لے کر نئے پڑوسی کے گھر چلی گئی۔ اماں کہتیں۔

''گھر میں کوئی مرد نہیں ہیں پر شام سے گھر کے آگے ایک دو گاڑیاں ضرور کھڑی ہوتی ہیں...... تو ہے ناں شک کی بات......؟'' اماں نہایت سنجیدگی سے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ لیکن سچی بات یہ تھی کہ مجھے تو ان ماں، بیٹی کے کردار، رہن سہن اور گفتگو میں کوئی مشکوک سرگرمی نظر نہیں آتی۔ جانے لوگ اچھے خاصے پڑھے لکھے مہذب لوگوں کو اس طرح خطاب کیوں دے دیتے ہیں۔

اس مہذب اور بے ضرر سے مختصر خاندان میں مجھے تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ موبائل، ٹیبلیٹ کے بجائے گھر میں اور ہاتھ میں کتابیں نظر آتیں اور کبھی، کبھی قلم بھی، وہ اکثر مجھے بھی مطالعے کے لیے کتابیں دیتیں۔ کبھی، کبھی بیمار اماں سلائی مشین پر مصروف ہوتیں تو حریم ان کو کتاب سنا رہی ہوتی...... بھلا اس میں کہاں ہے کوئی شک وشبہ والی بات یا ایجنٹ والی بات ہوئی۔ بس یہ محلے والے بھی ناں اللہ بچائے ان کے شر سے جس کی بے عزتی کرنا ہو اس کو سارے شہر میں بدنام کردو...... بھائی تو جیسے میرے پیچھے ہی پڑ گئے...... جانے اہل محلہ نے کیا کان بھرے ہیں کہ اب وہ اکثر گھر میں غصے سے بھرے پھرتے ہیں، میری آمد و رفت پر اعتراض میری کتب بینی پر برہم اور تو اور میں ذکر ہی کروں اس گھرانے کا تو شعلہ فگن...... کل ''عصمت'' کے ''منتخب افسانے......'' (کتاب) ہاتھ میں دیکھ کر اماں سے شکایت لگادی۔

''یہ دیکھیں......'' میرے ہاتھ سے کتاب جھپٹ لی اور سرورق پر لکھا عصمت چغتائی کے منتخب افسانے لکھا اماں کو دکھانے لگے۔

''یہ فسادی کتابیں پڑھتی ہیں کبھی منٹو کبھی عصمت اور اماں آپ کو معلوم ہے، ان دونوں پر فحاشی کا مقدمہ چلا تھا۔'' بھائی نے بڑی امید سے اماں کی طرف انگارہ پھینکا جس کو شعلہ بننے میں ذرا دیر نہ لگی۔ اس سے پہلے کہ اماں، بھائی کی لگائی آگ میں بھسم ہوجاتیں۔ میں نے پانی کے چھینٹے ڈال کر ان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور جلدی سے بول پڑی۔

''لیکن آپ لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ دونوں ادیب باعزت بری ہوگئے تھے۔ منٹو تو وہی آئینہ دکھاتا ہے جو دیکھتا ہے اور عصمت اپنی شرائط پر زندگی کا سوچ آن اور آف کرتیں دراصل ہم مسخ شدہ صورت دیکھنا ہی گوارا نہیں کرتے......'' (میں نے بھی ان پر پڑھے مضمون کا کچھ حصہ سنا دیا) لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دل میں چھن سے کوئی چیز ٹوٹ کر کرچی، کرچی ہوگئی۔

میں اپنی دانست میں مدلل تقریر کے بعد پلٹی تو اماں کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورتا پایا۔

''ہاں جب ہی تو میں کہوں اس کی زبان قینچی کی طرح کیوں چلنے لگی ہے۔'' اماں نے پھر پتھر پھینکا جو میں نے سلپ پر کیچ کرلیا۔

''وہ دونوں عزت کی صلیب اٹھائے اپنی مدد آپ کے تحت جی رہی ہیں۔ کچھ آپ لوگوں سے مانگنے نہیں آتیں جانے کیا پرخاش ہوگئی ہے۔'' میں بڑبڑاتی ہوئی گھر سے نکل آئی...... اماں پیچھے کچھ کہتی رہیں بھائی تو جل بھن کر خاک ہی ہوگئے۔

باہر گلی میں گھر کے سامنے اگے پودے، گھاس

سے تو تم ہی وہ ہمدرد ہو جاؤ اپنا کندھا پیش کردو...''
میرے ان جملوں پر وہ مجھے دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

بھائی کی ضرب کاری تھی میں بوجھل دل کے ساتھ حریم کے دروازے پر کھڑی بیل بجا رہی تھی اندر سے وہ ہی مندر میں بجنے والی دھر گھنٹی بج اٹھی۔

''کون...؟''

''میں شانی۔'' میرا نام سنتے ہی ایک کھٹکے سے در وا ہوا اور میں نے خود کو صحن میں پایا۔ جہاں موسم کے پھول یوں گملوں سے لٹک رہے تھے جیسے پلکوں سے آنسو اور وہ تاروں کی صورت ٹوٹ ٹوٹ کر میرے چہرے کو بھگونے لگے۔ (موسم تو دل کے اندر ہوتا ہے) میں نے جلدی سے آنکھوں کو رگڑ ڈالا...... سامنے کرسی پر بیٹھی وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی...... حریم نے مجھ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

''ارے کیا ہوا؟'' لیکن میری آنکھوں میں ایک ان کہی مسکراہٹ پوشیدہ تھی...... وہ ستم طراز اداؤں حسن جہاں سوز سے بیگانہ سی مجھے گہری نظر سے تکتی رہی۔

ہائے اللہ انہوں نے کیسے راز دل جان لیا۔'' پھر مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

''یہاں میرے پاس بیٹھو......'' میں ان کے برابر والی کرسی پر ٹک گئی۔

''ہاں اب بتاؤ......'' حریم نے کتاب بند کر دی، ان کے ہمدردی کے بول مجھ پر بارش کی طرح برس پڑے دل میں ٹھنڈک کا احساس جاگزیں ہو گیا۔ ہاں ایک بات ضرور انہونی ہوئی آج ان کے پاس کتاب کے ساتھ، ساتھ آس پاس کچھ سلکی اور ریشمی رنگ برنگے کپڑے بھی لشکارے مار رہے تھے میں نے کن انکھیوں سے بھرپور جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن افسوس کوئی عقدہ نہ کھلا...... شاید ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں...... پھر اس وسوسے کو ذہن سے جھٹک دیا نہیں اتنے عرصے سے ان کے پاس آتی جاتی رہی ہوں اچھی خاصی بے تکلفی کی فضا قائم ہو چکی ہے۔ وہ کچھ تو اشارہ کرتیں......'' وہ تو آج بھی نئی آنے والی کتابوں پر رواں تبصرہ کرتی رہیں۔

''یہ بھی پڑھو تمہیں پسند آئے گی۔'' ناول ناشاد'' کیسا ناول ہے تم نے اس کو کیسا جانا کیا پیغام ہے۔'' لیکن میں جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھی بار، بار نگاہ پھسل کر ان اطراف بکھرے کپڑوں پر جا پڑتی میں تو ابھی، ابھی سی تھی۔ اسی لیے واپسی کا ارادہ کیا باہر صحن میں آنٹی بھی سلائی مشین پر جھکی۔ سلائی میں مصروف تھیں میں جلد پلٹ آئی۔

اماں تو جیسے میری ہی منتظر تھیں کھلتی مسکراہٹ لیے گویا ہوئیں۔

''کیا ہوا...... آج تمہارے ہاتھ میں کتاب کا تحفہ نہیں......'' انہوں نے تعجب کا اظہار کیا...... میں نے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔

''آج وہ لوگ مصروف تھے شاید حریم کی شادی طے ہو گئی ہے گھر میں تیاریاں ہو رہی ہیں اس لیے میں جلدی واپس آ گئی......'' میں تو بات ختم کر کے آگے بڑھ گئی لیکن ان کی بات شروع ہو گئی۔

''ہاں بھئی اب یہی زمانہ ہے۔ شریف زادیاں گھر میں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ بچی لفنگوں کی شادی ہو جاتی ہیں۔ ہائے، ہائے کیا برا وقت آن لگا ہے۔ ایسوں ویسوں مشکوک کردار والوں کے گھر بس جاتے ہیں۔''

استغفار کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو چہرے پر یوں پھیرنے لگیں گویا کوئی سانحہ ٹوٹ پڑا۔

حریم کی شادی کا سوچ کر میرا تو کالج میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا اور ان کی پُراسرار خاموشی سے ملال سا اتر آیا ہے۔ اگر وہ مجھے اعتماد میں لے کر اپنے رشتے کے بارے میں بتا دیتیں تو کیا ہو جاتا۔ اب روز میں ان کے گھر کے سامنے سے گزرتی لیکن جانے کیا سوچ کر میرے قدم اس گھر کی جانب نہ بڑھتے وہ جن سے مجھے دوستی، محبت اور خلوص کا زعم تھا جن کی خاطر اماں اور بھائی سے لڑ بیٹھی، بدلحاظی کی انہوں نے زندگی کا اتنا اہم فیصلہ مجھ سے چھپایا۔

''ارے...... اُف خدایا...... یہ کیا؟ میری گلی میں کیا حادثہ ہو گیا۔ یا اللہ خیر......'' حریم کے گھر کے آگے

لوگوں کا اژدہام لگا تھا۔ گاڑیاں، پولیس وین، ٹی وی کی کئی، کئی چینل کی ڈش کی وین۔ دروازہ تو کھلا تھا لوگ اندر آ جا رہے تھے اور پورے محلے میں سکوت کا عالم تھا۔ میں نے برق رفتاری سے گھر کی جانب دوڑ لگائی۔ اور اپنے کو کوستی رہی کہ جانے انہوں نے کیا گل کھلایا ہے۔

''میں اپنے ہیرو زگار بھائی کی دل آزاری کرتی رہی، اماں سے زبان درازی کی اور سارا وقت ان ہی کا سکھایا فلسفہ بگھارتی رہی۔ اماں ٹھیک تو کہتی تھیں۔ ''زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو......'' اور میں نے جلدی سے بھاگ کر دروازہ بند کر دیا۔

''کیا قیامت آ گئی؟'' مجھے اس طرح حواس باختہ دیکھ کر اماں گھبرا گئیں۔

''کیا آفت آئی کچھ تو منہ سے بول۔'' میں نے آتی جاتی سانسوں کے درمیان جواب دیا۔ اماں کے سامنے ہاتھ جوڑے اور پیر پکڑنے کو سر جھکایا...... اماں نے ایک جھٹکے سے مجھے کھڑا کیا۔

''کیا اول فول بک رہی ہے، کیا معافی کیا دکھ......''

''وہ اماں آپ اور بھائی ٹھیک کہتے تھے۔ واقعی وہ لوگ یعنی حریم اور ان کی ماں رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہیں، پولیس کا چھاپا پڑا ہے، پورے گھر کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ اخبار، ٹی وی کے نمائندے۔'' مجھ سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ دہن خشک ہو کر زبان تالو سے چپک گئی تھی۔'' اب شاید تفتیش کے لیے یہاں نہ آن پہنچیں'' میں سامنے صوفے پر جا گری...... اماں، پانی لینے دوڑیں، بھائی تیزی سے کمرے سے برآمد ہوئے اور انہوں نے ٹی وی کھول دیا...... وہاں بریکنگ نیوز چل رہی تھی، میری گناہ گار آنکھوں نے جو دیکھا تو پلکیں جھپکانا بھول گئیں اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئی وہ کوئی اور نہیں حریم تھیں۔ ان کی آنکھیں لو دے رہی تھیں۔ اسکرین پر آ رہا تھا۔

''ملک کی مقبول مصنفہ ناز آفرین صاحبہ کو ان کے ناول ناخدا کو پہلا آدم جی انعام دیا جاتا ہے۔ اس کا اعلان آج......'' اب ان کا مختصر تعارف پیش کیا۔

''یہ وہ عظیم بیٹی ہیں جو اپنی کینسر زدہ ماں کے ساتھ اپنی معذوری کی پروا کیے بغیر واضح رہے کہ ناز آفرین صاحبہ ایک حادثے میں اپنی ایک ٹانگ کھو بیٹھی تھیں...... لیکن سلام ہے ان ہمت اور خودداری کو کہ وہ مشکلات کے باوجود کسی پر بوجھ نہ بنیں وہ افسانے ناول تحریر کرنے کے علاوہ اپنی والدہ کے ساتھ مل کر مختلف بوتیک اور فیشن ڈیزائنر کے لیے لباس تیار کرتی رہیں وطن کو ان پر ناز ہے، اس کمال فن کے اعتراف پر ان کو پہلا آدم جی پرائز کا اعلان کیا جاتا ہے۔'' اس کے ساتھ ان سے مکالمہ شروع ہو گیا۔ وہ ٹھہر، ٹھہر کر نہایت اعتماد سے اپنی صراحی دار گردن جو (محبت وخلوص کی مالا سے سجی تھی) کو انکساری سے جھکائے نپے تلے جوابات سے نواز رہی تھیں، اطراف میں پھول، گجے اور مختلف تحائف کے ساتھ پس منظر میں ان کے مقبول ناول رکھے خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ تحمل اور بردباری سے سوال جواب کا سلسلہ جاری تھا ان میں کہیں بھی ڈوبتی، ابھرتی تمناؤں اور نہ ہی ان پر کی جانے والی سنگ زنی کا دور، دور تک ذکر تھا...... میں نے خشمگیں نگاہوں سے اماں اور بھائی کی طرف دیکھا جو خاموش سرنہاں کیے نگاہیں زمین پر گاڑے بیٹھے تھے۔

''کون کس پر انگلی اٹھائے سب کے سب بے لباس ہیں لوگو!'' عالم خاموش، جہل شور کرتا رہا...... میرے سامنے کتابوں کی الماری میں بچی حریم کا کمال فن دھڑام سے مجھ پر آن پڑا، آج مجھے یہ الماری پچھتاوے کی الماری کا احساس دلا رہی تھیں اور جیسے وہ طنز آمیز قہقہے لگا رہی ہوں...... میرے کانوں میں گستاخانہ لہجوں کا ہجوم شور کر رہا ہے۔ پورے ماحول پر مجرمانہ خاموشی طاری تھی اور اماں اور بھائی بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے جیسے ان کا سفینۂ دل ڈوب چلا ہو اور پچھتاوے کی الماری کا شور وغوغا ان کا پیچھا کر رہا ہو...... میں نے بے دم ہو کر اماں کی گود میں سر چھپا لیا۔

ہم تو پھول جیسے تھے آگ سا بنا ڈالا
ہائے اس زمانے نے کیا سے کیا بنا ڈالا

❋❋❋

برسات کا موسم

سیا احمد عالم

تیز بارش ہو رہی تھی، ہر طرف جل تھل کا سماں تھا۔ ایسے میں صغریٰ اپنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کیچڑ کو روندتی گلی کے نکڑ سے گزرتے ہوئے بس کے انتظار میں اسٹاپ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے دور سے بس آتی دکھائی دی۔ بس کے رکتے ہی وہ جلدی سے اس میں چڑھ گئی ..... اسٹاپ پر کھڑے باقی لوگ بھی اس میں سوار ہو گئے تو بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ کچی آبادی کا سلسلہ اب ختم ہو چکا تھا اور بڑے، بڑے پکے مکانوں کی حدود شروع ہو چکی تھی۔

اپنی مطلوبہ منزل پر آتے ہی وہ اتر گئی۔ اور ننھے قدموں سے چلتے ہوئے ایک بنگلے میں داخل ہو گئی۔ اس کے قدم رکھنے کی دیر تھی کہ گھر کی مالکن چیخ پڑی۔

"یہ وقت ہے تیرے آنے کا..... کم بخت کل کہاں مر گئی تھی..... جو تو کل کام پر نہیں آئی اور آج تیری ماں کہاں مری پڑی ہے جو خالی تجھے بھیج دیا۔ آخر تم لوگوں کو کام کرنا ہے کہ نہیں..... پیسے پورے لیں گی اور چھٹی ہر دوسرے دن..... غضب خدا کا جتنا ان پر ترس کھاؤ، رحم کرو، اتنا ہی یہ پھیل جاتی ہیں۔" بیگم صاحبہ کی زبان کسی طور نہیں رک رہی تھی۔ انہوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا ..... جو چپ چاپ کھڑی ان کی جھڑکیاں سنے جا رہی تھی۔

"وہ..... وہ..... بیگم صاحبہ..... بارش کی وجہ سے چھوٹی بہن کو ٹھنڈ لگ گئی ہے..... اس لیے ماں اس کے ساتھ اسپتال میں ہے۔ جب وہ ٹھیک ہو جائے گی تو ماں کام پر آ جائے گی ..... جب تک میں سارا کام کروں گی..... آپ فکر نہیں کریں۔"

"ہاں، ہاں تم نہیں کرو گی تو کیا میں کروں گی..... کام تو سارا تمہیں ہی کرنا پڑے گا..... اور کام اچھی طرح صفائی سے کرنا، سمجھ میں آ گیا ناں ....!" انہوں نے نخوت سے کہا۔

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا، تنخواہ تو پورا لوگی ناں اور اگر ناغہ ہوا تو تنخواہ بھی کاٹ کر دوں گی۔" وہ بولیں۔ "اب جاؤ مرو بھی..... صفائی کرو جا کر..... پہلے ہی دیر ہو چکی ہے اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو....." انہوں نے اسے مزید سناتے ہوئے کچن کی طرف دھکیلا ..... اور دھپ، دھپ کرتی نخوت سے منہ بناتے ہوئے اپنے بیڈروم کی طرف چل دیں..... صغریٰ خاموشی سے آنسو پیتے ہوئے کام میں جت گئی۔ برتنوں کا ڈھیر تھا اندر باہر سب جگہ کی صفائی کرنی تھی۔ پھر کپڑوں کا ڈھیر بھی باہر واشنگ مشین کے پاس پڑا تھا۔

برسات کا موسم تھا۔ وقفے، وقفے سے بارش ہو رہی تھی۔ یہ بارش بڑے گھروں میں رہنے والوں کے لیے رحمت ہو سکتی ہے مگر کچے مکانوں میں رہنے والوں کے لیے تو سراسر زحمت ہوتی ہے۔ کچے مکانوں کی چھتیں ٹپک رہی ہوتی ہیں، سامان گیلا ہو رہا ہوتا ہے مگر اس سب سے بے نیاز ان مکینوں کے بچے پانی میں چھپا چھپ کرتے پھرتے ہیں۔ تبھی طبیعتیں بھی جلدی، جلدی خراب ہوتی ہیں۔ صغریٰ کے بابا نے مکان کی چھت پر جو چھپر کا بنایا ہوا تھا اسے بڑا سا پلاسٹک لا کر ڈھک دیا تھا جس کی وجہ سے اوپر چھت سے تو بارش کا پانی کافی حد تک آنا بند ہو گیا تھا وہ ساری رات انہوں نے جاگ کر کافی پریشانی میں کاٹی تھی۔ کئی دنوں کی اس بیچ، بیچ نے ان سب کو ادھ موا اور بیمار کر دیا تھا۔ صغریٰ کی ماں اپنی چند ماہ کی بچی کو لے کر کبھی حکیم تو کبھی قریبی کمپاؤنڈر کے ہاں جا رہی تھی۔ اس کا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ لہٰذا آج ماں اسے بڑے اسپتال لے کر گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے اسپتال میں داخل کرنے کا کہہ دیا تھا۔ اس لیے وہ بچی کو لے کر اسپتال چلی گئی تھی اور گھر میں بارہ سالہ صغریٰ اپنی دو چھوٹی بہنوں کو پانچ سالہ آمنہ اور چھ سالہ مریم اور دو چھوٹے بھائیوں دو سالہ عباس اور تین سالہ مراد کے ساتھ گھر پر رہ گئی تھی۔ باپ کو بھی اسپتال سے فرصت نہیں تھی اس لیے جب بھی اسے فرصت ملتی وہ گھر کا چکر لگا لیتا..... ماں اسی لیے کل کام پر نہ آ سکی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے آج اتنی گالیاں سننی پڑی تھیں۔ وہ تو آج بھی بمشکل ہی آئی تھی کیونکہ گھر میں بھی اس کی ضرورت تھی..... مگر وہ مالکن کے ڈر سے آ گئی تھی۔ گھر میں بارہ سالہ صغریٰ کے تین چھوٹے بہن بھائی اور بھی تھے۔

"یہ امیر لوگوں کو غریبوں کی مجبوریوں کا کوئی احساس کیوں نہیں ہوتا..... ان کو صرف اپنی ہی کیوں پڑی رہتی ہے۔ آخر ہم بھی تو گوشت پوست کے بنے انسان ہیں، کوئی کانچ کے کھلونے تو نہیں ناں کہ وہ اپنے قدموں کی ایک ہی ٹھوکر سے ہمیں توڑ کر رکھ دیں۔ ہماری اور ان کی مٹی ایک ہی ہے..... ایک خدا نے ہی ہمیں پیدا کیا ہے پھر وہ کیوں ایسا کرتے ہیں۔" صغریٰ کا ننھا سا ذہن جانے کیا، کیا سوچے جا رہا تھا۔

باہر چیخ و پکار کا شور بلند ہوا تو صغریٰ کا معصوم ذہن خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا اور اس کی سوچوں کا تسلسل

لوٹ گیا۔ اس نے بہتے آنسوؤں کو صاف کیا اور برتنوں کو ریک پر قرینے سے رکھتے ہوئے باہر کے شور کی طرف نظر دوڑائی ... جہاں بیگم صاحبہ کی پندرہ سالہ بیٹی سدرہ اور دس سالہ ارسہ لان میں بارش کے پانی میں بھیگتے ہوئے خوب لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی کیبل پر کوئی انڈین مووی دیکھتے ہوئے موسم کا مزہ لے رہی تھیں اور ان کی طرف بھی مسکرا کر کبھی، کبھی دیکھ لیتیں۔ سدرہ ڈیک پر فل والیوم میں گانے لگا کر موسم کو انجوائے کر رہی تھی جبکہ بڑا بیٹا راحیل بارش کے آثار دیکھتے ہی اپنی موٹر بائیک نکال کر دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کے لیے باہر جا چکا تھا۔ اور دوسرا بیٹا شعیب اپنے ہم عمروں کے ساتھ چھت پر سوار دوسرے گھروں کی لڑکیوں کو تاکنے اور چھیڑنے اور آتے جاتے راہ گیروں پر آوازیں کسنے میں مصروف تھا۔ ہر کوئی کسی نہ کسی شغل میں مصروف تھا۔

"بڑے لوگوں کا شغل بھی عجیب ہوتا ہے دوسروں کو جلا کر، رلا کر خوش ہوتے ہیں۔ دوسروں کے ٹوٹے دلوں کا مذاق بنا کر ان کی ہنسی اڑانے کو نادان انجوائے منٹ کہتے ہیں اور ایک ہم غریب لوگوں کی زندگی ہے۔ ہماری تو کوئی خوشی ہی نہیں۔ ہمارے لیے تو شاید ہر موسم ایک ہی جیسا ہے۔ ان کی طرح ہم موسم کو انجوائے نہیں کر سکتے کیونکہ یہ صرف ان امیروں کے چونچلے ہیں اور اگر ہم ان موسموں کا مزہ لیں تو پھر ان کے کام کون کرے گا۔ ان کی خدمت کون کرے گا۔ یہ مصیبت صرف ہم غریبوں کے لیے ہی کیوں ہوتی ہے۔ ہم اس دنیا اور اپنی تقدیر کے آگے اتنے ... بے بس اور مجبور کیوں ہوتے ہیں ... غریب ہونا کوئی گناہ تو نہیں ... پھر یہ غریبی ہمارے لیے قصور کیوں بن جاتی ہے۔ ہمیں یہ حق کیوں حاصل نہیں کہ ہم بھی ان کی طرح زندگی کی خوشیوں سے اپنا خالی دامن بھر لیں ...... ان پھولوں کے رنگ سے کچھ رنگ ہم بھی ...... چرا لیں۔" اپنی عمر سے بڑی، بڑی باتیں سوچتے ہوئے صغریٰ نے جلدی، جلدی اپنا تمام کام ختم کیا اور شام کے پھیلتے سائے کو دیکھتے ہوئے بیگم صاحبہ سے جانے کی اجازت چاہی جس پر انہوں نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اجازت دی۔ حالانکہ کام تو اس نے سب ہی بڑی صفائی سے نمٹایا تھا۔

"اچھا کل صبح جلدی آ جانا ...... اور دیکھو آ ضرور جانا ...... بہانے مت بنانے بیٹھ جانا کہ فلاں بیمار ہے یا مر گیا ہے وغیرہ، وغیرہ ...... یہ تو ہے ہی برسات کا موسم ...... سارا مہینہ ایسا ہی چلتا رہے گا ...... اب کیا سارا مہینہ ایسے ہی بہانے بنا کر گزار دو گی ...... اگر نوکری برقرار رکھنی ہے تو اب چھٹی بالکل نہ کرنا ...... سمجھیں ورنہ اپنی منحوس صورت دکھانے کی ضرورت نہیں ...... سمجھ میں آیا بھی یا پھر سے سمجھاؤں ......" وہ تنک کر بولیں، صغریٰ ان کی جلی کٹی سنتی رہی۔

"دیکھو نزلہ، زکام، موسمی بخار تو معمولی بات ہے اس کے لیے کیا انسان کام دھندا ہی بند کر دے۔ پھر سے کہے دیتی ہوں مجھ سے تم لوگوں کی یہ نخرے بازی نہیں سہی جاتی ...... مجھے ماسیوں کی کوئی کمی نہیں۔ دوسری ماسی رکھ لوں گی اگر اب تم یا تمہاری ماں نہیں آئی تو ...... کہہ دینا اپنی ماں سے جا کر ...... اب جا بھی چکو ...... یوں کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہو ...... ان منحوسوں نے موسم کا سارا مزہ ہی کرکرا کر کے رکھ دیا۔ اچھے بھلے موڈ کا ستیاناس کر ڈالا ...... ان سے ہمدردی کرنے کا یہی نتیجہ ملتا ہے ...... ان حرام خوروں پر تو بالکل ترس نہیں کھانا چاہیے ......" صغریٰ ان کی ڈانٹ پھٹکار سن کر دبے قدموں باہر نکل گئی۔ اس کے جانے تک بھی بیگم صاحبہ کافی دیر تک بڑبڑاتی رہیں ...... پھر بڑی بیٹی کے پکارنے پر چہکتے ہوئے اس کی طرف بڑھ گئیں ......

صغریٰ کی پریشان ماں اس کے گھر پہنچتے ہی اس کی طرف بڑھی۔

"بیگم صاحبہ نے کچھ کہا تو نہیں ... انہیں سب کچھ بتا تو دیا ہے ناں کہ میں کیوں نہیں آ سکی۔ انہوں نے نوکری سے تو نہیں نکالا ......" اس نے سپاٹ انداز میں ماں کے سارے سوالوں کا جواب دیا اور منی کے پاس جا کر بیٹھ گئی ...... جس کا بخار ابھی تک نہیں اترا تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ اس لیے وہ لوگ اسے گھر لے آئے تھے، ویسے بھی اسپتالوں میں ان جیسے غریبوں کے لیے فالتو بستر کہاں تھے۔ گھر میں ہی بچی کی صحت کے لیے دعائیں مانگی جا رہی تھیں اور گھریلو ٹوٹکے کیے جا رہے تھے مگر معلوم ہوتا تھا ماں کی دعاؤں میں بھی کوئی اثر نہیں تھا جب ہی منی کی حالت سنبھلنے کے بجائے مزید بگڑتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

بیگم صاحبہ کے بنگلے پر آج صبح ہی سے خوب شور شرابا تھا ...... سب لوگ موسم انجوائے کرنے پکنک کے لیے سی سائڈ جا رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کھانے پینے کی چیزوں کو گاڑی میں رکھنے کا بندوبست کرا رہی تھیں ...... دونوں لڑکے سی ڈی پلیئر اور کیمرا سنبھالے ہوئے تھے۔ سدرہ کی تیاری ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ ارسہ کی خوشی بھی قابل دید تھی۔ گھر میں افراتفری مچی ہوئی تھی ...... صاحب کا ان کے ساتھ جانے کا موڈ نہیں تھا اور انہیں گھر پر رہ کر کچھ دفتری ضروری کام بھی نپٹانے تھے اس لیے وہ گھر پر رک گئے تھے۔ موسم صبح ہی سے دلفریب ہو رہا تھا ...... آسمان پر ابر چھایا تھا۔ اور ردم جھم کا بھی سماں تھا ...... ایسے میں پکنک میں جانے کا الگ ہی مزہ تھا۔ سب ہی موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں صغریٰ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ گیٹ کے اندر داخل ہوئی ...... اس پر نظر پڑتے ہی بیگم صاحبہ شروع ہو گئیں۔

"کم بخت اتنی دیر لگا دی آنے میں، کل کہا بھی تھا کہ جلدی آ جانا۔ چل جا اب گھر کی صفائی کرا اور کچن بھی صاف کر ...... ہم لوگ پکنک کے لیے جا رہے ہیں ...... دیر سے لوٹیں گے ...... صاحب گھر پر ہی رہیں گے، تم سارا کام ختم کرنے کے بعد جانا ......"

"وہ ...... وہ بیگم صاحبہ چھوٹی بہن رات کو مر گئی ہے ناں ...... اس لیے ہمیں کچھ پیسے کی ضرورت ہے ...... تنخواہ سے کاٹ لیے گا ......" صغریٰ نے روہانسی لہجے میں کہا۔

جشنِ آزادی کے نام پر

کیا خوب کہہ کر ......

اپنے رب سے مانگتی ہوں دعا
ہم گناہ گاروں کو تو معاف فرما
کہ تو اللہ و رحمٰن و رحیم و پاک برتر ہے
تیرے در کو چھوڑ کے جائیں بھی تو کہاں
زباں پہ وردِ محمد تری ثنا کے بعد
یہی سرمایۂ دنیا و آخرت ہوگا
سکونِ قلب تیرے ذکر ہی سے ملتا ہے
یہ جاہ و حشمتِ دنیا تو اک سراب ہی ہے
ہمیں تو رنگ دے اپنے ہی رنگ میں مولا
ہماری چادرِ حرمت سدا سلامت ہو
ہماری قوم کی بچیوں کو تو ہدایت دے
بھٹک نہ جائیں کہیں رنگ و بُو کی دنیا میں
دجالی فتنے ہیں فریب دنیا ہے
مرے نبی کا پھریرا ہمارے سر پہ ہو
آمین ......

دُکھے دل کی دعا اپنی نوجوان نسل کے لیے

از: فریدہ افتخار ...... اسلام آباد

"پیسے؟ کیسے پیسے ...... ابھی تمہیں کوئی پیسے ویسے نہیں ملیں گے ...... ہم نے کوئی خیراتی دفتر نہیں کھول رکھا ہے۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو ......" انہوں نے بجائے افسوس اور ہمدردی کرنے کے اسے دھتکار دیا۔

"لیکن بیگم صاحبہ آج ہم کام نہیں کریں گے ...... منی کو دفنانے کے لیے پیسے کی ضرورت تھی۔ وہی مانگنے آئی تھی ......" وہ ان کی بے حسی پر جیسے تڑپ سی گئی۔

"کہہ تو دیا ہے ایک مرتبہ نہیں ہیں میرے پاس فضول کاموں کے لیے پیسے ...... تمہاری بہن مر گئی ہے تو

میں کیا کروں.... آج تم اس بہانے سے پیسے لے جاؤ گی کل کہو گی میری ماں مرگئی ہے.... پیسے دے دیں .... اور اب روزانہ تم لوگوں کو اس طرح سے پیسے بانٹنے سے تو رہی.... اپنے آپ کو تم لوگوں کی حرام خوری کی خاطر لٹا تو نہیں سکتی ناں..... پیسہ بہت مشکل سے کمایا جاتا ہے.... تم لوگوں کو تو ہر وقت مانگنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ تم لوگوں کے گھر مرنا جینا تو روزانہ کا ہی لگا رہتا ہے۔ کبھی محلے میں کوئی مرجاتا ہے تو کبھی رشتے داروں میں اور ہر جگہ تمہارا جانا ضروری ہوتا ہے۔" وہ مسلسل بول رہی تھیں۔

"یہ تو تم لوگوں کی روز کی ڈرامے بازی اور بہانہ ہوتا ہے اور کام تو تم پورا مکمل کر کے ہی جانا ورنہ پھر اس نوکری سے ہمیشہ کے لیے چھٹی ہی سمجھو.... اور کل سے آنے کی ضرورت نہیں....." بیگم صاحبہ سنگدلی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے دندناتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ بادل زور شور سے گرج رہے تھے.... شاید انہیں بھی بیگم صاحبہ کی بے حسی اور صغریٰ کے معصوم دل کے ٹوٹنے کا احساس تھا۔ جو ہکا بکا سی سکتے کی حالت میں کھڑی ان کی خود غرضی اور تنگ دلی پر غور کرتی ہی رہ گئی تھی۔ کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ بارش کھل کر برس رہی تھی۔ بیگم صاحبہ اور بچے خوشگوار موڈ کے ساتھ کار میں بیٹھ چکے تھے۔ سب لوگ آپس میں ہنسی مذاق میں مشغول تھے اور ایک دوسرے کو خوب، خوب چھیڑ رہے تھے۔ ڈیک سے گانے کی آواز گونج رہی تھی۔

ان کا قافلہ روانہ ہوگیا تھا..... صغریٰ حسرت سے ان کی جاتی گاڑی کو تکتی رہی..... اور آسمان کی طرف دیکھ کر خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

"واقعی موسم بہت خوب صورت ہو رہا ہے...... بالکل ہمارے دل کے موسم جیسا.... چھوٹی بی بی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ دیکھو تو امیر لوگ اس موسم میں خوشی سے دیوانے ہو کر سیر و تفریح کے لیے باہر نکل پڑتے ہیں.... مگر ہم جیسے چھوٹے اور غربت کے مارے لوگ کیا کریں.... ہمارے لیے تو یہ برسات پریشانی اور زحمت ہی لاتی ہے۔ ہم بھوک اور افلاس کے مارے لوگ.... ایک، ایک خوشی اور حسرت کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ابر..... یہ آسمان رحمت کیسے ہوسکتا ہے۔ ہمارے لیے یہ زحمت ہی ہے یہ زحمت.... مگر نہیں..... آج شاید ایسا نہیں ہے.... کیونکہ آج یہ برسات کا موسم ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ یہ بھی ہمارے دکھ میں آج برابر کا شریک ہے۔ دیکھو ..... دیکھو.... یہ بھی تو ہمارے ساتھ رو رہا ہے۔ ہماری طرح..... ہماری بدنصیبی اور بے بسی پر آنسو بہا رہا ہے۔ کون کہتا ہے..... یہ موسم صرف امیروں کا دوست ہے۔ ان کا غم خوار ہے..... اور صرف ان کی خوشی میں ہی شامل ہوتا ہے..... یہ ہمارے لیے کبھی نہیں رویا..... بلکہ ہمیں ہمیشہ رُلایا ہے.... مگر آج تو ایسا نہیں ہے..... آج یہ ہمارا ہمنوا بنا ہوا ہے..... آج تو..... اس کی آنکھیں بھی برس رہی ہیں..... اسے بھی ہمارے ساتھ ہوئی نا انصافی اور بے رحمی کا دکھ ہے....." اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ، ٹوٹ کر اس کے گالوں پر بہے جا رہے تھے اور برسات کے پانی میں شامل ہو رہے تھے ..... اور بارش کا زور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا..... ایسا لگتا تھا آسمان پھٹ پڑا ہے..... اسے بھی منی کی موت پر اور امیروں کی بے حسی اور سنگدلی پر دکھ تھا۔ جب ہی تو آج بادل برس کر تھمنا بھول گیا تھا۔

منی کی تدفین تو جیسے تیسے ہوگئی تھی اس کے بعد سے دو ماں، بیٹی اس بنگلے کی طرف نہیں گئے جبکہ اس کی تنخواہ ابھی باقی تھی۔

بیگم صاحبہ کے گھر نہ جانے کا سبب یہ بھی تھا کہ صغریٰ کی سہیلی جو وہیں کے گھروں میں کام کرتی تھی اس سے معلوم ہوا تھا کہ اس دن پکنک کو گئی فیملیاں اس وقت ایک شدید حادثے کا شکار ہوگئیں کہ جب بارش کی وجہ سے سڑک پر شدید پھسلن کے باعث دو ٹرالر الٹ گئے۔ اس کے بعد کی خبر صغریٰ سے نہیں سنی گئی تھی۔

آسمان اب بھی ٹوٹ کر برس رہا تھا۔

❊❊❊

ناولٹ

مفتاح الشرور

نبیلہ ابر راجا

تیسرا اور آخری حصہ

سلمان مہینے بھر میں جو بھی کماتا تھا اس کا ایک معقول حصہ صدقہ کرتا تھا، اس نے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے اپنے والدین کو اس طرح کرتے دیکھا تھا اس لیے یہ چیز اس کے لاشعور میں پختہ ہوچکی تھی کہ اس کی حلال کمائی میں اللہ کی کمزور مخلوق کا بھی حصہ ہے، اس لیے گھر میں اس نے گیلری کی سمت پرندوں کے لیے باجرہ اور پانی کا برتن خاص طور پر لا کر رکھا تھا۔ نمل باقاعدگی سے پرندوں کو دانہ پانی دینے کی ذمے داری نبھا رہی تھی۔

اس کے علاوہ وہ دو یتیم بچوں کی تعلیم کا خرچہ بھی اٹھا رہا تھا اس بات کا علم سوائے اللہ اور اس کے کسی اور کو نہیں تھا لیکن آج جب اس نے فریال کو زار و قطار روتے دیکھا تو دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرلیا۔ رات کو جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے ایک لفافہ نمل کو دیا، اس میں کچھ رقم تھی۔

"صبح جو خاتون آئی تھیں یہ ان کو دے دینا، میں کوشش کروں گا کہ باقاعدگی سے یہ سلسلہ چلتا رہے۔"

"زبردست سلمان...... پتا ہے میں بھی یہی

سوچ رہی تھی کہ آپ سے کہوں گی ہمیں فریال آپی کی ہیلپ کرنی چاہیے، پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں ویسے بھی۔‘‘ نحل بے طرح خوش ہو گئی تھی۔ ’’ہم اگر اوروں کی مدد کریں گے ناں تو اللہ ہماری بھی مدد کرے گا ہماری وجہ سے اگر کوئی مشکل سے نکلا تو اللہ ہماری مشکل بھی آسان کرے گا۔ آپ دیکھ لیجیے گا بہت جلدی آپ اس کرائسس سے نکل جائیں گے۔‘‘ اس کے چہرے پر یقین کی روشنی تھی۔ اور سب سے خوشی کی بات یہ تھی اس کا موڈ بالکل نارمل تھا ورنہ سلمان کے گھر میں گھستے ہی اس کے ماتھے کے بلوں میں یکا یک اضافہ ہو جاتا تھا۔

’’اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہو؟ کیا اللہ سے کوئی ڈیل کرلی ہے۔‘‘ سلمان کا لہجہ خوشگوار تھا۔

’’ڈیل کا تو پتا نہیں پر میرا دل کہہ رہا ہے۔‘‘ وہ بے نیازی سے بولی اور اپنے کھلے بال پیچھے کیے۔

’’پیارا لگ رہا ہے۔‘‘ سلمان نے نظر جما کر اسے توجہ سے دیکھا۔

’’معلوم ہے۔‘‘ اس کا اعتماد سلمان کو شرارت پر اکسا رہا تھا۔

’’اچھا پھر تمہاری اپنی فریال آپی سے اور کیا، کیا باتیں ہوئیں؟‘‘ اس نے ہتھیلی تھوڑی کے نیچے جما کر مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

’’کیا آپ نے سب سن لیا؟ سو نہیں رہے تھے کیا؟‘‘ نحل کو شاک سا لگا۔

’’سو ہی رہا تھا جانِ من پر تمہاری فریال آپی تو صور پھونکتی ہیں۔‘‘ سلمان کا اشارہ اس کی اونچی آواز کی طرف تھا۔

’’میں نے تمہیں کانچ کی گڑیا کی طرح رکھا ہوا ہے اور.... اور۔‘‘ سلمان نے ساتھ بیٹھی نحل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی نگاہوں میں طلب کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

’’چھوڑیں میرا ہاتھ، میں یہ پیسے پہلے جا کر دے آؤں۔‘‘ نحل نے ہاتھ چھڑا کر بیڈ پر رکھا لفافہ اٹھایا۔

’’رہنے دو، وہ خود آ جائے تو دے دینا۔‘‘ سلمان نے اسے روکا۔

’’نہیں میں ابھی جا رہی ہوں۔‘‘ اس نے عجلت دکھائی۔

’’او کے لیکن جلدی آ جانا۔‘‘ اس نے زور دے کر کہا۔ نحل نے کھلے بال سمیٹے اور سر کے گرد اچھے سے دوپٹا لپیٹا اور دروازے سے نکل گئی۔

☆☆☆

بے دلی اور کلفت سے بھرے شب و روز تھے نحل کی بیزاری جانے کیوں ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اُدھر پاپا کا مسلسل اصرار کہ تم اور سلمان ہمارے ساتھ ہی آ جاؤ۔ نحل کی بھی یہی مرضی تھی کہ جب تک ان کے مالی حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے وہ میکے میں ہی رہے پر سلمان کسی صورت بھی اس کے لیے راضی نہیں تھا۔ نحل کی ہزار ہا منتوں کے جواب میں اس کے پاس ایک ہی جملہ تھا۔

’’مجھے اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔‘‘

’’یہ..... آپ کا گھر تو نہیں جسے ہم چھوڑ نہیں سکتے۔ کرایے کا ہے۔‘‘ وہ تلخ ہو گئی۔

’’میں نے کب دعویٰ کیا کہ اپنا ہے کرایہ دے کر رہ رہا ہوں، پر مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ شروع میں یہاں آنے سے پہلے اور آنے کے بعد تمام حالات کا علم تھا تمہیں، اس وقت تو تم نے کہا تھا کہ آزمائش کا یہ وقت ہم دونوں مل جل کر کاٹیں گے۔ پھر اب کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں روز، روز ٹارچر کرتی ہو مجھے۔ اگر یہ سب اسی طرح چلتا رہا تو میں اپنے کام پر فوکس نہیں کر پاؤں گا اور اس کا سیدھے الفاظ میں یہ مطلب بنتا ہے کہ مزید مشکلات۔‘‘ سلمان کا لہجہ تلخی و بے بسی لیے ہوئے تھا۔

’’آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ میری وجہ سے آپ مشکل میں ہیں تو اس مشکل سے پیچھا چھڑا لیں کم سے کم میری یہ بات تو آپ مان ہی سکتے ہیں۔‘‘ نحل جب بولی تو اس کے ہر لفظ سے جیسے زہر ٹپک رہا تھا۔ ساتھ ہی پاؤں پٹخ کر وہ کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

سگریٹ جلا کر اس نے زور دار کش لیا، کسیلے کڑوے دھوئیں سے اس کے پھیپھڑے بھر گئے، اس سے کہیں زیادہ تلخی اور کڑواہٹ اس کے اندر تک پہلے سے ہی اتری ہوئی تھی۔ اس نے زیرو پاور کی مدھم روشنی میں بیڈ کے دوسرے کونے پر لیٹی نحل کو دیکھا، جو ناراضی کی عملی تفسیر بنی ہوئی تھی، اس نے درمیان میں ایک چھوٹا تکیہ بھی رکھ چھوڑا تھا۔ سامنے والی بلڈنگ میں کسی منچلے نے ایف ایم ریڈیو کا کوئی چینل آن کیا ہوا تھا اور پورے محلے کو بالکل مفت میں اپنی دیسی موسیقی سے محظوظ کر رہا تھا۔ آدھی رات سے بھی بعد کے سناٹے میں آواز بہت واضح اور دور دور تک جا رہی تھی۔ جنید جمشید کی آواز میں صرف اور صرف محبت بھری ہوئی تھی۔

او صنماں صنماں او صنماں
اب میری تنہائی ہے آساں
تیری تصویریں تیری تحریریں
گھر میں میرے پھیلا ہوا ہے یہی ساماں
تیری آنکھوں میں جھانکتا ہوں
تیرے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں
ان سے چھپا تا نہیں اپنا کوئی ارماں
او صنماں......
نہ صبح و شام بے قراری
نہ اس کے بعد رات بھاری
کیسے ہوا ہے میرے ہر درد کا درماں

سلمان کے لبوں پر جانے کیوں ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔ کیسا قرار کیسا درد کا درماں۔ بلکہ ہر گزرنے والا لمحہ جیسے اسے رفتہ رفتہ ... بے حس بنا رہا تھا۔ وہ جو آزمائش میں ساتھ رہنے کا یقین دلاتی تھی اب پاس رہ کر بھی میلوں کے فاصلے پر تھی۔

’’دس از ناٹ فیئر نحل تمہیں میری فیلنگز کو بھی تو سمجھنا چاہیے، کیا میں انسان نہیں؟ دکھ تکلیف صرف تمہیں ہی ہوتی ہے؟ میرے اوپر تو جیسے کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔‘‘ وہ بے خبر سوئی ہوئی نحل کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اچانک غصے کی تیز لہر نے اس کے دماغ کو پہلی بار چھوا۔ وہ آہستگی سے بیڈ سے اترا اور کمرے سے نکل آیا۔ سگریٹ کے کش لگاتا وہ گیلری میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ گانے کی آواز اب یہاں اور بھی

تیز اور اونچی ہو گئی تھی۔ اس نے سگریٹ پھینک کر دونوں بازو لوہے کے جنگلے پر ٹکا دیے۔

رات کے آخری پہر تھک ہار کر وہ اندر کمرے کی طرف پلٹا اور وہیں ایک طرف دیوار کے ساتھ رکھے تھری سیٹر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ دلِ خوش فہم کو امید تھی اگر وہ سوتے سے جاگ گئی تو بے قرار و بے چین ہو کر ضرور اس کے پیچھے آئے گی اور اپنے مخصوص بے پروا اور بے نیاز لہجے میں کہے گی کہ لڑائی لڑائی معاف کرو اللہ کا گھر صاف کرو۔ اسی امید کے ساتھ سلمان کی آنکھیں رفتہ رفتہ نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

☆☆☆

وہی کمرا تھا جس میں نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا اور وہ پہلے کی طرح اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ پھر اس کی نظر لکڑی کے جھولے پر پڑی وہ مسمرائزڈ ہو کر اس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ جھولا خود بہ خود آگے پیچھے ہو رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت خود بہ خود اسے جھلا رہی ہو۔ لیکن وہ کسی وجود سے خالی تھا، وہ دیکھنے کے لیے آگے ہوئی تب ہی اس کی نظر جھولے پر رکھی گڑیا پر پڑی، یہ گڑیا ہاتھ کی کاریگری سے کپڑے، روئی اور دھاگے سے بنائی گئی تھی، نحل کو جھولے پر پہلے اس کے لمبے بال بھی دکھائی دے رہے تھے، حیرت کی بات یہ تھی کہ بال بالکل اصلی تھے جیسے کسی کے سر کے ہوں، وہ اس کے بال دیکھنے کے لیے آگے جھکی اور ہاتھ اس کی طرف بڑھایا، تب اس کے اپنے کھلے بال شانوں سے ڈھلک کر آگے آ گئے تب اس نے ایک نظر اپنے اور دوسری نظر گڑیا کے بالوں پر ڈالی۔ اس نے زور سے جھرجھری لی اس کے اپنے بالوں کی ایک پوری لٹ کٹی ہوئی تھی، جو اس وقت گڑیا کے سر پر سجی تھی، اس نے ڈرتے ڈرتے جھولے پر پڑی گڑیا اٹھائی تو اس کے ہاتھوں میں جیسے کانٹے سے اتر گئے وہ فوراً اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور پھر سے جھولے پر جا گری اس نے خوف سے پھٹی نگاہوں سے گڑیا کے جسم میں جگہ جگہ پیوست سوئیاں دیکھیں، اس کا دل گواہی دے رہا تھا جیسے گڑیا ان سوئیوں کی

موجودگی سے تکلیف میں ہے، وہ اس کے اندر گڑی ساری سوئیاں نکالنا چاہتی تھی، اسی لیے اس نے کچھ جھجکتے ہوئے پھر سے اسے اٹھایا تب پہلی بار اس نے گڑیا کے چہرے کو دیکھا، وہ اب محض کپڑے اور روئی کی گڑیا نہیں تھی بلکہ اس کا چہرہ ہو بہو نحل کا سا تھا۔

اس کے منہ سے خوف اور دہشت میں ڈوبی کربناک چیخ نکلی اور پھر چیخوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تا وقتیکہ نیند میں دھت سلمان بیدار ہو کر اس کے پاس نہیں آ گیا۔ نحل سخت خوفزدہ تھی۔ سلمان نے پانی کا گلاس بھر کر اسے دیا جو وہ ایک ہی سانس میں بغیر رکے پی گئی۔

''یہاں کچھ ہے پر کیا ہے مجھے کچھ نہیں آ رہا لگتا ہے جیسے کوئی دھندلا اندھیرا ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔'' وہ کمرے کو چاروں طرف سے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''یار موویز کم دیکھا کرو اور آیت الکرسی پڑھ کر سویا کرو، کچھ بھی نہیں ہے یہاں۔ سب نارمل ہے۔''

''نہیں ہے نارمل کہا ناں یہاں کوئی انجانی سی قوت ہے جو مجھے اپنے اندر سمو لینا چاہتی ہے، آج میں نے دوسری بار وہی خواب دیکھا ہے، سلمان...... پہلے والے خواب میں گڑیا کا چہرہ گڈ مڈ تھا لیکن اس بار بالکل واضح تھا، جانتے ہیں وہ میرا چہرہ تھا۔'' پھر وہ اسے پہلے دیکھے گئے خواب کی ساری تفصیل بتانے لگی۔

''پریشانی میں ایسے ہی خواب آتے ہیں، پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' سلمان نے اسے بہلایا۔ ''اور چلو شاباش اب سو جاؤ۔ پانچ بج رہے ہیں مجھے نو بجے آفس جانا ہے پہلے ہی کافی لیٹ سویا تھا، رہی سہی کسر تم نے پوری کر دی۔'' سلمان نے عام سے انداز اور لہجے میں کہا پر نحل کو لگا جیسے وہ شکوہ کر رہا ہو۔

''آپ یہاں سو جائیں، مجھے عجیب سا ڈر لگ رہا ہے۔'' نحل کے چہرے پر اب بھی زردی کھنڈی ہوئی تھی، لگتا تھا خواب کے تاثرات اس کے اندر تک سما گئے ہیں۔ سلمان کو دکھ سا ہوا اس کا وجود جیسے پگھل کر پانی بن گیا سونے سے پہلے اس کے دل و دماغ میں نحل کی طرف سے جو شکوے اور بدگمانی بھر گئی تھی یکا یک

زائل ہو گئی۔ وہ چھوٹی سی خوفزدہ بچی کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر لیٹ گئی اور وہ خود بھاری بھرکم ظالم دیو بن گیا جو اس بچی کی حفاظت کرتا ہے۔

وہ نحل کا ہاتھ پکڑ کر سہلاتے ہوئے نیند میں ڈوبا جا رہا تھا جب اچانک سے اسے اپنا سر اور پورا وجود بھاری ہوتا محسوس ہوا۔ لگ رہا تھا جیسے کوئی دھند اس کے دماغ کو جکڑ رہی ہے، یہ کیفیت لمحہ بھر کی تھی۔ پھر اس کا ذہن بھی مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

موسم میں ہلکی، ہلکی خنکی شامل ہونے لگی تھی، پچھلے کچھ دنوں سے گھر کے ایک کمرے اور کچھ مخصوص حصوں سے نحل کو جانے کیوں خوف آنے لگا تھا۔ وہ بیڈ روم میں جاتی تو اسے یوں لگتا جیسے اس کے سر اور کندھوں پر کسی نے بھاری بوجھ مسلط کر دیا ہے۔ شام ڈھلتے ہی اس کے رگ و پے میں عجیب سا خوف سرسرانے لگتا۔ پھر ایک دن تو حد ہی ہو گئی کالے بادل اچانک ہی گھر آئے اور بارش شروع ہو گئی اوپر سے لائٹ بھی چلی گئی، نحل کا خوف سے برا حال تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بہت ساری نادیدہ آنکھیں اسے گھور رہی ہیں، اس نے سلمان کو کال کی لیکن اس کا نمبر ہی نہیں مل رہا تھا، مارے ڈر کے اس نے رونا شروع کر دیا۔ اور فوراً اپنے پاپا کو کال کی۔

''پاپا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پلیز مجھے یہاں سے لے جائیں پلیز پاپا، سلمان...... بھی گھر نہیں آئے ہیں ابھی تک، یہاں کچھ ہے پاپا جلدی کریں پلیز میرے پاس آ جائیں۔'' فون پر اس کی ہچکیاں ہی نہیں رک رہی تھیں۔ نظامی صاحب پہلے ہی سلمان سے کبیدہ خاطر تھے کہ وہ ان کے گھر آ کر ان کے ساتھ رہنے کے لیے راضی نہیں تھا اور اب ان کی لاڈلی بیٹی زار و قطار رو رہی تھی اور وہ اسے اکیلا چھوڑ کر گھر سے غائب تھا۔

وہ ایک بیٹی کے باپ کی حیثیت سے سوچ رہے تھے انہیں یہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ سلمان اگر اتنی محنت کر رہا ہے اور اس گنجان آبادی والے عام سے علاقے میں رہ رہا ہے تو نحل کے لیے ہی، اس کی ساری کوشش اور تگ و دو

اپنے گھر اور نحل کے لیے ہی تھی۔ انہیں اس وقت اپنی اور اپنے دو بیٹوں کی خود غرضی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی، حالانکہ وہ اگر چاہتے تو سلمان جس مشکل میں گرفتار تھا اس مشکل سے اسے نکال سکتے تھے، سلمان نے ان سے مالی مدد کا تقاضا نہیں کیا تھا لیکن وہ چاہتے تو اسے ادھار بھی دے سکتے تھے لیکن ان کے خاندان میں تو رواج تھا کہ بیٹی کو ایک بار ہی جہیز کی شکل میں جو دینا دلانا ہوتا، دے کر ایک سائڈ پر کر دیتے۔ لیکن آج جب بیٹی کا روتے ہوئے فون آیا تو وہ اسی وقت برستی بارش میں ڈرائیور کو ساتھ لے کر نحل کو اپنے ساتھ لے آنے کے لیے نکلے۔

وہ آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں سمیت گاڑی میں بیٹھتے ساتھ ہی بالکل کسی بچی کی طرح ان سے لپٹ گئی۔

''پاپا آپ اگر تھوڑی دیر تک اور نہ آتے تو میں مر جاتی۔ لائٹ چلی گئی ہے، مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔''

''کیا سلمان نے ابھی تک یو پی ایس نہیں لیا؟'' نظامی صاحب کی آنکھوں اور آواز میں غصہ چھلکا۔

''پاپا یو پی ایس تو لے آئے تھے وہ لیکن تین چار دن سے خراب ہے، انہیں ری پیئر کروانے کا ٹائم ہی نہیں مل رہا۔'' نحل نے فوراً بتایا۔

نظامی صاحب کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن نحل کا چہرہ دیکھ کر چپ ہو گئے۔

☆☆☆

رات کے کھانے پر مما اور دونوں بھابیوں نے خوب اہتمام کر رکھا تھا۔ نحل نے بڑی رغبت سے کھانا کھایا ورنہ کافی عرصے سے اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی بھوک مرتی جا رہی ہے، سلمان کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھتی تو بے دلی سے لقمے توڑتی لیکن آج مما نے اصرار کر کے ایک، ایک چیز کھلائی اسے۔ کھانے کے بعد گرین ٹی پینا اس کا معمول تھا۔ وہ پی کر اپنے شادی سے پہلے والے کمرے میں آ گئی۔ کیسی پُرسکون سی ٹھنڈک اور طمانیت رگ و پے میں اتری تھی۔ گلاس ونڈوز سے پردے ہٹے ہوئے تھے اور بارش کی بوندیں شیشے کی

کھڑکی سے پھسل رہی تھیں، آسمان دن میں رات کا منظر پیش کر رہا تھا ایسے کالے گہرے بادل تھے اور انہوں نے جیسے آج لگاتار برسنے کی قسم کھائی تھی۔ اس کے کمرے کی کھڑکی سے لان کا سرسبز منظر دکھائی دیتا تھا۔

سب کچھ صاف ستھرا بارش میں دھلا نہایا تھا۔ اسے اپنا فلیٹ یاد آ گیا، جانے کیوں ایک سرد سی لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی اور ساتھ ہی سلمان کا خیال آیا۔ "پتا نہیں ابھی تک گھر پہنچے ہوں گے کہ نہیں، بارش کتنی تیز ہے، کہیں راستے میں ان کی بائیک خراب نہ ہو جائے۔" فکرمندی کے ساتھ بے ساختہ دعا دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔

☆☆☆

وہ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا ہر طرف اندھیرا تھا کیونکہ لائٹ نہیں تھی، وہ جیسے ہی موبائل ٹارچ کی مدد سے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے پہنچا عین اسی وقت لائٹ بھی آ گئی۔ اس کا ہاتھ دستک دینے کے لیے اٹھا لیکن فوراً ہی گر گیا کیونکہ بند تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ حیرانی سے زیادہ اسے پریشانی تھی کہ اس وقت اس موسم میں نحل کہاں گئی۔ وہ تالا کھول کر اندر آیا۔ اور فوراً نحل کا نمبر ڈائل لسٹ سے نکالا۔ عین اسی وقت کھلے دروازے سے فریال اندر آ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسی کے انتظار میں ہے۔

"وہ ناں میں بہت معافی چاہتی ہوں آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ادھر میں گھر میں گھسا ادھر یہ نازل ہو گئی پر مجھے وہ بتانا ہے کہ" فریال کے لہجے میں تجسس کو بڑھا دینے والی سنسنی تھی۔ لیکن پریشانی میں سلمان کا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں۔

"جی میں کچھ سمجھا نہیں؟ آپ کی بات کا کیا مطلب ہے؟"

"وہ جو نحل ہے ناں اپنے پاپا کے ساتھ چلی گئی، جب لائٹ گئی تو وہ اسے لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا، آپ کے گھر سے نحل کی اونچی آواز میں رونے کی آواز آ رہی تھی، میں اس وقت پارلر میں تھی مجھے ایک پڑوسن نے بتایا۔ جب میں گھر آئی تو وہ روتے ہوئے ان دو لوگوں کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہی تھی، موقع ایسا تھا کہ میں کچھ پوچھ ہی نہیں سکی۔" فریال اسے فکرمندی لہجے میں سموئے بتا رہی تھی۔

"اچھا میں نے آج چائے کے ساتھ پکوڑے بنائے ہیں موسم بہت اچھا ہے ناں میں ابھی لے کر آئی آپ کے لیے دروازہ کھلا رہنے دینا آپ۔"

فریال نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور غڑاپ سے دروازے سے نکل گئی۔ وہ اسے منع کرنا چاہتا تھا لیکن وہ چھلاوے کی طرح آئی اور چلی بھی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ سچ مچ اس کے لیے چائے پکوڑے لے کر آ گئی۔ سلمان بارش میں بھیگتا تھکا ہارا آیا تھا چائے دیکھ کر ہی اس کی تو جیسے ساری تھکن اتر گئی۔

"آپ چائے پی لیں پکوڑے بھی کھا لینا۔ بعد میں برتن لے جاؤں گی۔ بہت پریشان ہوں گے آپ آج؟" اس نے گہری نگاہ سلمان پر ڈالی وہ گیلے کپڑے بدل چکا تھا۔ اور اس وقت ایک عام سی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں تھا۔ مگر یہ تو کوئی اس وقت فریال کے دل سے پوچھتا اس عام سے گھریلو حلیے میں بھی وہ کتنا خاص اور شاندار لگ رہا تھا۔ اس کے پسندیدہ پرفیوم کی مہک نے اس کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ اور ٹی شرٹ سے جھانکتے مضبوط مردانہ بازو اس کے ایک، ایک ارادے کو اور بھی پکا کر رہے تھے۔

"نہیں پریشانی کیسی بھلا۔" وہ چائے کا کپ رکھ کر سرسری سے انداز میں بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ نحل نہیں ہے ناں، آپ کو کھانے پینے کی تکلیف ہو گی کتنی۔"

"تکلیف کیسی ہوٹل ہے ناں میں جا کر کچھ لے آؤں گا۔" سلمان اس کی موجودگی سے الجھن محسوس کر رہا تھا وہ چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ اس سے پہلے اس طرح تنہائی میں اس کی فریال سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی آمنا سامنا۔

"نہ... نہ ہوٹل کیوں، میرے ہوتے ہوئے ایسا مت سوچنا ہم پڑوسی ہیں سو حقوق ہوتے ہیں ان کے۔ کھانے پینے کی فکر مت کرنا میرے ہوتے۔ میں کھانا دے جاؤں گی۔ اچھا میں چلتی ہوں آپ کو نحل سے بات کی بھی جلدی ہو گی۔ میرا اسلام دینا اسے۔ کہنا بہت یاد آ رہی ہے اس کی۔ ویسے پوچھنا کب تک آئے گی واپس؟"

اس کے لیے بہت سارے سوال چھوڑ کر وہ چلی گئی تھی۔

☆☆☆

نحل کھڑکی میں کھڑی برستی بارش کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچے جا رہی تھی، کچھ دیر پہلے اس کی سلمان سے فون پر بات ہوئی تھی جس کا اختتام لڑائی اور نحل کی طرف سے ناراضی پر ہوا تھا۔ سلمان سیڑھیاں چڑھ کر جب اپنے گھر کے دروازے کے سامنے رکا تھا تو تالا لگا دیکھ کر اس کے دل میں سو قسم کے وسوسے اور اندیشے پیدا ہوئے تھے پھر فریال نے... مبہم اور عجیب سے لہجے میں جو باتیں کی تھی، اس وجہ سے وہ فکرمند تھا۔

اوپر سے نظامی صاحب نے بھی دبے لفظوں میں ہی سہی اسے جتا دیا تھا کہ وہ ان کی لاڈلی بیٹی کا ڈھنگ سے خیال نہیں رکھ پا رہا ہے۔ پھر نحل کے شکوے، آخر میں فون بھی اس کی طرف سے بند ہوا خدا حافظ کہے بغیر۔ وہ انتشار کے عالم میں اپنے سر کے بال مٹھی میں جکڑتا وہیں صوفے پر ڈھے سا گیا۔ پھر فوراً ہی عائزہ بھابی کی کال آ گئی، انہوں نے چھوٹتے ساتھ ہی سوال کیا۔

"نحل تم سے لڑ کر تو نہیں گئی؟" سلمان ہکا بکا ہو گیا، اسے لگ رہا تھا کہ نحل کی عائزہ بھابی کے ساتھ بھی فون پر آج ہی یہاں سے جانے کے بعد بات ہوئی ہے، اسے شدید قسم کا تاؤ آیا، وہ کیوں اپنی ذاتی ناراضی کو اوروں کے ساتھ ڈسکس کرتی پھر رہی تھی۔

نحل کے ساتھ شادی کے بعد وہ جب بھی بابا کی طرف جاتا اکثر نوٹ کرتا کہ عائزہ بھابی نحل کو عجیب شعلے برساتی نگاہوں سے گھورتی ہیں۔ ایسا تین چار بار ہو چکا تھا۔ نحل سادگی میں سلمان کے کاروبار سے متعلق ہر بات بھی انہیں بڑے آرام سے بتا دیتی تھی، یہاں تک کہ سلمان نے جو پلاٹ لیا تھا جو بعد میں فوراً بک بھی گیا تھا نحل نے وہ بھی انہیں بتا دیا تھا، سلمان کی چھوٹی سے چھوٹی بزنس اچیومنٹ اس کی اپنے لیے اس نے کسی شے کا بھی پردہ نہیں رکھا تھا۔

دو تین بار وہ وہاں جب بابا زندہ تھے کچھ دنوں کے لیے رہنے بھی رکے تھے، تب ہی نحل نے جو میلے کپڑے اتارے تھے عائزہ بھابی نے بصد اصرار واپس نہیں لانے دیے تھے، انہوں نے ماسی سے دھلوا کر نحل کے حوالے کیے تھے لیکن اس کے تین سوٹوں میں سے ایک کی شلوار اور ایک کا دوپٹا غائب اور ایک کی شرٹ کا پیچھے سے ایک حصہ کٹا ہوا تھا۔ نحل نے اسے سرسری سا بتایا تھا کہ بھابی کی ماسی نے اس کے کپڑوں کا برا حشر کر دیا ہے۔ پھر بعد میں بہت جلدی وہ بھول بھال گئی۔ لیکن عائزہ بھابی کی شعلے برساتی نگاہیں اس کے لاشعور سے چپک سی گئی تھیں۔

"ارے نہیں بھابی کیسی لڑائی، بھلا ہم کیوں لڑیں گے، بس اپنے پاپا کی طرف جانے کا اس کا دل کر رہا تھا تو چلی گئی، اس میں لڑائی والی تو کوئی بات ہی نہیں۔" اس نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ تم تو اتنے سوئیٹ ہو بھلا کیسے لڑو گے نحل سے، اور پتا ہے میرا دل چاہتا ہے کہ کاش احمد پر بھی تھوڑا سا تمہارا اثر ہو جائے۔" اس نے حسرت بھری آہ بھری۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟" عائزہ بھابی نے فوراً دوسرے موضوع پر سوال داغ دیا۔

"تمہارا دل کیا کہتا ہے کب تک اس گرداب سے نکلو گے؟" وہ سوال پر سوال کر رہی تھیں۔ اور اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھیں۔

"اچھا ایک بات بتاؤں لیکن کسی کے سامنے ذکر مت کرنا۔"

سلمان فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پہلے ہی وہ ذہنی طور پر اتنا الجھا ہوا تھا اب پتا نہیں عائزہ بھابی کون سا انکشاف کرنے والی تھیں۔

"پتا ہے میں نے اور احمد نے کچھ دن پہلے فاطمہ بھابی اور اکمل بھائی سے کہا کہ سلمان اور نحل کو ادھر ہی بلا لیتے ہیں مل جل کر گزارہ کر لیں گے لیکن ہماری تو کسی

تھا اور نہ ہی اسے لینے آیا تھا۔ یہ بات نحل کو کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کا دل ہلکا ہلکا جیسے سلمان کی طرف سے پگھلنے سا لگا تھا۔ وہ ہلکا پھلکا لنچ کر کے لان میں بیٹھی ہوئی تھی جب خیالوں کی رو سلمان کی طرف خود ہی مڑ گئی، اس نے دل کو ٹٹولا وہاں تو اندر گہرائی تک سلمان ہی سلمان تھا، اچانک اس کا دل چاہا اڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے۔ بلکہ جب سے وہ یہاں آئی تھی اس کے دل میں اس کے لیے وہی پرانے جذبات پھر سے بیدار ہو گئے تھے، ورنہ تو جیسے سلمان کی شکل تک دیکھنا اسے گوارا نہیں تھا۔

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے آناً فاناً گھر واپسی کا قصد کیا اور مما کو اپنے ارادے سے آگاہ کرنے سے پہلے اس نے اپنے ڈرائیور کو کہا کہ گاڑی نکال لے وہ پندرہ منٹ میں چینج کر کے بس ابھی آئی۔

''مما میں گھر جا رہی ہوں ڈرائیور کے ساتھ۔'' اس نے ہونٹوں پر از سر نو لپ اسٹک لگاتے ہوئے آگاہ کیا اور ساتھ ہی لپ اسٹک بیگ میں ڈال کر اسے کندھے پر لٹکا لیا اور مما کے چہرے پر پیار بھرا بوسہ ثبت کیا۔ وہ بھاگنے والے انداز میں باہر دروازے کی طرف بڑھی۔

''اللہ حافظ مما، ٹیک کیئر، میں بہت جلد سلمان کے ساتھ آؤں گی۔ اور سارا دن آپ کے ساتھ گزاروں گی۔ بائے بائے مما۔'' وہ ساتھ ہی ہوائی بوسہ اچھالتی آگے بڑھ گئی۔ مسز نظامی ارے، ارے کیوں جا رہی ہو کیا ہوا، رکو ہی کہتی رہ گئیں...... لیکن انہیں اپنی لاڈلی بیٹی کی طبیعت کا بھی پتا تھا وہ ایسی ہی تھی، من میں اچانک سے جو سما جائے کر کے چھوڑتی، ابھی بے شک وہ لاکھ اس کی منتیں کرتی کہ مت جاؤ پر اس نے رکنا نہیں تھا۔

نظامی صاحب سے صبح ناشتے کی ٹیبل پر ہی تو ان کی بات ہوئی تھی، ان کا ارادہ سلمان سے دوٹوک بات کرنے کا تھا اگر وہ ان کے ساتھ رہنے کے لیے نہیں مان رہا تھا تو اسے نحل کے لیے کوئی اور بندوبست کرنا ہو گا، ورنہ وہ اسے کسی صورت بھی سلمان کے ساتھ نہیں بھیجیں گے۔

باپ کی سوچ کچھ اور تھی اور بیٹی چلتی ہوا سے الجھنے والوں میں سے تھی، مسز نظامی شش و پنج میں تھیں کہ شوہر کو نحل کے جانے کی کیا وضاحت دیں گی۔

☆☆☆

نحل نے گاڑی میں بیٹھے، بیٹھے ہی سلمان کو کال کی، اُدھر سے خوشگوار حیرت کے ساتھ فوراً ریسیو کی گئی۔

''السلام علیکم مائی ڈیئر کیسی ہو؟ آئی مس یو سو مچ۔'' سلمان کے لہجے میں نرمی اور بلا کی وارفتگی تھی نحل کا دل پانی بن کر بہہ گیا۔

''میں گھر پہنچنے والی ہوں بس پانچ منٹ لگیں گے اور......'' اس نے جواب بھی اتنی ہی نرمی سے دیا۔

''کون سے گھر؟ اپنے یا......؟'' سلمان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ تصدیق کرنا چاہ رہا تھا کہ آیا وہ جو سمجھ رہا ہے وہی ہے۔

''اپنے گھر سلمان .... اچھا آپ کب تک آئیں گے بائی دا وے!''

''آ جاؤں گا زیادہ انتظار نہیں کرواؤں گا۔'' نحل نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ کر تالا کھول کر وہ گھر میں داخل ہوئی تو دل پھر سے کسی انجانے سے خوف کے شکنجے میں آ گیا۔ اس نے فوراً کمرے میں داخل ہو کر سب سے پہلے اپنے کمرے کی کھڑکی پر پڑے پردے ہٹائے اور پھر دوسرے کمرے میں گیلری کی سمت کھلنے والا دروازہ اور کھڑکی کھولی تو کچھ سکون کا احساس ہوا۔ گھر صاف تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی سلمان نے آفس جانے سے پہلے بیڈ کی چادر اور تکیے تک ٹھیک کر کے رکھے تھے۔ پھر وہ چھوٹے سے کچن میں آئی وہاں پلاسٹک کے برتنوں کے اسٹینڈ میں دوئی پلیٹیں پڑی تھی، اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے جانے سے پہلے یہ دو پلیٹیں برتنوں کے اسٹینڈ میں نہیں تھیں، ساتھ ہی چنگیر میں ایک روٹیاں لپیٹنے والا دستر خوان بھی تھا یہ بھی اس کے لیے نیا تھا۔ اس نے نہ سمجھنے والے

انداز میں شانے اچکا دیے۔

☆☆☆

سلمان نے ایک سگنل پر بائیک روکی اور سائڈ پر موتیے کے گجرے فروخت کرتے دس بارہ سال کے بچے کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا، بچہ مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا، سلمان نے اسے نحل کے لیے گجرے لیے اور جیب سے پیسے نکال کر اسے دیے۔ اتنے میں سگنل کی بتی لال سے ہری ہو گئی تو اس نے بائیک کو کک لگائی اور سرمستی میں ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہو گیا۔

وہ فوراً سے بھی پیشتر گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں اس کی جانِ جاں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

بے تابی سے وہ اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا، اس کے ساتھ ہی فریال بھی بلڈنگ کے مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہوئی اس نے سلمان کو بائیک سے اترتے دیکھ لیا تھا، وہ آج پارلر نہیں گئی تھی، اسے ایک اور جگہ کام سے جانا تھا۔ اور وہ ابھی وہیں سے ہو کر آ رہی تھی۔ فریال نے تیزی سے اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں طے کرنی شروع کی، پانچویں منزل پر پہنچنے سے پہلے سلمان کی لاشعوری طور پر اس پر نظر پڑی وہ اسے دیکھ کر جی جان سے مسکرائی پر سلمان نے جواب میں کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں دیا۔ فریال اپنے شانے پر لٹکے بیگ کو تھپتھپا کر پُراسرار انداز میں مسکرائی۔ اسے یقین تھا کہ سلمان کا چہرہ اب زیادہ دن بے تاثر رہنے والا نہیں تھا۔ اس بیگ میں اس کے سینے میں جلتی سلگتی خواہش کا سامان تھا، اس یک طرفہ محبت کا درماں تھا جس میں فی الحال وہ ابھی تک اکیلی ہی تھی۔ لیکن بہت زیادہ وقت کے لیے نہیں۔ سلمان نے بہت جلدی اس کی خوابوں کی وادی میں اس کے ساتھ ہونا تھا۔

سلمان اور فریال دونوں اپنے، اپنے گھروں کے دروازوں کی سمت بڑھے، فریال نے اپنے دروازے پر دستک دی اندر سے اس کی بڑی بیٹی نے دروازہ کھولا، فریال نے مڑ کر کوچۂ جاناں کی طرف دیکھا دروازہ اندر سے کھلا تھا، اس نے نحل کے نازک سے ہاتھ کی جھلک دیکھ لی تھی، حسد کی ایک کاٹ ڈالنے

آہ نیرہ نور!

بلبلِ پاکستان کا خطاب پانے والی اور صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے سرفراز...... ایک لیجنڈری شخصیت، بہترین گلوکارہ نیرہ نور اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ دلی رنج و غم سے یہ خبر سنی اور پڑھی گئی۔

نرم و لطیف سُروں کی ملکہ، دھیمی آواز میں گفتگو کرنے والی، سادہ مگر وضع دار شخصیت کی مالک نیرہ نور اپنے نام کے مصداق تھیں۔ کافی عرصے سے وہ گلوکاری سے کنارہ کش ہو گئی تھیں...... کسی ٹی وی پروگرام میں بھی شاذ ہی نظر آتیں۔ اچانک بیماری کی خبر آئی اور فوراً انتقال کی بھی...... جان تو سب کو دینی ہے مگر جانے والوں کی خوشگوار یادیں اور کام انہیں زندہ رکھتے ہیں۔

کبھی ہم خوب صورت تھے
کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند
سانس ساکن تھی...... گاتے، گاتے یہ سانس واقعی ساکن ہو گئی۔

آج اہلِ وطن ان کا گایا ملی نغمہ ''اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں......'' گاتے، گاتے یوم آزادی مناتے ہیں۔ ہم چند سطریں لکھ کر ان جیسی نامور ہستیوں کا حق بھی ادا نہیں کر سکتے۔

اللہ پاک سے دعا ہے کہ نیرہ نور کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ عطا کرے اور لواحقین اور ان کے مداحوں کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ الٰہی آمین۔

دوریاں بڑھنی شروع ہوئیں۔لیکن اس کا آغاز یہاں آنے سے بھی پہلے شروع ہوگیا تھا۔'' سلمان کا اشارہ جانے کس طرف تھا وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''کیا مطلب یہاں آنے سے بھی پہلے؟''

''ہاں میں نے یہی کہا ہے یہاں آنے سے بھی پہلے اور یہاں آنے کے بعد اس میں ایک اور کیل ٹھونکی گئی۔تم پچھلے ہفتے جب اچانک اپنے پاپا کے گھر چلی گئیں تو میں نے بہت سوچا کہ میرا دل و دماغ تمہاری طرف سے الجھن کا شکار کیوں ہے، جب میں گھر سے باہر ہوتا تھا ناں تو تمہارے بارے میں میرے خیالات بڑے حسین اور محبت بھرے ہوتے تھے میں چاہتا تھا فوراً سے بھی پیشتر اڑ کر اپنے گھر پہنچ جاؤں لیکن گھر آتے ساتھ اور تمہیں دیکھ کر مجھے تم سے چڑ اور بیزاری ہونے لگتی تھی، کبھی تو یہ نفرت کی انتہا پر پہنچ جاتی۔''

''رکیں، رکیں سلمان صاحب سنیں بالکل آپ کی طرح میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے، آپ کے گھر سے باہر جاتے ساتھ ہی میں آپ کا انتظار شروع کر دیتی میرا دل کرتا تھا آپ فوراً میرے پاس پہنچ جائیں لیکن جیسے ہی آپ گھر میں داخل ہوتے میں دل میں خود سے کہتی یہ کیوں گھر آگیا ہے، میں آپ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔'' نحل نے ہاتھ اٹھا کر سلمان کی بات کاٹ دی۔

وہ بڑے غور سے سن رہا تھا۔

''ایسا کب سے تمہارے ساتھ چل رہا ہے؟'' سلمان نے کچھ سوچتے اور ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے پوچھا۔

''کافی عرصے سے چل رہا ہے لیکن میں نے نوٹ کیا ہے کہ جب سے فریال آپی نے ہمارے گھر زیادہ آنا جانا شروع کیا اس کے بعد سے ہی آغاز کیا، پہلے تو صرف مجھے آپ سے بیزاری اور بلا جواز نفرت تھی۔لیکن ابھی جب میں پاپا کے گھر ایک ویک رہنے کے بعد یہاں واپس آئی تو آپ کی شکل میں ایک بھیڑیا نظر آیا مجھے، یقین کریں میں بری طرح ڈر گئی تھی، حالانکہ پاپا کے گھر سے آتے ہوئے میں پورا راستہ آپ کے بارے میں یہی سوچتی آئی کہ میں آپ کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کر رہی۔آپ سے سوری کروں گی۔لیکن، لیکن پتا نہیں پھر کیا ہوگیا۔''

وہ بے بسی سے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''اچھا یاد کرو تم نے یہاں کسی کو بھی اپنے ذاتی استعمال کی کوئی چیز دی؟'' سلمان کا لہجہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''ہاں فریال آپی کو اپنا ایک سوٹ دیا تھا پھر دو تین بار انہوں نے کہا کہ میرے پاس کہیں آنے جانے کے لیے کوئی اچھے سینڈلز نہیں ہیں تو وہ انہیں دیے تھے، لیکن آپ یہ اتنے عجیب سے سوال کیوں کر رہے ہیں؟'' وہ الجھن کا شکار دکھائی دے رہی تھی۔

''بعد میں سب پتا چل جائے گا تمہیں، اپنی ویز تم نے اس کے علاوہ کوئی اور چیز دی انہیں؟ یا تمہیں لگا ہو کہ گھر سے کچھ غائب ہے؟'' سلمان پوچھنے کے بعد اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں کش مکش کے آثار نمایاں تھے۔

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن ایک بار باتھ روم سے آپ کی سفید بنیان غائب ہوگئی تھی، جس پر آپ نے مجھے تھوڑا ڈانٹا بھی تھا۔'' نحل کی یادداشت میں وہ منظر تازہ تھا۔

''اچھا اس کے علاوہ کچھ اور؟'' پتا نہیں اس کے سوالوں کا کیا مقصد تھا وہ کیا جاننا چاہ رہا تھا نحل لاعلم تھی۔

''مجھے آپ کی باتوں کی سمجھ نہیں آرہی۔'' اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں۔

''تم اپنی فریال آپی کے پارلر بھی تو جاتی تھیں.....'' سلمان کی آواز اس بار آہستہ تھی۔

''ہاں ایک بار ہی گئی تھی۔پھر آپ نے منع کر دیا تھا۔'' سارا واقعہ نحل کو جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔

''تم نے وہاں بال کٹوائے تھے ناں اپنے؟'' سلمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہاں وہ فریال آپی چھوڑ ہی نہیں رہی تھیں اور پھر اس کے بعد مجھے ان سے کوئی سروس لینی ہوتی تو میں یہیں گھر پر ہی انہیں بلوا لیتی، مینی کیور، پیڈی کیور کافی

اچھا کرتی ہیں وہ۔'' نحل صاف دلی سے بتا رہی تھی۔

''اچھا یاد کرو تم اپنے کٹے ناخن خود ڈسٹ بن میں پھینکتی تھیں؟''

''نہیں، میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا بلکہ فریال آپی خود ہی سب کچھ سمیٹ کر ایک شاپر میں ڈالتی تھیں۔'' اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

سلمان اس کا جواب سننے کے بعد کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہوگیا۔

''اچھا تمہیں ایک خوشخبری سنانی تھی۔'' کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔

''جلدی بتائیں ناں رک کیوں گئے؟'' اس نے سلمان کا کندھا ہلایا۔تو وہ چونکا۔

''ہاں بس یہ سمجھ لو کہ ہماری آزمائش کے دن تمام ہوگئے ہیں، میں نے اپنے نئے پارٹنر کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا ہے اور رشید خان کا آدھے سے زیادہ قرضہ بھی اتر گیا ہے، اللہ نے چاہا تو پانچ سے چھ ماہ کے اندر میں اس کے قرضے کے چنگل سے نکل جاؤں گا۔اور اسی ہفتے ہم یہ گھر بھی چھوڑ رہے ہیں، میں نے دوسری جگہ ایڈوانس اور تین ماہ کا کرایہ دے دیا ہے۔'' سلمان نے تفصیل اسے بتائی۔

''اللہ تیرا شکر، ورنہ میں تو مایوس ہونے لگی تھی، مجھے لگتا تھا یہ ہماری سزا ہے اور بہت لمبی ہے۔'' نحل کی آنکھوں میں نمی چھلک آئی تھی۔

''نہیں، یہ سزا نہیں ہے۔میں سمجھتا ہوں آزمائش ہے کیونکہ یہ سب نہ ہوتا تو میں شاید اللہ سے آج اتنا قریب بھی نہ ہوتا اور اپنے سے قریبی رشتوں کی حقیقت ساری عمر اسرار کے پردے میں ہی اوجھل رہتی لیکن ایک بات کا دھیان رکھنا، جب تک ہم یہاں سے چلے نہیں جاتے تم نے کسی کو ایک لفظ بھی نہیں بتانا۔'' سلمان کے لہجے میں سختی تھی۔میکانکی انداز میں اس کا سر خود بہ خود ہلا تھا۔

☆☆☆

گھر کا سارا سامان لوڈ ہو کر پہلے ہی جا چکا تھا۔اب نحل سلمان کے ساتھ بلڈنگ کے گیٹ سے نکل کر باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔اس نے اوپر فریال کی گیلری کی طرف نظر ڈالی جہاں وہ بازو آگے کی طرف جھکائے شکست خوردہ زخمی نگاہوں سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے سلمان کو دیکھ رہی تھی۔وہ آج بھی اسے اس بلڈنگ میں آئے اول روز کی طرح اور اب جاتے ہوئے بھی ناقابلِ رسائی دکھائی دے رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں نمی چھلک آئی، اسے ابھی سمجھ آئی تھی کہ دیواروں پر چھپے بنگالی باباؤں کے اشتہار میں وہ جو محبوب کو قدموں میں لانے کا دعویٰ کرتے دکھائی دیتے ہیں سچا نہیں ہوتا اور نہ ہی تعویز پرانے قبرستان میں دبا کر کسی کا روئی کا پتلا بنا کر اس میں سوئیاں چبھو کر آپ ہمیشہ اپنے گندے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔شر کے مقابلے میں ایک خیر کی طاقت بھی تو ہوتی ہے اور جب انسان سچے دل سے شر سے، حسد کرنے والوں سے، بری نظر سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے تو اسے پناہ مل ہی جاتی ہے۔لیکن ان برے

اپنی پیاری باجی کی یاد میں

بلند تھی ایک ہستی جو آسماں کی طرح
نہیں تھی ماں مگر تھی وہ میری ماں کی طرح

ہم بہن، بھائیوں کو دی محبتیں کتنی
سروں پہ تھی ہمارے ایک سائباں کی طرح

درمیاں تھی ہمارے تو وہ اک حقیقت تھی
بچھڑ گئی تو وہ بچھڑی کسی گماں کی طرح

تھی پہلے ذات اس کی باعثِ خوشی کتنی
لبوں پہ رہتی ہے اب آہ و فغاں کی طرح

میں روحی اس کی بخشش کی دعائیں مانگتی ہوں
میرا رب کردے قبر اس کی گلستاں کی طرح

کاوش: روحی صبا، کراچی

لوگوں کو کسی کی ہنستی بستی زندگی تباہ کرنے کی آرزو میں کبھی دلی سکون نہیں ملتا۔

فریال کا دل پہلے دن سے ہی سلمان پر آ گیا تھا وہ جو ہمیشہ اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ لیکن یہ شہزادہ کسی اور شہزادی کا تھا اور وہ اس کا مالک بننے کا خواب سجا کرنا چاہتی تھی...... روبی باجی کے پارلر میں بھانت، بھانت کی عورتیں آتی تھیں وہیں اس کی ملاقات آنٹی فوزیہ سے ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی، اس کی طرح وہ بھی لڑکے لڑکیوں کے رشتے کرواتی تھیں، دونوں میں دوستی کا سفر دنوں میں طے ہوا، فوزیہ آنٹی نے اسے اپنے غیر نصابی دھندوں کا بھی بڑی تفصیل سے بتایا تھا تب ایک نازک لمحے کی زد میں اس نے ان پر اپنے دل کا راز کھولا تھا، اور وہ اسے اپنے جاننے والے ایک عامل کے پاس لے گئی تھیں۔ لیکن ہوا کچھ بھی نہیں سلمان کی زیرک نگاہوں نے پہچان لیا تھا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے، اس کے بعد اللہ کے حضور جھک کر وہ سجدوں میں گڑگڑایا، سورۂ بقرہ کی تلاوت پابندی سے کرنی شروع کر دی ساتھ فجر اور عشا کی نماز کے بعد منزل پڑھنے کا باقاعدہ اہتمام کیا، تو ذہن پر چھائے اندھیرے کسی حد تک چھٹتے محسوس ہوئے۔

دوسری طرف عائزہ بھابی کا حسد بھی اس پر کھل چکا تھا۔ باتوں، باتوں میں وہ اکثر نحل اور اس کی انڈر اسٹینڈنگ پر طنز کر جاتیں پھر نحل کے پہننے کے کپڑے انہوں نے بڑی صفائی سے غائب کیے، وہ سلمان اور نحل کی محبت سے خار کھانے لگی تھیں دوسری طرف سلمان نے اپنا ذاتی کاروبار بھی شروع کر دیا تھا اور اس کی آنے والی خوشحالی کے ثمرات دکھائی دینا بھی شروع ہو گئے تھے۔ بختیار گردیزی نحل کی سادہ طبیعت اور صاف دل فطرت کی وجہ سے اسے بہت پیار، عزت اور مان دینے لگے تھے۔ حالانکہ وہ یعنی عائزہ اور فاطمہ بھابی کی طرح ان کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہتی تھی، پھر بھی اٹھتے بیٹھتے اس کے گن گاتے تھے، چھوٹی سے چھوٹی بات اور کام میں بھی اس سے مشورہ لیتے، اور یہ بات عائزہ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے پہل اس نے فاطمہ بھابی کو اپنا ہمنوا بنانا چاہا لیکن وہ سیاست سے چال چلتی تھیں بڑی صفائی سے اپنا دامن بچا گئیں، لیکن عائزہ اپنے حسد پر قابو نہیں پا رہی تھی، نحل یہاں آتی کھاتی پیتی چلتی پھرتی بختیار گردیزی سے اس کی دوستانہ بحث چلتی، اور عائزہ کا دل چاہتا اسے جلا کر بھسم کر دے۔ وہ اسے سچ مچ کا تو بھسم نہیں کر سکی لیکن اپنے دلی حسد سے اس نے خوب کام لیا، اس کی بری نظر سلمان کے چلتے پھلتے پھولتے کاروبار کو کھا گئی۔ پھر اس کی ایک اور خواہش پوری ہوئی سلمان نے اپنا پلاٹ فروخت کر دیا پھر وہ جس گھر میں رہ رہے تھے وہ بھی دونوں میاں بیوی نے چھوڑ دیا، اُدھر بختیار گردیزی بھی دل کے دورے سے جاں بحق ہو گئے۔ اسے دلی خوشی نصیب ہوئی، اب کم سے کم نحل کے گن گانے والا تو نہیں رہا تھا، اب اس کی ایک آخری خواہش باقی تھی کہ سلمان، اپنی بیوی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ لیکن ضروری نہیں جو آپ چاہیں ویسا ہی ہو، سلمان نے ان کے حسد سے بچنے کے خود کو ایک حفاظتی حصار میں بند کر لیا تھا، جادو کا بدنظری شر کا علاج تو اللہ نے بتا دیا تھا، لیکن حسد کا کوئی علاج نہیں، اس کا ایک ہی طریقہ ہے جو اللہ نے قرآن کی آخری دو سورتوں میں بیان کیا، حسد سے بچنے کے لیے اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے۔ اور سلمان اسی پر کاربند تھا۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رشتے کسی صورت نہیں توڑے جا سکتے، لیکن اپنی طرف سے احتیاط تو برتی جا سکتی ہے اور یہی بات اس نے نحل کو بھی سمجھائی تھی۔

☆☆☆

وہ دیوار سے ٹیک لگائے لٹے پٹے مسافر کی طرح بیٹھی تھی، بچے کب کے سو چکے تھے، وہ آج پارلر سے بھی جلدی گھر آ گئی تھی، اسے اپنا آپ اس بیمار کی طرح لگ رہا تھا جو صحرا میں ننگے پاؤں چلتا جا رہا ہو۔ اس نے نحل کا زیور، کپڑے اور شوہر دیکھ کر اس جیسی زندگی جینے کی خواہش کی تھی اور اسے اچھے سے اس کا ادراک ہو گیا تھا کہ وہ نحل نہیں ہے اس لیے اسے سلمان نہیں مل سکتا۔

سہیل گھر میں داخل ہوا تو اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟ کہیں طبیعت تو خراب نہیں؟'' وہ بہت ہمدردی اور محبت سے اس کی سرخ پڑتی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''نہیں بالکل بھی نہیں، بس تمہارے انتظار نے تھکا دیا ہے۔'' فریال نے اداسی میں ڈوبی مسکراہٹ کو جوابی محبت میں بدلا اور سہیل کا ہاتھ آخری سہارے کی طرح تھام لیا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے کے ایک کونے میں رکھی کپڑوں کی پرانی الماری کی طرف لے گئی۔

''خیر تو ہے ناں آج بڑی محبت سے بات کر رہی ہو۔'' سہیل اس کی کایا پلٹ پر خوش ہونے کے ساتھ حیران بھی تھا۔

''تمہارے ساتھ نہیں تو پھر کس کے ساتھ پیار سے بات کروں اور دیکھو یہ نحل جاتے ہوئے دے گئی تھی، بالکل نئے ہیں بتا رہی تھی کہ سلمان نے ایک بار بھی نہیں پہنے۔''

فریال کے ہاتھوں میں دو ٹی شرٹس اور پینٹس تھیں۔ اس نے باری، باری سہیل کے ساتھ لگا کر دیکھیں ''دیکھو میرا بڑا دل کر رہا ہے تم یہ پہن کر مجھے دکھاؤ، پہنو گے ناں؟'' وہ بڑی محبت اور آس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے لیے تو میں زہر بھی پی سکتا ہوں کیا بات کرتی ہو۔'' سہیل نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ سے ایک ٹی شرٹ اٹھائی اور ایک طرف چلا گیا۔ فریال الماری کی طرف پشت کر کے اپنے آنسو صاف کرنے لگی نحل جانے سے پہلے اسے ملنے آئی تھی، اور تب ہی اس نے ایک شاپر میں پیک یہ والی شرٹس اور پینٹیں اسے دی تھیں۔

''اچھا ہم یہاں سے اپنے نئے ٹھکانے پر جا رہے ہیں، جانے سے پہلے سوچا آپ سے مل لوں اور ایک تحفہ بھی دے دوں۔'' فریال نے اس کے چہرے اور آنکھوں سے کچھ کھوجنا چاہا پر وہ سپاٹ تھا۔ پھر وہ بڑے تپاک سے اسے آخری بار ملی اور جاتے، جاتے ایک بار مڑ کر دکھ اور رنج سے ادھ موئی ہوئی فریال کو دیکھا۔

''ایک کام کی بات بتاتی چلوں۔'' نحل ایک جملہ بول کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''سب کو اپنی مرضی کا نہیں ملتا اور یہی صورت حال جیون ساتھی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، اس لیے جو ملا ہے ناں اسی کو ٹھونک بجا کر اپنی مرضی کا کر لیں اور ہاں سہیل بھائی کو کہیے گا کہ اس بار جب سر کے بال کٹوائیں ناں تو تھوڑے چھوٹے رکھیں۔'' پھر مطمئن ہنسی لبوں پر بکھیرتی وہ ان کی دہلیز پار کر گئی۔

☆☆☆

سلمان اور نحل دونوں اپنے نئے گھر کی جانب گاڑی میں رواں دواں تھے، اچانک ہی نحل کو کچھ یاد آیا۔

''سلمان ..... ذرا بات سنیں، آپ نے اپنی فیملی میں نئے گھر کا بتایا کہ ہم شفٹ کر رہے ہیں؟'' ڈرائیونگ کرتے سلمان کو اس نے سوالیہ نگاہوں سے گھورا۔

''نہیں!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''لیکن کیوں یہ بھی کوئی بات ہوئی بعد میں جب سب کو پتا چلے گا تو خواہ مخواہ ہی دل برے ہوں گے۔'' نحل نے اعتراض کیا تو سلمان نے آسودہ سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

''بعد میں خود ہی سب کو پتا چل جائے گا ضروری نہیں کہ ہر ایک بات ہر ایک کو بتائی جائے۔ اپنی خوشیاں، کامیابیاں انہی کے ساتھ بانٹنی چاہئیں جو ہم سے سچ مچ محبت کرتے ہوں، اور جو ہمارے دل سے خیر خواہ ہوں۔ ورنہ یہ دنیا اور اس میں رہنے والے لوگ خوب صورت چیزوں، انسانوں اور مخلص جذبوں تک کو تباہ کر دیتے ہیں۔'' سلمان نے مسکرا کر بولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ نحل نے استحقاق بھری، محبت کی نگاہ اپنے شریکِ سفر پر ڈالی اور پھر اپنی نشست کی پشت پر ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے دل و دماغ سے تمام تر اندھیرا چھٹ چکا تھا۔

(ختم شد)

ناولٹ

دوسرا اور آخری حصہ

کوئی راستے میں جدا نہ ہو

نصرت انصاری

''سماویہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''اس کی فرسٹ ایئر کی کلاسز اسٹارٹ ہوچکی تھیں۔ وہ دلجمعی سے پڑھ رہی تھی۔ اس نے زارون سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ زارون کے فورتھ ائیر کے ایگزامز قریب تھے۔ وہ اپنی تیاری میں لگا تھا۔ وہ کالج سے آکر کھانا کھانے کے بعد لان میں آئی تھی۔ زارون سے اس کی ملاقات بہت دنوں بعد ہو رہی تھی۔ زارون اس کے ہم قدم تھا۔

''زارون کیا بات ہے......؟'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اور آنکھوں میں سوچ کے گہرے رنگ تھے۔ سماویہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تم عمر بھائی سے زیادہ فرینک نہ ہوا کرو......'' زارون نے نپے تلے لہجے میں مناسب الفاظ کا انتخاب کیا۔

''واٹ......!'' وہ بھونچکا رہ گئی۔ اسے زارون سے اس کی بات توقع نہیں تھی۔

''سماویہ وہ تمہیں ''یار'' کہہ کر بلاتے ہیں تو مجھے بہت برا لگتا ہے......'' زارون کے لہجے میں بیک وقت شدت پسندی اور ناراضی ابھری تھی۔

''یہ ان کا بات کرنے کا اسٹائل ہے، وہ ہر ایک سے یونہی بات کرتے ہیں......'' عمر بھائی کا فرینک انداز اسے پسند تھا۔ لیکن زارون معترض تھا۔ اسے سماویہ کے ساتھ عمر کا فرینک ہونا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

''ہوتا ہوگا...... مجھے مگر مجھے پسند نہیں ہے۔''

عجب استحقاق بھرا روٹھا روٹھا سا انداز تھا، سماویہ کو اس کے روٹھنے پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ وہ اس سے اتنی شدت

سے محبت کرتا تھا کہ اسے کسی کا بھی اس کے ساتھ فری ہونا پسند نہیں تھا۔ وہ چاہے جانے کے احساس سے سرشار اسے نرمی سے مسکراتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''اوکے...... ریلیکس اور کوئی حکم میرے لیے......'' وہ اندازِ دلبرائی سے اس کی آنکھوں میں جھانکی۔ اس کا قد زارون کے کندھوں سے بھی نیچے تھا۔ وہ اس کے قریب کھڑی بالکل بچی لگ رہی تھی۔

''تھینک یو سماویہ......'' اس نے محبت سے سماویہ کے ماتھے پر آئی بالوں کی لٹ کھینچی تھی۔ سماویہ نے ہمیشہ اس کا مان بڑھایا تھا۔ اسے عمر بھائی کا اندازِ گفتگو نہیں بھایا تھا اور سماویہ نے بہ آسانی اس کی بات مان لی تھی۔ وہ خوشدلی سے مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

زارون اور طلحہ کے ایگزامز اسٹارٹ ہوگئے تھے وہ دونوں کمبائن اسٹڈی میں محو تھے۔ طلحہ کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر پایا جاتا۔ دونوں کی منزل قریب تھی۔ دونوں کو پڑھنے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

''لوگوں کو آج کل بکس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔'' طلحہ بکس اٹھائے زارون کی طرف جارہا تھا کہ راستے میں رائحہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ رائحہ نے خود کو نظر انداز کرکے تیزی سے قریب سے گزرتے بیگانہ بنے طلحہ پر چوٹ کی تھی۔

''جی نہیں...... لوگوں کو سب کچھ دکھائی دیتا ہے اور اپنی چیزیں تو دور سے ہی دکھائی دے جاتی ہیں۔'' طلحہ کو وہ پورچ سے آتی دکھائی دے گئی تھی مگر وہ اگلے روز کے پیپر کی تیاری کے لیے عجلت میں تھا سو اسے نظر انداز کرکے آگے بڑھ گیا۔ رائحہ نے چوٹ کی تو طلحہ نے پلٹ کر انگلی سے پورچ کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارے پیپرز کیسے ہو رہے ہیں؟'' رائحہ نے ''اپنی چیزیں'' کہتے اور شوخ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے آہستگی سے نظریں جھکا کر پوچھا تھا۔ طلحہ کی شوخ جذبے لٹاتی نگاہیں ہمیشہ اس کی بولتی یونہی بند کردیا کرتی تھیں۔

''تمہاری دعاؤں سے بہترین......'' وہ ہنوز معنی خیز شوخ لہجے میں بولا تھا۔

''میں سمجھی تمہیں کوئی اور بھا گئی ہے......'' رائحہ نے اعتماد بحال کرتے ہوئے اس کے بدستور شوخی سے گھورنے پر اس کے کندھے پر دھپ لگائی تھی۔

''ہائے ظالم تم تو مجھے پیا کرو گی......'' طلحہ نے مصنوعی تکلیف سے کراہتے ہوئے دہائی دی تھی۔

''ہاں پیا کروں گی، تمہارا کیا بھروسا کل کو کوئی ڈاکٹرنی لے آؤ......'' رائحہ کو زاردن کی منطق یاد آئی تو اس نے شوخی سے اسے چھیڑا تھا۔

''اے لڑکی ہم راہ بدلنے والوں میں سے نہیں ہیں بھلے نصیب پھوٹ جائیں......'' طلحہ نے شوخی سے اسے چھیڑا۔

''جاؤ پھر کوئی اپنے جیسی لے آؤ......'' وہ باقاعدہ خفا ہو کر جانے لگی۔

''کیا ظلم کر رہی ہو مجھ پر...... مجھے ڈاکٹرنی نہیں چاہیے......'' وہ ساری شوخی بھلا کر تڑپ کر اس کی راہ میں حائل ہوا تھا۔ وہ اس کی خفگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اس کی راہ میں حائل اس کی نظرِ التفات کا منتظر تھا۔ رائحہ کا حسین چہرہ دمک اٹھا۔ گالوں پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ وہ جھینپی سی مسکرا دی۔ طلحہ مبہوت سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ تیزی سے پہلو سے نکل گئی۔

☆☆☆

آسمان پر بدلیاں تیر رہی تھی۔ خوشگوار ہوا میں نمی بسی تھی۔ غالباً بارش ہونے کو تھی۔ زاردن اور طلحہ کے ایگزامز ختم ہو گئے تھے۔ فائنل ایئر کی کلاسز اگلے ہفتے سے سٹارٹ ہونا تھیں۔ زاردن گھر پر تھا۔ خوشگوار موسم نے ان کے رومینٹک موڈ کو جگا دیا۔ اس نے ساویہ کو فون کر کے لان میں بلوالیا تھا۔ دونوں لان میں واک کرنے لگے کہ بوندا باندی اسٹارٹ ہو گئی۔

''مجھے بارش بہت پسند ہے زاردن......'' ساویہ نے دونوں ہتھیلیاں پھیلا کر بوندیں سمیٹنا چاہی تھیں۔ زاردن کی والہانہ نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ جانے کب اور کیسے اسے ساویہ سے محبت ہوئی تھی اسے بھی خبر نہ ہوئی۔ اسے ساویہ کا چہکنا، گھنٹوں بلا تکان بولنا، اونچے قہقہے لگانا بے حد بھاتا تھا۔ دل پہروں اسے سننا چاہتا تھا۔ زاردن نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے اپنی مضبوط ہتھیلیاں بھی پھیلا دیں۔ بوندیں ہتھیلی سے پھسل کر نیچے گرنے لگیں۔ اسے ساویہ کا کھیل دلچسپ لگا تھا۔

''زاردن آئی لو یو......'' وہ بے خودی سے دونوں بازو سینے پر باندھے ساویہ پر نظریں گاڑے ہوئے تھا کہ ساویہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''آئی نو......'' وہ گمبھیر نرم لہجے میں بولا تھا۔

''زاردن مجھ سے وعدہ کرو...... تم مجھے کبھی نہیں چھوڑو گے......'' دونوں کی محبت عہد و پیمان کی قید سے آزاد تھی اِک ان کہا معاہدہ دونوں میں تھا جو دونوں سمجھتے تھے۔ ساویہ نے اس سے تجدیدِ وفا چاہی تھی۔

''ساویہ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں......؟'' زاردن نے قدرے برا مان کر پوچھا۔ اسے ساویہ کا تجدیدِ وفا چاہنا اپنی محبت کی توہین لگا تھا۔

''زاردن مجھے خود سے بڑھ کر تم پر اعتبار ہے۔'' ساویہ نے اس کے سینے پر بندھے بازوؤں پر ہاتھ رکھا تھا۔ دل تجدیدِ وفا پر مصر تھا۔

''ساویہ تم میری رگوں میں خون کی طرح بسی ہو......'' وہ جذب سے بولا تھا۔ ساویہ کا روم، روم جھوم اٹھا تھا۔ وہ برستی بارش میں زاردن کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ بارش کی تیز بوندوں نے دونوں کو بھگو دیا تھا۔ بارش میں تیزی آ گئی۔ زاردن نے اپنی مضبوط ہتھیلی اس کے سامنے سوالی کی طرح پھیلا دی۔ ساویہ نے جھٹ اس کا مضبوط ہاتھ تھام لیا۔ وہ تیزی سے کاریڈور کی طرف لپکے تھے۔ تیز بوچھار نے دونوں کا پیچھا کیا تھا۔ ساویہ کا دل مطمئن تھا کہ زاردن صرف اسی کا ہے۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی......'' کلاسز کا آغاز ہو چکا تھا۔ طلحہ کو بخار تھا۔ سو اسے تنہا آنا پڑا۔ وہ بکس تھامے تیز قدموں سے کلاس روم کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کی پشت پر دلکش نسوانی آواز ابھری تھی۔ وہ چونک کر پلٹا۔ مخاطب اسے ہی کیا گیا تھا۔

''جی فرمائیں......'' اس نے سرتاپا نووارد کا جائزہ لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔ وہ بے حد دلکش تھی۔ دودھیا رنگت میں گلابیاں گھلی تھیں۔ پلکوں کے نیچے سنہرا پن نمایاں تھا۔

''جی فرمائیں......'' دوسری سمت خاموشی تھی سر لغاری کا پیریڈ اسٹارٹ ہونے والا تھا۔ اس نے کوفت سے نرم لہجے میں دوبارہ استفسار کیا تھا نووارد اسے تکنے میں محو تھی۔

''سر لغاری کی کلاس کدھر ہے......؟'' زونیہ حیدر نے اپنی بے اختیاری پر قابو پا کر پوچھا تھا۔ یونانی دیوتاؤں سا ہینڈسم زاردن خلیل آنکھوں کے رستے سیدھا دل میں سما گیا تھا۔

زاردن نے دلچسپی سے اس اجنبی لڑکی کو دیکھا۔

''آپ......؟'' زاردن نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

''میں زونیہ حیدر علی نقوی میڈیکل فائنل کی اسٹوڈنٹ ہوں، مائیگریٹ ہو کر آئی ہوں......'' زونیہ نے اپنا تفصیلی تعارف کرایا تھا۔

''ہائے میں زاردن خلیل ہوں...... اور سر لغاری کی کلاس لینے ہی جا رہا ہوں...... آیئے میرے ساتھ......'' زاردن نے رسماً تعارف کرواتے ہوئے کلاس روم کی طرف قدم بڑھا دیے۔ زونیہ بے خودی میں اس کے قدموں کے نشان پر چلنے لگی تھی۔

☆☆☆

''تمہارے ہیرو نے تمہیں ناول پڑھتے دیکھ لیا ناں...... تو تمہیں جان سے مار دے گا......'' ساویہ کا فرسٹ پراف مکمل ہو گیا تھا اس کے پیپرز اچھے ہوئے تھے۔ اور اسے بہتر رزلٹ کی امید تھی۔ وہ گاہے بہ گاہے زاردن یا طلحہ سے ہیلپ لے لیتی تھی۔ نئی کلاسز کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ اس روز دو پیریڈ ہوئے تھے۔

اس نے کلاس فیلو کے ہاتھ میں ناول دیکھا تو گھر لے آئی تھی۔ اس نے اس ناول کی بے حد تعریفیں سن رکھی تھیں۔ ساویہ بیڈ پر اوندھی لیٹی کہنیوں کے بل ناول کے مطالعے میں غرق تھی کہ رائحہ اسے ڈھونڈتی ہوئی آ گئی تھی۔ برسوں پہلے بابا نے دادا جان کا ساتھ دیتے ہوئے سب بہن، بھائیوں کو بیاہا تو بھائیوں میں الگ ہونے کا غلغلہ مچ گیا۔ سراج نے والد کے مشورے سے پھپھو کے پڑوس میں گھر لے لیا تھا۔ رائحہ کا گھر میں دل نہ لگتا تو اِدھر رخ کرتی۔

''تمہارا اپنے گھر میں دل نہیں لگتا ہے......'' ساویہ مسکراتے ہوئے سیدھی ہوئی تھی۔

''میرا دل تو اِدھر ہے پھر گھر میں کیسے لگے......'' رائحہ نے رومینٹک موڈ میں بآوازِ بلند دہائی دی۔

''اوہو...... ابھی بتاتی ہوں بھیا کو......'' اب ستانے کی باری ساویہ کی تھی اس نے فوراً بدلہ لیا تھا۔

''یہی تو ساری پرابلم ہے یار...... وہ ڈفر خود کچھ نہیں سمجھتا ہے۔ اسے سمجھانا پڑتا ہے......'' رائحہ نے شوخی سے بائیں آنکھ دبا کر لب دانتوں تلے دبایا تھا۔

''ہائیں، ہائیں...... تم میرے بھائی کو ڈفر کہہ رہی ہو......'' ساویہ خفگی سے اس پر چڑھ دوڑی تھی۔ رائحہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

''وہ ڈفر ہی نہیں، گدھا بھی ہے۔'' رائحہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آئی۔ ساویہ اسے مارنے کو بڑھی تو رائحہ تیزی سے پیچھے ہوئی اور پیچھے وہ کسی کے سینے سے جا ٹکرائی تھی۔

''آوچ......'' وہ فوراً پلٹی تھی اور اگلے پل اس کی سانس جہاں کی تہاں رہ گئی۔

''میں ڈفر اور گدھا ہوں......'' طلحہ ساری گفتگو سن چکا تھا۔ اس نے رائحہ کے ہوائیاں اڑے چہرے کو محظوظ نظروں سے دیکھا۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔ طلحہ کا یہاں کیا کام...... وہ اس وقت زاردن کے ساتھ اسٹڈی کر رہا ہوتا تھا۔ رائحہ خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔

''میں آپ کو نہیں کہہ رہی تھی......'' وہ چند ثانیے

بعد اپنی خفت پر قابو پا کر بولی تھی۔ لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ جواب کے منتظر طلحہ کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''کوئی نہیں بھائی یہ تو......'' سماویہ اس کی شکایت جڑنے کو آگے بڑھی تو رائحہ نے اسے اشارتاً روک دیا۔ چہرے پر زمانے بھر کی مسکینیت طاری تھی۔ سماویہ کو اس پر ترس آ گیا تھا۔

''بولو... رک کیوں گئیں......'' طلحہ کو ہمیشہ رائحہ کو ستانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ اس وقت بری طرح پھنسی تھی۔ سو وہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ وہ بہن سے مخاطب تھا۔

''بھائی ہم ظلہ بھائی کی بات کر رہے تھے۔'' سماویہ نے بروقت بہانہ گھڑا تھا۔ رائحہ اس کی ذہانت کو دل میں سراہتی ہوئی زور و شور سے سر دھنے لگی۔ مگر ایسے کہ ظاہر نہ ہو۔

''رئیلی......'' وہ لمحہ بھر کو مشکوک ہوا تھا۔

''آف کورس بھیا......'' سماویہ نے اعتماد سے جھوٹ بولا تھا۔ طلحہ کو اس کے اعتماد پر اعتبار آ گیا۔

''یہ ناول کون پڑھ رہا تھا؟'' دفعتاً طلحہ کی نظر ناول پر پڑ گئی تھی۔ وہ لڑکیوں کے ناول، رسالے وغیرہ پڑھنے کے خلاف نہیں تھا بس اسے پڑھائی ڈسٹرب ہونے پر اعتراض تھا۔

''بھیا، بھیا پلیز......'' اس کا تائم اصل میں اسٹڈی کا ہی تھا۔ پر وہ تو رائحہ کی آواز سن کر کھنچا چلا آیا تھا۔ وہ ناول ساتھ میں لیے پلٹا تو سماویہ تیر کے مانند اس کے پیچھے لپکی تھی اگر زارون کو خبر ہو جاتی کہ وہ ناول پڑھ رہی تھی تو وہ ضرور خفا ہوتا۔ دلِ ناداں اس کی خفگی کے تصور سے ہی ہراساں ہو گیا تھا۔ طلحہ رک گیا تھا۔

''یہ میرا ناول ہے آپ کہاں لے کر جا رہے ہیں؟'' رائحہ نے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے فوراً اسے امدادی کمک پہنچائی۔ اس نے اعتماد سے طلحہ کے ہاتھ سے ناول چھین لیا تھا۔

''آپ کو پڑھنا ہو تو ہمارے گھر آ کر پڑھ لیں، دو قدم پر ہی تو گھر ہے کبھی جو پھپھو سے ملنے کی توفیق ہوئی ہو......'' صالحہ کو بھتیجوں سے یہی گلہ تھا کہ وہ ان کے ہاں کم ہی آتے تھے۔ رائحہ نے ناول لے کر سماویہ کو تھما دیا۔ وہ اسے تشکر بھری نظروں سے دیکھتی اسے الماری میں چھپانے کو لپکی تھی۔

''پھپھو کی بیٹی سے تو روز ملاقات ہو ہی جاتی ہے پھر مجھے آنے کی کیا ضرورت ہے۔'' طلحہ جھک کر اس کے کانوں میں سرگوشی کرتا یہ جا وہ جا...... رائحہ کے لبوں پر شرمگیں ہنسی بکھر گئی تھی۔

☆☆☆

''علی بیٹا...... تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔''

علی چاہ کر بھی سماویہ کو نہیں بھول پایا تھا۔ وہ اسے پہلی نظر میں ہی بھا گئی تھی۔ اس نے عمر بھیا کی شادی کے بعد اسے نہیں دیکھا تھا مگر وہ اسے بھولنے میں یکسر ناکام تھا۔ وہ ایم بی اے فائنل ایئر میں تھا۔ نعیمہ اس کی تعلیم مکمل ہونے کی منتظر تھیں، وہ اکلوتے بیٹے کے سر پر...... جلد از جلد سہرا سجانے کی متمنی تھیں۔ وہ بیٹے کی ویران صورت سے بارہا فکرمند ہو کر اس کی پریشانی کا سبب جاننے کی کوشش کر چکی تھیں مگر علی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ انہیں بتاتا بھی تو کیا...... مما کے خیال میں فاروق تایا نے ان کے ساتھ بہت برا کیا تھا۔ وہ جیٹھ سے سخت خفا تھیں۔ جنہوں نے اپنی اکلوتی بھتیجی چھوڑ کر دوست کی بھتیجی کو بہو بنایا تھا۔

راحت اور فاروق پاکستان میں اپنی اکلوتی اولاد کی شادی کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ رشتہ خاندان کے بجائے باہر کیا جائے تاکہ خاندان میں کسی کو کوئی گلہ نہ ہو...... عمر پر سارے خاندان کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ خصوصاً نعیمہ نے تو اشارتاً رشتہ بھی ڈال دیا تھا۔ حائقہ کو عمر بے حد پسند تھا۔ مگر فاروق نے کسی کو ناراض کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بہن اور سالے بھی امیدواروں کی لسٹ میں تھے۔ وہ کسی ایک سے رشتہ جوڑ کر دوسرے کو خفا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سو ان کی نظرِ انتخاب ہادیہ پر ٹھہری تھی۔ حائقہ اور مما نے تو شادی کا ہی بائیکاٹ کر دیا تھا۔ تایا جان مہندی کے روز خود آ کر انہیں منا کر لے گئے تھے۔ لیکن حائقہ آپی پھر بھی نہیں گئی تھیں۔

وہ مما کی فطرت سے واقف تھا وہ ہرگز اس خاندان سے اکلوتے بیٹے کا رشتہ نہ جوڑتیں جس خاندان نے ان کی اکلوتی و لاڈلی بیٹی کی خوشیاں چھینی تھیں۔ سو وہ دردِ دل سینے میں چھپائے جیے جا رہا تھا۔ نعیمہ نے تفکر سے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''آپ کا وہم ہے مما......''

گھر میں دراصل پہلے ہی حائقہ آپی کی وجہ سے ٹینشن پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے کئی رشتے آئے تھے جنہیں انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ مما اور پاپا ان کی جلد شادی کے خواہاں تھے اور وہ مان کر ہی نہیں دے رہی تھیں۔ علی نے اس وقت انہیں ٹالنا چاہا۔

''میری اولاد نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔ اُدھر حائقہ نے موئے عمر کا روگ پال رکھا ہے اِدھر تم نے کسی فکر کو سینے میں دبایا ہوا ہے۔ وہ ماں سے کچھ کہتی ہے اور نہ ہی تم......'' نعیمہ تو دونوں سے عاجز آئی ہوئی تھیں، وہ علی کے ٹالنے پر غصے بھری خفگی سے پھٹ ہی پڑیں۔

☆☆☆

''زارون مجھے اسٹڈی میں بہت دقت ہو رہی ہے۔'' زوبیہ کو اس سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ دبو یا کم گو لڑکی نہیں تھی۔ وہ دھڑلے سے جب چاہتی، زارون کو گھیر کر باتیں کرنے لگتی اور اسے ایسا کرنے کے لیے کوئی بہانہ بھی نہیں بنانا پڑتا تھا۔ اسے واقعی اسٹڈی میں دقت ہو رہی تھی اور وہ زارون سے پڑھنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

''آپ لبنیٰ اکرام یا سعد ریاض سے ہیلپ لے لیں......'' اس نے کلاس کے ٹاپرز کے نام لیے...... وہ عام اسٹوڈنٹ تھا نہ بہت زیادہ ذہین و فطین اور نہ ہی اس کا اکیڈمک ریکارڈ بہت اعلیٰ تھا۔ اسے زوبیہ کا خود سے بلاوجہ فری ہونا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس نے صاف انکار کر کے آگے قدم بڑھا دیے۔

''مجھے آپ سے پڑھنا ہے زارون خلیل......''

زوبیہ آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہ تھی، وہ اس کی راہ روک کر اعتماد سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گویا ہوئی تھی۔ وہ اس کی جرات پر ششدر رہ گیا تھا۔ اس نے یہ حق صرف سماویہ کو دیا تھا کہ وہ یوں دھڑلے سے اس پر رعب جھاڑے۔ وہ کون ہوتی تھی کہ اس پر یوں رعب جماتی۔

''دیکھیے مس......'' زارون نے خود پر ضبط کرتے ہوئے تحمل سے ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کرنا چاہی تو شدتِ اشتعال سے وہ توقف پر مجبور ہو گیا۔

''مس زوبیہ حیدر نقوی......'' اس کے اعتماد میں ذرا لرزش نہ آئی تھی۔ وہ بدستور اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ ان کے فائنل ایگزامز میں ابھی وقت تھا۔ وہ صرف زارون کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔

''جی مس زوبیہ حیدر نقوی...... میں آپ کو......'' زارون اس کے حد درجہ اعتماد سے متاثر ہو کر نرمی سے گویا ہوا تھا۔

''کل سے پڑھا رہے ہیں......'' زوبیہ نے اس کی بات کاٹ کر بات مکمل کی تھی۔

''کل لائبریری میں ملیں گے زارون خلیل......'' وہ پُر رعب تحکم بھرے لہجے میں بولتی فضا میں بائے، بائے کی انگلیاں لہرا کر چلی گئی۔ وہ دم بخود رہ گیا اور جلا بھنا خفگی سے اسے گھورنے لگا تھا۔

☆☆☆

''حائقہ آپی آپ عمر بھیا کو بھول جائیں......''

حائقہ کے لیے اس کا ہم پلہ رشتہ آیا تھا۔ والدین کا شادی کے لیے بڑھتا دباؤ کم کرنے کے لیے اس نے ایم فل میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ مما اور پاپا اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔ اب علی اسے سمجھانے چلا آیا تھا۔ وہ بظاہر بکس کھولے غائب دماغی سے غیر مرئی نکتہ تک رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے ٹک گیا۔

''مجھے ایم فل مکمل کرنا ہے علی......'' اس نے مما اور پاپا سے، بارہا کا گھڑا ہوا بہانہ دُہرایا۔ وہ اس کے آنے کا مقصد سمجھ گئی تھی۔

''سعد بھیا آپ کی ہائر ایجوکیشن میں حائل نہیں ہوں گے۔'' علی ٹلنے کے موڈ میں نہ تھا۔ اس نے سنجیدگی سے بہن کو سمجھایا تھا۔

''یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں، شادی کے بعد لڑکی کی مرضی نہیں چلتی ہے۔'' مما اور پاپا بالا ہی بالا ساری چھان بین کر چکے تھے۔ وہ سعد سے دوبارہ مل چکا تھا۔ اسے وہ بے حد نائس لگے تھے۔

''آپی آپ عمر بھیا کو بھول جائیں۔ وہ آپ کا مقدر نہیں تھے۔'' علی نے زچ ہو کر بات دُہرائی تھی۔ وہ ضبطِ گریہ سے سرخ پڑتی آنکھیں میچ کر رہ گئی۔

''آپی...... مما ان دونوں کے لیے پریشان تھیں۔ وہ بے بس تھا مگر آپی تو بے بس نہیں تھیں۔ ان کے لیے رشتے آرہے تھے۔ علی نے بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''علی کیا تم اسے بھول سکتے ہو......؟'' حائقہ نے آنکھیں کھول کر متانت سے ٹھہرے لہجے میں الٹا سوال داغ دیا تھا۔

''کسے آپی......؟'' وہ نظریں چرا گیا۔

''تم زیادہ مت بنو علی......'' وہ خود پھنس گیا تھا۔ اس نے کرب سے اپنے لب بھینچ لیے...... حائقہ کی جانچتی نظریں اسی پر جمی تھیں۔

''علی مجھے اس لڑکی کے متعلق کچھ معلوم نہیں...... لیکن تمہارے چہرے پر لکھی داستانِ محبت پڑھ سکتی ہوں......'' حائقہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کو چپ رہ گیا تھا۔

''آپی میں یہاں سعد کے متعلق بات کرنے آیا ہوں......'' علی نے موضوع بدل دیا تھا۔ مما اور پاپا نے اس بار اسے حائقہ سے بات کرنے کو کہا تھا۔

''علی مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن......'' حائقہ نے پاپا کو رات بھر جاگتے اور مما کو لاؤنج میں نمازِ تہجد میں زار و قطار روتے دیکھا تھا۔ وہ ہار گئی تھی اس نے نیم رضامندی ظاہر کی۔ علی خوشی سے پاگل ہونے کو تھا کہ اس کے ادھورے مطالبے نے اس کے چہرے کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔

''لیکن کیا آپی......؟'' وہ الجھ کر بہن سے پوچھنے لگا۔ نہ جانے وہ دل میں کیا ٹھانے ہوئے تھی۔

''شادی جلد از جلد ہو گی۔'' وہ من موجی لڑکی تھی اس نے والدین کو بہت پریشان کیا تھا اور وہ اپنے لیے انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے نرمی سے مسکرا کر بات مکمل کی۔ علی مارے خوشی کے بہن سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

''ہائے ڈیئر......'' وہ جتنا حیران ہوتا اتنا کم تھا۔ وہ لائبریری میں محو اسٹڈی تھا۔ زونیہ نے اس کے ساتھ ہی نشست سنبھالی۔ وہ اس کی جرأت کو کوستا اسے ناگواری سے گھورنے لگا۔ وہ چکنا گھڑا تھی۔ اس پر زارون کی خفگی کا رتی بھر اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور ہنستی رہی۔

''آپ کا پرابلم کیا ہے مس......؟'' زارون نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر سلگتے لہجے میں لفظ، لفظ چبا کر پوچھا۔

''میرا پرابلم تم ہو زارون...... تم نے میرا سکون برباد کر دیا ہے۔'' وہ اس کے چہرے کا اِک، اِک نقش دل پر اتارتی صرف سوچ کر رہ گئی تھی۔

''اگر آپ کے پاس ٹائم نہیں ہے تو آپ مجھے کبھی کبھار ہیلپ دے دیں......'' وہ غصے میں تھا زونیہ اسے ضد نہیں دلانا چاہتی تھی سو اس نے خود ضد چھوڑ دی تھی حالانکہ دل نے بہت دہائی دی تھی۔

''نو مس......'' زارون نے رتی بھر نرم پڑنے بغیر بے لچک لہجے میں دوٹوک انکار کیا تھا، نہ جانے وہ کس ڈھیٹ مٹی کی پیداوار تھی۔ وہ سرتاپا سلگ اٹھا تھا۔

''پلیز...... پلیز...... نہ'' اس نے چہرے پر زمانے بھر کی مظلومیت طاری کرتے ہوئے منت سے لفظ کھینچا تھا۔

''اچھا...... مگر کبھی کبھار......'' وہ جان گیا تھا کہ

زونیہ ٹلنے والوں میں سے نہ تھی۔ اسے ہارنا ہی تھا سو اس نے ہار مان لی تھی۔

''تھینکس اے لاٹ زارون...... یو آر سو سوئٹ......'' وہ بے پناہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ نی الحال اتنا بھی بہت تھا۔ وہ اپنی بکس اٹھا کر یہ جا وہ جا...... زارون سر جھٹک کر دوبارہ بک پر جھک گیا تھا۔

☆☆☆

''بی اماں کہاں ہیں سادیہ...... مجھے ان سے بات کرنی ہے۔'' اس کے سیکنڈ ائیر کے ایگزامز قریب آرہے تھے۔ تمام پروفیسرز اپنے لیکچرز جلدی، جلدی مکمل کروا رہے تھے۔ وہ میم فوزیہ کی کلاس اٹینڈ کر رہی تھی کہ اسے ہادیہ کی مس کال آئی۔ وہ اسکائپ پر آن لائن ہو کر موبائل نمبر پر مس کال دیتی تھی تاکہ گھر والے آن لائن ہو جائیں...... سادیہ کا لاسٹ لیکچر تھا اسے گھر پہنچتے، پہنچتے گھنٹا تو لگ جاتا تھا۔ ہادیہ نے دس منٹ بعد پھر مس کال دی اور ساتھ ہی میسج بھی کر دیا۔ وہ بے حد بے چین و بے قرار لگ رہی تھی۔ سادیہ فون بند کرنا بھول گئی تھی، ہادیہ نے تو اس کی ناک میں دم کر دیا تھا۔

''میں ابھی کالج میں ہوں...... ابھی ایک گھنٹا تو لگے گا نکلنے میں......'' اس نے میسج سینڈ کر کے موبائل آف کر دیا تھا۔

''بی اماں، ہادیہ کو آپ سے کوئی بات کرنی ہے۔'' اس نے گھر پہنچتے ہی کپڑے چینج کیے بنا اسکائپ پر آن لائن ہو کر بی اماں کو سامنے بٹھا دیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے بی اماں سے اسپیشل بات کرنے کے لیے کال کی ہو۔ سبھی کو تجسس ہو رہا تھا۔ صبا اور ندا بھی ساتھ بیٹھ گئیں، سادیہ کو سب سے زیادہ تجسس تھا وہ سب سے آگے تھی۔

''السلام علیکم بی اماں......'' عمر کا پُرمسرت چہرہ نمودار ہوا تھا۔ ہادیہ شرمگیں مسکراہٹ لیے خاموش تھی۔ راحت بیگم بھی ساتھ موجود تھیں وہ بے حد خوش تھیں۔ ادھر سب کو کھدبد ہونے لگی تھی۔

''وعلیکم السلام...... کیسے ہو بیٹا؟'' بی اماں کی مخصوص پُرشفقت آواز ابھری تھی۔

''بی اماں یہ دونوں تو چپ رہ کر آپ کو پریشان کرتے رہیں گے۔ میں آپ کو کال کرنے کی وجہ بتاتی ہوں......'' عمر اور ہادیہ نے فوراً پاکستان کال ملا تو لی تھی مگر وہ دونوں ہی گھبرا تے گئے تھے۔ بی اماں نے تو سارا گھر ساتھ بٹھا لیا تھا۔ وہ انہیں کیسے کچھ بتاتے۔ راحت بیگم نے دونوں کو مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے مسکرا کر بی اماں سے کہا جو تشویش زدہ نظروں سے پوتی کو دیکھ رہی تھیں۔

''جلدی کہو بیٹا...... میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' انہیں کچھ وہم ہونے لگا تھا۔ وسوسے صبا اور ندا کو بھی ہراساں کر رہے تھے۔

''بی اماں آپ پر دادی بننے والی ہیں......'' راحت بیگم نے جھٹ سے خوشخبری سنا دی۔ سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

''اللہ تیرا شکر ہے، میں ڈیڑھ سال سے یہ خوشخبری سننے کو ترس گئی تھی۔'' بی اماں کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں۔ ندا اور صبا نے راحت بیگم کو مبارک باد دی تھی۔ سادیہ بہن سے بات کرنے کو ترس رہی تھی اسے آخر میں موقع ملا۔

''بدتمیز مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتایا۔'' وہ بہن سے لڑنے کو تیار تھی۔ خالہ بننے کی خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''کلاس میں میسج کر کے میرا ناک میں دم کر دیا تم سیدھا کہتیں کہ سادیہ تم خالہ بننے والی ہو......'' اس نے خوشی سے کھلے چہرے سے کہا تو سبھی اس کے بچکانہ پن پر ہنس دیے۔ مبارک سلامت کا شور جاری تھا۔ فکر کے بادل چھٹ گئے تھے۔

☆☆☆

''زارون تم بہت لکی ہو...... تم پر نامور industrialist کی اکلوتی اولاد خاصی مہربان ہو چکی ہے۔'' زونیہ نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ اسے تنگ نہیں کرتی تھی اور گاہے بگاہے کوئی ٹاپک سمجھ لیتی۔

وہ ابھی ٹاپک سمجھ کر گئی تھی کہ اس کا کلاس فیلو عباس آ گیا۔ طلحہ بھی وہیں تھا۔
''کیا مطلب......؟'' زاروں نے نا سمجھی سے بھویں اچکائیں۔
''یار حیدر علی نقوی سے کون واقف نہیں...... ان کی پانچ تو ہیرو کریٹس تک ہے۔ ہم ہاؤس جاب اور جاب کے لیے خوار ہو رہے ہوں گے تم چاہو تو اپنا اسپتال کھول لو......'' عباس نے اسے چھیڑا تھا۔ کلاس میں زونیہ اور زاروں کا نام اب ہر کسی کی زبان پر تھا۔ طلحہ نے زاروں سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ زاروں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔
''اپنا اسپتال......؟'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔ باپ اور چچا نے اپنے محدود وسائل میں بچوں کو تمام تر آسائشات مہیا کی تھیں۔ گھر میں نوکر چاکر، آسائشات، گاڑی ہر چیز موجود تھی۔ سبھی مطمئن تھے زاروں بھی کبھار جیب خرچ پاکٹ منی کم ہونے کا ماں سے رونا روتا تھا اور وہ اسے ہنس کر یہ کہہ کر ٹال دیتیں کہ جب تم اپنی نوکری کرو گے تو تم ساری تنخواہ اپنے پاس رکھنا۔ زاروں کے ذہن پر انجانی سوچ دستک دے رہی تھی۔ وہ مادیت پرست تھا، اسے ہر ماہ پیسوں کے لیے ماں کے آگے ہاتھ پھیلانا بے حد کھلتا تھا۔ عباس اسے شرارت سے چھیڑ کر طلحہ سے محوِ گفتگو ہو چکا تھا۔ وہ تنہا سوچوں میں گم نئی نہج پر غور کر رہا تھا۔

☆☆☆

حائقہ کا بیاہ دھوم دھام سے انجام پایا تھا۔ سعد نے اپنے والدین کو حائقہ کی شرط پر کیسے منایا...... یہ الگ داستان ہے۔ حائقہ رفتہ رفتہ اپنی ازدواجی زندگی میں سیٹ ہو رہی تھی۔ کم گو اور اداس حائقہ کی جگہ شوخ اور خوش مزاج حائقہ لوٹ آئی تھی اور اس میں بلاشبہ سعد کی محبتوں کا کمال تھا۔ علی کے فائنل ایگزام قریب تھے۔ نعیمہ اس کی شادی جلد کرنے کی خواہاں تھیں۔ انہوں نے بیٹے کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔
''مما مجھے ابھی بخشیں پلیز......'' وہ ناشتے کی ٹیبل پر صبح سویرے اس ذکر پر بری طرح زچ ہوا تھا۔ اس نے ماں کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ''وہ بے بسی سے لب بھینچے بے حد مجبور لگ رہا تھا۔ مما بھی ''ڈائن'' کی بہن کے لیے نہ مانتیں۔ وہ اکثر ہادیہ کو ڈائن کہتی تھیں جو ان کی بیٹی کی خوشیاں نگل گئی تھی اور دل کسی اور کے لیے قطعاً راضی نہیں تھا۔
''علی تم مجھے تنگ کرنا کب چھوڑو گے۔'' نعیمہ بیٹے کی بدمزاجی سے چڑ کر روکھے لہجے میں شکوہ کناں تھیں۔
''مما مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے......'' وہ ماں کے آنسوؤں سے سہم ہوا تھا۔ وہ انہیں رلانا نہیں چاہتا تھا۔
''بیٹا ہمیں تمہاری پسند دل و جان سے قبول ہو گی......'' رفیق نے لب کشائی کی...... وہ ماں، بیٹے کے معاملے میں بولنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ خاموش بھی نہ رہ سکے۔
''پاپا جب وقت آئے گا میں آپ کو بتا دوں گا......'' وہ اس موضوع سے بچنا چاہتا تھا۔ اسے سادیہ کے متعلق فی الحال کوئی بات نہیں کرنا تھی۔ وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ گیا۔ نعیمہ اسے پکارتی رہ گئیں۔ انہوں نے پریشانی سے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ ان کی بھی بھوک ختم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''کیا تمہیں سمجھ آ گیا ہے؟'' زونیہ اس روز ایک ہفتے بعد آئی تھی اس نے ٹاپک تفصیل سے ڈسکس کرنے کے بعد سر اٹھایا تو وہ اس کے وجیہہ نقوش میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے بھی محسوس کیا تھا کہ زونیہ کلاس میں صرف اسی سے بات کرتی ہے اور اسی کے گرد ہی منڈلاتی ہے، زاروں نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تھی۔
''ہوں، ہاں......'' وہ بری طرح چونکی تھی۔
''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......''
زاوڑن نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ بہت بے خودی سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
''تھینکس گاڈ...... آپ کو میرا خیال تو آیا......''
زونیہ نے محبت بھری نرمی سے گلہ کیا تھا۔ زاروں، عباس کی بات کے پیرائے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اور اسی کے خیال سے اسے سوچ رہا تھا۔ اور اسے پہلی دفعہ ادراک ہوا کہ وہ غلط نہیں تھا۔ زونیہ اسے شدت سے چاہتی تھی۔
''زونیہ آپ سے ایک پرسنل سوال پوچھوں؟''
زونیہ کی خود کو تکتی والہانہ نگاہوں سے حوصلہ پا کر اس نے کہا تھا۔ وہ بے حد پریکٹیکل بندہ تھا۔ اس کی شدت پسند اور مادہ پرستی ہی تھی کہ وہ سادیہ کو بھی ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا تا کہ دونوں کی آمدنی سے زندگی آسان گزرے۔ وہ سادیہ سے بھلے محبت کرتا تھا لیکن وہ پریکٹیکل مائنڈ بھی تھا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے زونیہ کو مخاطب کیا تھا۔
''آپ بلا جھجک بات کریں زاروں خلیل......''
زونیہ نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔
''کیا آپ کو واقعی ہیلپ کی ضرورت تھی؟''
زاروں نے گہری نظر اس پر جماتے ہوئے آہستگی سے پوچھا تھا۔
''زاروں دراصل مجھے آپ سے پہلی ملاقات میں ہی محبت ہو گئی تھی۔'' زونیہ بے حد بولڈ لڑکی تھی اس نے اعتماد سے زاروں کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ چپکا رہ گیا تھا۔ اس کی قوتِ گویائی حسبِ توقع سلب ہو گئی تھی۔ وہ سوچوں میں گم اپنی ہی ذات پرت در پرت کھنگال رہا تھا۔ زونیہ اسے ڈسٹرب کیے بنا وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ بیڈ پر لیٹا یک ٹک چھت کو گھور رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلے جا رہا تھا۔ دل سادیہ کے لیے تڑپ، تڑپ کر...... بے حال تھا تو دماغ اسے زونیہ کی طرف مائل کر رہا تھا۔ اسے سادیہ سے شدید محبت تھی۔ وہ اس پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔
''تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے زاروں......؟''
سادیہ کا کچھ عرصے پہلے کا سوال اس کے ذہن میں گونجا تھا۔ عورت محبت کے معاملے میں بے حد وہمی ہوتی ہے۔

قابلِ فخر

مشہور و معروف ادیبہ، پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی و پرستار اور معروف فنکارہ بشریٰ انصاری کی بڑی بہن نیلم احمد بشیر صاحبہ کو حکومت پاکستان کی طرف سے ادب کے شعبے میں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا ہے۔ یہ بات یقیناً خود ان کے لیے اور ان کے قارئین کے لیے باعثِ افتخار ہے۔ نیلم احمد بشیر نے ہمیشہ ماہنامہ پاکیزہ کے لیے بہت اچھی تحریریں دیں اور پاکیزہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر پُرخلوص مبارک باد دی اور اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار بھی کیا۔ اراکینِ ادارہ اس موقع پر ان کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

اس کی چھٹی حس محبت میں محبوب کی ذرا سی بے رخی پر بھی جاگ جاتی ہے۔ وہ اس پل سادیہ کے سوال کا جواز نہیں سمجھ پایا تھا اسے اب سمجھ آئی تھی کہ عورت محبت میں اتنی وہمی کیوں ہوتی ہے۔ وہ کرب سے اٹھ بیٹھا تھا۔
''آئی لو یو زاروں......'' ذہن کی بازگشت سے سادیہ کا نرم لہجہ ٹکرایا تھا۔ اس نے پہلی بار اظہارِ محبت کیا تھا بلکہ ان دونوں میں اظہارِ محبت کی نوبت کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ وہ بے چینی سے ٹیرس پر آ کر ٹہلنے لگا۔ وہ ہرگز بے وفا نہیں تھا۔ دل سادیہ کے لیے دہائی دے رہا تھا۔ وہ بیچ راہ میں چھوڑ کر جانے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔ وہ

سماویہ کا ساتھ محبت کی آخری منزل تک نبھانا چاہتا تھا۔ دل درد سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ اضطراب پورے وجود میں بے قراری اور بے چینی پیدا کر رہا تھا۔ اس نے ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''زارون مجھے آپ سے پہلی ملاقات میں ہی محبت ہوگئی تھی۔'' اسے زونیہ کی بات یاد آئی۔

''محبت سے نہیں ضرورت سے......'' وہ جب سے باشعور ہوا تھا، اس نے مما کے آگے پیسوں کے لیے ہاتھ ہی پھیلایا تھا۔

''اگر زونیہ تمہارا مقدر بن جائے تو تم اپنا اسپتال بھی بنا سکتے ہو۔'' عباس کی آواز نے تابوت میں آخری کیل کا کام کیا تھا۔ اس نے عزم سے آنکھیں میچ لیں، محبت ہار گئی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے محکومیت پسند نہیں تھی۔

بعض فیصلے جتنی جلدی کر لیے جائیں انسان اتنا ہی مضبوط ہو جاتا ہے۔ وہ بھی فیصلے پر پہنچ کر مضبوط ہو گیا تھا۔ اس نے راستہ بدل لیا تھا۔

☆☆☆

''زونیہ، محبت قربانی مانگتی ہے۔'' وہ بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ وہ حتمی فیصلہ کر چکا تھا سو وہ عملی قدم اٹھانے سے پہلے زونیہ کو پرکھنا چاہتا تھا مبادا وہ رئیس باپ کی بیٹی وقتی جذبے کا شکار ہو۔ زونیہ نے راولپنڈی سے لاہور کالج خود مائیگریشن کروائی تھی۔ حیدر علی نقوی کے لیے یہ بڑی بات نہ تھی۔ انہوں نے لاہور میں بیٹی کو ہاسٹل کی رہائش کے بجائے بنگلا لے کر دیا تھا۔ گاڑی اور نوکر سب موجود تھے۔ اس روز زونیہ اسے اپنا گھر دکھانے لائی تھی۔ زارون کا منہ تحیر سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ گھر ''سہیل ولا'' سے دُگنا بڑا تھا اور وہ اتنے بڑے گھر میں تنہا رہ رہی تھی۔ ''سہیل ولا'' میں بھی گاڑیاں اور نوکر موجود تھے مگر پچیس تیس افراد کے لیے۔ وہ لاشعوری طور پر اپنی فیملی کا تقابل زونیہ سے کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی گھر کے اندر لا کر روکی تو وہ مسرت و حیرت کے ملے جلے تاثرات سے گھر پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔

''میں تمہارے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہوں......'' وہ بھی زارون کی طرح شدت پسند تھی۔ جب وہ فیصلہ کر لیتی تو نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر ڈٹ جاتی تھی۔ مما کبھی کبھار اس کی شدت پسندی پر خائف ہوتی تھیں، پاپا ہمیشہ اس کی طرف داری کرتے تھے۔ اس نے زارون کا ہاتھ پکڑا وہ کسی روبوٹ کی طرح اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

''زونیہ محبت خراج بھی وصولتی ہے۔'' وہ کسی ننھے بچے کے مانند من پسند چیزوں کو دیکھ کر للچا رہا تھا۔ جیسے کسی بچے کو اس کی پسندیدہ چیزیں نظر آ جائیں تو وہ سبھی کچھ پانے کی چاہ کرتا ہے۔ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگا تھا۔ اسے اپنی فیملی اس پل بہت کمتر لگی تھی۔ جب محبتوں کے پلڑے میں آسائشات بھاری ہونے لگیں تو محبتیں حقیر ہو جاتی ہیں...... اس پل اسے محبتیں یاد نہ رہی تھیں وہ پُرآسائش بنگلے کی دمک میں کھو چکا تھا۔

''زارون تم میری محبت کی توہین کر رہے ہو۔'' زونیہ برا مان گئی۔ وہ اس کی خاطر دنیا تک تیاگ دینے کو تیار تھی اور وہ اس کی محبتوں پر شک کر رہا تھا۔

''زونیہ بخدا ہرگز نہیں...... ایکچوئلی میری فیملی اتنی امیر نہیں ہے۔'' وہ اس کی خفگی سے یوں دہلا جیسے کسی بچے کو پسندیدہ کھلونا دے کر اس کے ہاتھ سے اچانک چھین لیا جائے اور وہ اس سے کھیل بھی نہ پایا ہو...... اس کی آنکھوں میں چمک کی جگہ ہراس پھیل گیا۔

''زارون میں اپنے پاپا اور مما کو منا لوں گی، تم اپنی فیملی کی بات کرو...... وہ انکار تو نہیں کریں گے۔'' زونیہ نے پُراعتماد لہجے میں کہتے ہوئے زارون کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ڈونٹ وری...... اٹس مائی ہیڈک......'' زارون کو پل بھر کو دھڑکا تھا وہ اس کی اور سماویہ کی محبت کی امین تھیں لیکن وہ زونیہ سے شادی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے ہر قیمت پر اپنا اسپتال چاہیے تھا...... اسے زونیہ کی محبت پر یقین تھا کہ وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹالے گی اور اس کے

رئیس باپ کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اسے چند ہزار کی نوکری کے لیے جوتیاں نہیں چٹخانا تھیں اور نہ ہی کوئی چھوٹا موٹا کلینک کھولنا تھا۔ اسے بڑا ذاتی اسپتال چاہیے تھا، وہ زندگی بھر آسائشات کے لیے ترسنا نہیں چاہتا تھا۔ زارون کے دل میں پل بھر کو کئی خدشات جاگے تھے۔ اس نے ہر خدشہ کچل کر اسے بھرپور تسلی دی تھی۔ وہ مسکرا کر اطمینان سے سارا گھر اسے دکھانے لگی۔

☆☆☆

''زارون، زارون۔'' سماویہ ایگزامز سے فارغ تھی اور تھرڈ ایئر کی کلاس کا آغاز اگلے ہفتے سے ہونا تھا۔ زارون کے ایگزامز جاری تھے۔ وہ اور طلحہ اسٹڈی میں محو تھے مگر وہ کبھی اتنا محو نہیں ہوا تھا کہ سماویہ سے دنوں ملاقات نہ ہو سکے۔ وہ باہر جا رہا تھا کہ سماویہ اسے دور سے پکارتی ہوئی آ گئی۔ وہ اسے کئی روز سے اگنور کر رہا تھا۔ اسے مجبوراً رکنا پڑا تھا۔

تیز چلنے سے سماویہ کی سانسیں ناہموار ہوگئی تھیں۔ وہ قریب آ کر رک کر اپنی سانس نارمل کرنے لگی۔ پھولی سانسوں سے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئی تھیں وہ فیروزی کلر کے پرنٹڈ سوٹ میں لمبے بالوں کی چٹیا بنائے بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس نے اپنا پسینہ صاف کر کے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ زارون کو وہ دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے دانستہ نظریں چرا لیں، اس کے مضبوط فیصلے میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ سو اسے نظرانداز کیے ہوئے تھا۔

''جناب جی اتنے پڑھاکو ہوگئے ہیں کہ ملنے کا ٹائم بھی نہیں ہے۔'' وہ سانس ہموار کرتی سماویہ کو نظرانداز کر کے آگے بڑھنے لگا تو اس نے زارون کا بازو تھام کر روکا۔ وہ ملنے کو تڑپ رہی تھی اور وہ نخرے دکھا رہا تھا۔ وہ جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹا تھا۔

''سماویہ پلیز تم تمیز سے رہو......'' زارون اسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتا انگارے چباتا ہوا بے حد برہم ہوا۔ وہ اپنی بے اختیاری پر خفیف تھی اس کی برہمی پر مزید شرمسار ہوگئی۔ دراصل زارون جس محبت کو تھپک، تھپک کر سلانے میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ اسے سماویہ نے سامنے ہوتے ہی جگا دیا تھا۔ وہ اسے اپنے منہ سے نکلے شعلے کی لپیٹ میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ نادم سی کھڑی اپنا قصور نا سمجھی سے کھوجتی رہ گئی۔

☆☆☆

''مما مجھے آپ سے بات کرنی ہے......'' وہ دروازے سے جھانکتا اندر داخل ہوا تھا۔ ندا ٹی وی دیکھنے میں محو تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر زارون کے حد درجہ سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔

''بولو......'' زارون کی حد درجہ سنجیدگی نے انہیں ٹی وی بند کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھیں۔

''مما مجھے اپنی کلاس فیلو سے شادی کرنی ہے......'' زارون نے انہیں زونیہ کے متعلق بتانے کے بعد فیصلہ سنایا تھا۔

''تم نے زونیہ کے لیے ہادیہ کو ٹھکرایا تھا؟'' اس نے ماں سے اپنی پسند (سماویہ) کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھی تھیں کہ زارون نے زونیہ کی خاطر انکار کیا ہے۔ زارون کو اس وقت جھوٹ بولنا آسان لگا تھا اس نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ اس نے مما کو نام نہیں بتایا تھا۔

''بیٹا رشتے داری ہم پلہ لوگوں میں اچھی لگتی ہے۔ وہ رئیس باپ کی بیٹی ہے، وہ ہم میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکے گی۔'' ندا نے اپنے تجربے کی روشنی میں اسے سمجھانا چاہا تھا۔ وہ زندگی برت چکی تھیں۔ زارون نا سمجھ تھا۔

''مما میں اس کے بنگلے میں شفٹ ہو جاؤں گا...... وہ لاہور میں ہی سیٹل ہو جائے گی۔'' گویا تمام فیصلے بالا ہی بالا طے کیے جا چکے تھے۔ صرف انہیں اطلاع دی جا رہی تھی۔

''کیا......؟'' وہ بھونچکا رہ گئیں۔

''یہ نہیں ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے غصے و خفگی سے صاف انکار کیا۔

''کیوں......؟'' زارون فیصلہ کر چکا تھا...... وہ

بدلحاظی سے فوراً بولا۔

''اول تو گھر میں رشتہ ہے اور دوئم تم گھر جوائی بنو گے.....؟'' ندا نے اس کی کم عقلی کو کوستے ہوئے ... بھرپور خفگی سے ترش لہجے میں کہا تھا۔

''اول تو مجھے گھر کا رشتہ منظور نہیں..... دوئم آج کل گھر جوائی بننا کوئی عیب نہیں ہے۔ ہر ایک کو اپنے اسٹینڈرڈ کے مطابق زندگی گزارنے کا پورا حق ہے.....'' زارون کے لہجے کی ٹون ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ بدتمیزی کی انتہا پر انہی کے لہجے کی نقل اتار رہا تھا۔

''زارون.....'' مان، بھروسا، اعتماد اور یقین ٹوٹ کر کرچی، کرچی ہوگئے تھے۔ ندا ششدر رہ گئی تھیں۔ مان کی ٹوٹی کرچیاں آنکھوں کو نم کرگئی تھیں۔ وہ چھوٹا اور بے حد لاڈلا تھا۔ وہ اس سے بدتمیزی کی توقع نہیں رکھتی تھیں، ان کے لبوں سے ہلکی سسکی نکلی تھی۔

''مما اٹس ٹو مچ..... مجھے آپ کے ڈرامائی آنسو نہیں دیکھنے ہیں۔ آپ اگلے ہفتے زونیہ کا ہاتھ مانگنے جارہی ہیں.....'' وہ بیگانگی اور کٹھور پن کی انتہا پر اپنا سنگدلانہ فیصلہ سنا کر چلا گیا تھا۔ زونیہ کے پاپا اگلے ہفتے لاہور اہم میٹنگ میں آرہے تھے اسے زونیہ نے ہی رشتہ لانے کو کہا تھا ندا حیران پریشان زارون کو کمرے سے نہیں اپنی زندگی سے بھی نکلتا محسوس کررہی تھیں۔ آنسو بھل، بھل گرنے لگے تھے۔

☆☆☆

فیصلہ تھا کہ دھماکا..... جس نے بھی سنا وہی انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ ساویہ کا دکھ سب سے سوا تھا، وہ بے یقینی کی انتہا پر بت کے مانند ساکت تھی' وہ تو زارون سے اپنی بے اختیاری کی معافی مانگنے کا سوچ رہی تھی۔ جبکہ وہ تو سارے رشتے توڑ چکا تھا۔ زارون نے گھر بھر کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ پاپا، مما، بی جان خالہ اور چچا۔ سبھی اسے سمجھا، سمجھا کر تھک گئے تھے اس کی ضد نہ ٹوٹی تھی۔ سبھی نے اپنے تجربات کی روشنی میں دونوں کے اسٹیٹس کے واضح فرق اور باہمی تفاوت سے اتار چڑھاؤ کے متعلق سمجھانے کی سعی کی تھی لیکن وہ اپنی کامیابی پر پُر یقین تھا اور اسے یہ اعتماد زونیہ کی بےلوث محبت نے دیا تھا۔ وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر اپنے اٹل فیصلے پر قائم تھا۔ اسے ساویہ کی بھی پروا نہیں تھی، خودغرضی کی انتہا تو یہ تھی کہ اس نے ایک بار بھی ساویہ کے متعلق نہیں سوچا تھا جسے وہ بیچ راہ میں چھوڑ کر جارہا تھا۔ وہ صرف اپنے متعلق سوچ رہا تھا۔ محبت ہار رہی تھی بلکہ محبت ہار گئی تھی۔

''تم نے کچھ سنا.....'' وہ لان میں اتری گرل سیڑھیوں کی ریلنگ سے سر لگائے آخری سیڑھی پر بیٹھی تھی کہ رائحہ سنتے ہی دوڑی چلی آئی۔ ساویہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اور رائحہ کا تو بالکل بھی نہیں..... وہ ان دونوں کی محبت کی رازدار تھی۔ وہ کسی کی نظروں میں اپنے لیے ترس نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے ترحم بھری نگاہوں سے خوف آتا تھا۔

''ہوں.....'' اسے نہ چاہتے ہوئے بھی رائحہ کا سامنا تو کرنا ہی تھا اسے مختصراً جواب دیا۔

''تم نے اس سے خود بات کی؟'' رائحہ اسے محبت سے دیکھتی ہوئی اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

''نہیں.....'' ذات میں سناٹے اتر آئے تھے اور وجود روح تک چھید کردینے والی خاموشی کا گڑھ بن گیا تھا۔ دلِ نادان درد کی آماجگاہ تھا۔ جسم و جان میں بے چینیاں سی تھیں۔ مگر وہ زارون کے پاس محبت کی بھیک مانگنے نہیں گئی۔

''کیوں ساویہ؟ وہ چلا جائے گا۔'' رائحہ اسی کی وکیل تھی اس کا بازو جھنجوڑتی اس کی سوئی محبت جگا رہی تھی۔ اسے اس کے دکھ پر ترس آنے لگا تھا۔ اور ساویہ کو اسی ترس سے تو نفرت تھی۔

''وہ جاچکا ہے رائحہ.....'' اس نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔ اس کی آواز کسی گہری کھائی سے ابھری تھی۔ رائحہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔

''وہ تو کب کا جاچکا تھا بس میں نے ہی دیر کردی۔'' اسے زارون کا گریز اچھی طرح یاد تھا۔ اس کا بازو چھونے پر شدید ردِعمل..... وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ کچھ بھلایا بھی کیسے جاسکتا تھا۔ کچھ درد انسان کے وجود کا حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے لہجے میں نمی پھیلی تھی گویا مضبوطی کا چڑھایا مصنوعی خول چٹخنے لگا تھا۔

''اسے روک لو..... ہوسکتا ہے کہ وہ رک جائے.....'' رائحہ کا بس نہیں چل رہا تھا..... ان دونوں کو ایک کردیتی۔

''محبت، عزت سے ملے تو محبت ورنہ وہ بھیک جیسی لگتی ہے اور مجھے بھیک سے نفرت ہے۔'' رائحہ کا ہاتھ ہنوز ساویہ کے کندھے پر تھا اس نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹایا اور وہاں سے اٹھ گئی۔ رائحہ افسردگی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

''زارون تم کبھی مطمئن نہیں رہ سکو گے۔'' گھر کا ماحول بے حد ٹینشن زدہ تھا۔ سبھی زارون سے سخت خفا تھے۔ پاپا اور بی اماں کے علاوہ وہ دونوں اس سے خفا بھی نہ تھے اور نہ ہی اس کے فیصلے سے خوش..... ایسے ٹینشن زدہ ماحول میں ہادیہ کی بیٹی کی پیدائش کی خبر نے مسرت کی لہر دوڑا دی تھی۔ زچہ، بچہ دونوں بخیریت تھے اور وہ لوگ چند ماہ بعد پاکستان آنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سب کچھ پری پلان تھا۔ رسم دنیاداری کے لیے خلیل اور ندا نے جاکر رشتہ مانگا اور اُدھر سے بھی رسماً بھی سوچنے کی مہلت مانگے بنا ہاں کردی گئی تھی اور اگلے ماہ شادی کی ڈیٹ بھی فکس کردی گئی تھی۔ حالانکہ دونوں کی پڑھائی ابھی چل رہی تھی۔

لائٹ پرپل اور آف وائٹ کلر کے کامبی نیشن میں ملبوس سامنے وہی تھی۔ وہ اسے تین سال بعد دیکھ رہا تھا۔ ملاقات غیر متوقع تھی۔ پہلی ملاقات عمر بھیا کی سالی کی حیثیت اور دوسری دولھا کی فرسٹ کزن کی حیثیت سے ہورہی تھی۔ اسے آذر (منجھلے ماموں کا بیٹا) نے اپنے کزن کی شادی پر بصد اصرار انوائٹ کیا تھا۔ آذر اس کا بیسٹ فرینڈ تھا۔ وہ آذر کی بات ٹال نہیں سکا تھا۔

وہ بے حد حسین لگ رہی تھی اتنی حسین کہ نظر صرف اسی کے چہرے پر ٹھہر جائے۔ اس کا حسن اداسی سے ماند پڑ رہا تھا۔ علی کی نگاہیں بار، بار اسی پر ٹھہر رہی تھیں۔ وہ کسی ہم عمر لڑکی کے ساتھ دائیں طرف ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ حیدر علی نقوی نے بارات کا انتظام ذاتی فارم ہاؤس پر رکھا تھا۔ جہاں کمس گیدرنگ تھی۔ لڑکے والوں کی طرف سے کم لوگ تھے جبکہ حیدر علی نقوی نے اپنے سرکل کے تمام دوست و احباب کو مدعو کررکھا تھا۔ امارت کی چکاچوند آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔

ساتھی لڑکی نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا' وہ آہستگی سے مسکرادی۔ آنکھوں کی اداسی لمحہ بھر کو معدوم ہوئی تھی۔ چہرے پر پھیلی ہلکی چمک نے حسن دو آتشہ بنادیا تھا۔ وہ ہلکی جیولری اور لائٹ میک اپ میں بے حد سج رہی تھی۔

''علی.....'' آذر اسے آکر ساتھ لے گیا۔ لاہور سے اسلام آباد تک کا سفر زیادہ لمبا نہ تھا۔ آرام دہ بسوں میں سفر آسان تھا۔ رخصتی کا شور مچا تھا۔ اسی لیے آذر اسے فوٹو شوٹ کے لیے بلانے آیا تھا۔ اسے جانا پڑا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی۔

وہ چند پکس کے بعد ہی بہانہ بنا کر لوٹ آیا مگر اب وہ وہاں نہ تھی۔ اس کا دل لمحہ بھر کے لیے اداس ہوگیا۔

''بس میں تو ساتھ ہوگی.....'' وہ اسے بس میں نہیں دیکھ پایا تھا اس کے ہمراہ سفر کرنے کے خوش کن احساس نے اسے شاد کردیا تھا۔ وہ اپنی خوش فہمی پر خود ہی اگلے پل ہنس دیا۔ اسے آذر نے آواز دی تو وہ اس کی طرف لپکا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ ساویہ پر پڑی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر موبائل سے اس کی پک کھینچ لی تھی۔

☆☆☆

ولیمہ اگلے ہی روز شہر کے مہنگے ترین ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ خلیل نے بیٹے کی خاطر اپنی نئی گاڑی بیچ دی تھی۔ زارون نے کسی کی پروا نہیں کی تھی۔ اسے اپنی خوشی کے سامنے کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ خودغرضی کی انتہا پر بیگانہ بنا ہوا تھا۔ زونیہ وداع ہوکر لاہور اپنے ہی بنگلے میں شفٹ ہوئی تھی۔ ولیمہ ہر لحاظ سے ان کے شایانِ شان کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حیدر علی نقوی

ناک بھوں چڑھائے تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ وہ صرف بیٹی کی ضد سے ہارے تھے۔ صد شکر کہ زارون گھر داماد بننے پر راضی تھا ورنہ وہ بیٹی کو کیسے چھوٹے گھر وداع کرتے۔ سہیل ولا ان کی نظر میں چھوٹا تھا۔

زونیہ نے ولیمے کے اپنے اور زارون کے لیے برانڈڈ ڈریس لیے تھے۔ دنیاداری نبھانا دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ جو ہر کوئی خوش اسلوبی سے نہیں کرسکتا۔ سو ساویہ بھی نہ کر پائی تھی۔ وہ بارات میں تو اسلام آباد چلی گئی تھی لیکن وہ ولیمے میں شریک نہ ہوئی۔ رائحہ نے بھی جانے سے انکار کردیا تھا۔

وہ افسردہ و دکھی تھی۔ کوئی بیچ راہ میں چھوڑ کر کیسے احساسِ تنہائی سے دوچار کرتا ہے۔ ساویہ یہی دکھ تو جھیل رہی تھی۔ رائحہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ اس کے دکھ کو اپنے دل پر اترتا محسوس کررہی تھی۔ وہ دونوں کی محبت کی گواہ تھی۔ زارون یوں راہ بدل لے گا اسے گمان تک نہیں تھا۔ اسے زارون کی بے وفائی کا یقین نہیں ہورہا تھا جبکہ ساویہ تو اس کی بے وفائی سہہ رہی تھی۔

☆☆☆

علی نے اسٹڈیز مکمل کرکے پاپا کا بزنس جوائن کر لیا تھا۔ تین سال مزید سرک گئے تھے۔ گھر والے اسے اس کے حال پر چھوڑ چکے تھے۔ نعیمہ نے تو بھرپور خفگی کے طور پر اس سے قطع کلامی کیے رکھی تھی مگر وہ مان کر نہیں دیا تھا۔ آخر انہوں نے اپنی ضد چھوڑ دی تھی۔

''علی کیا تمہیں ساویہ سے محبت ہے؟'' گزرے سالوں میں حائقہ آپی اور سعد بھیا کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ آپی نے انہیں قبول کرلیا تھا۔ زندگی خوشگوار گزر رہی تھی۔ قدرت نے انہیں دو بچوں سے بھی نوازا تھا۔ وہ آفس سے لوٹا تو مما اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر گلاس بھرنے لگا۔ پشت پر آپی کی آواز ابھری تھی۔ وہ دم بخود ساکت رہ گیا۔

''علی تمہاری بہن تمہاری خاطر ہر قربانی دے سکتی ہے۔ تم مجھے یہ مان دے کر تو دیکھتے۔'' اس نے اپنی زندگی کے پانچ قیمتی سال کسی کی جدائی میں تیاگ دیے تھے۔ مما تو اس کی دورانِ تعلیم ہی شادی کردیتیں۔ حائقہ نے افسوس سے کہتے ہوئے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ اتنی خودغرض ہرگز نہیں تھی کہ بھائی کی خوشیوں کو اپنی ضد کی نذر کردیتی۔

وہ تحیر سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا راز منکشف کیسے ہوا اس کی گرفت گلاس پر اتنی سخت تھی کہ ہاتھ کی پشت پر رگیں ابھر آئی تھیں۔

''ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر مجھے ہمیشہ دکھ رہے گا کہ تم نے مجھے اتنا مان نہیں دیا۔'' وہ میکے رہنے آئی تھیں۔ دونوں بچے دوپہر کو سوئے تو مما نے اسے علی کی وارڈروب کی صفائی کرنے کو کہا تھا علی نوکروں کو اپنی وارڈروب کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا۔ نعیمہ خود صفائی کرتی تھیں۔ بچوں کے ساتھ انہیں بھی نیند آنے لگی تھی۔ وہ سستی سے اسے ہدایت کرتی خود سو گئیں۔ حائقہ نے وارڈروب کی صفائی کرنے کے بعد لاکر کی صفائی کرنا چاہی جو کہ لاکڈ تھا۔ حائقہ کو اس کا پاسورڈ معلوم تھا۔ اس نے لاکر کھولا تو سامنے ہی ساویہ کی تصویر تھی غالباً وہ کسی شادی میں شریک تھی۔ حائقہ کو معاملے کی گہرائی سمجھنے میں کچھ لمحے لگے۔ وہ بے حد خوددار تھا اس نے مما کی عادت سے واقفیت کی بنا پر گھر میں کبھی ساویہ کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ اور تنہا درد دل سہہ رہا تھا۔ حائقہ خودغرض نہ تھی اس کا گلہ جائز تھا۔ وہ بہن سے بات کرتا تو سچویشن مختلف ہوتی۔

''آپی وہ...... میں......'' وہ ہکلا کر بہن سے نظریں چرا گیا تھا۔

''کیا وہ...... میں......'' حائقہ نے بڑے پن کا رعب ڈالتے ہوئے شدید خفگی سے اس کا کان پکڑ لیا تھا۔

''علی تم مجھ سے ایک بار کہہ کر تو دیکھتے......''

حائقہ کا قلق کم نہیں ہورہا تھا۔ علی پانی پینا بھول چکا تھا۔ حائقہ نے اس کی سنجیدہ صورت دیکھتے ہوئے اسے پانی بھر کر گلاس تھمایا۔ وہ گھونٹ، گھونٹ پانی پینے لگا تھا۔ حائقہ کی جانچتی نظریں اسی پر ٹکی تھیں۔

☆☆☆

میرے ساتھ تم بھی دعا کرو، یوں کسی کے حق میں برا نہ ہو
کہیں اور ہو نہ یہ حادثہ، کوئی راستے میں جدا نہ ہو
میرے گھر سے راستے کی بیچ تک، وہ اک آنسو کی لکیر ہے
ذرا بڑھ کے چاند سے پوچھنا، وہ اسی طرف سے گیا نہ ہو
سرِ شام ٹھہری ہوئی زمین، جہاں آسماں ہے جھکا ہوا
اسی موڑ پر مرے واسطے، وہ چراغ لے کر کھڑا نہ ہو
وہ فرشتے آپ تلاش کریں، کہانیوں کی کتابوں میں
جو برا کہیں، نہ برا سنیں، کوئی شخص ان سے خفا نہ ہو
وصال ہو کہ فراق ہو، تیری آگ مہکے گی ایک دن
وہ گلاب بن کر کھلے گا کیا، جو چراغ بن کے جلا نہ ہو
مجھے یوں لگا کہ خاموش خوشبو کے ہونٹ تتلی نے چھو لیے
انہی زرد پتوں کی اوٹ میں، کوئی پھول سویا ہوا نہ ہو
اسی احتیاط میں، میں رہا، اسی احتیاط میں وہ رہا
وہ کہاں، کہاں مرے ساتھ ہے، کسی اور کو یہ پتا نہ ہو

تین سال مزید سرک گئے تھے۔ وہ ہاؤس جاب سے فارغ ہوئی تو اسے رورل ایریا میں چھوٹی سطح پر قائم گورنمنٹ اسپتال میں جاب مل گئی۔ طلحہ اور طٰہٰ بھی برسرِ روزگار تھے اور صاحبِ اولاد بھی۔ طٰہٰ کی شادی آذر کی بہن سے ہوئی تھی۔

موسم خوشگوار تھا۔ وہ کِن مِن برستی بارش میں لان میں اترتی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ یادِ ماضی عذاب کی صورت جان پر اترا تھا۔ جانے کون لوگ ہوتے ہیں جو کسی سے بچھڑ کر بہ آسانی زندگی گزار لیتے ہیں وہ تو زارون سے بچھڑ کر ادھوری زندگی جی رہی تھی۔ وہ زندہ لاش بن گئی تھی۔ گھر میں سبھی نے یہ تبدیلی محسوس کی مگر اس نے بہ آسانی ہف اسٹڈی کا بہانہ بنا کر ٹال دیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی زارون کو نہیں بھلا سکی تھی۔ یاد کا جو پتھر جہاں تھا وہیں گرا رہ گیا تھا۔ وہ سینے پر دھری یادوں کی بھاری سل انچ بھر بھی نہ سرکا پائی تھی۔ زارون کی محبت اس کے لہو میں آج بھی بسی تھی۔ جو محبت میں بیچ راہ میں ہاتھ چھڑا کر تنہا آگے بڑھ جاتے ہیں وہ بھلا پلٹ کر پیچھے رہ جانے والوں کی خبر کب رکھتے ہیں۔ انہیں تو زیست کا سفر خود طے کرنا ہوتا ہے۔

اس کے لیے علی کا رشتہ آیا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ اور خوش شکل نوجوان تھا، وہ کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہوسکتا تھا مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی۔ جہاں موسمِ ہجر ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ گھر میں سبھی خوش تھے اس کے لیے آنے والا پہلا رشتہ بھی شاندار تھا اور پھر فاروق کا بھتیجا ہونے کے ناتے انکار کا جواز ہی نہیں بنتا تھا۔

''زارون مجھے میرا قصور تو بتا کر جاتے۔'' وہ تصور میں شکوہ کناں تھی۔ آنسو بھل بھل بہنے لگے تھے۔ بہتی بارش میں آنسو شامل ہوئے تو درد بڑھ گیا تھا۔

''آج آخری بار زارون کے لیے رو لو...... اپنا دل ہلکا کرلو......'' رائحہ اس کی غمگسار، دوست، بھابی، ہمدرد سبھی کچھ تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی آئی تھی۔

''رائحہ، زارون نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا...... میری محبت میں کہاں کھوٹ تھی جو اس نے اپنی راہیں بدل لیں۔'' وہ آج بھی سفرِ زیست کی شاہراہ پر وہیں کھڑی تھی جہاں تین سال پہلے زارون اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے کرب سے آنکھیں زور سے میچ کر خود اذیتی سے درد اپنے اندر اتارا تھا۔

''قدرت جو ہمارے حق میں بہتر نہ ہوں انہیں ہم سے الگ کر کے ہمیں بہترین نعم البدل عطا کرتی ہے۔ علی اچھا لڑکا ہے ساویہ......'' طلحہ اور ابو نے چھان بین کرلی تھی۔ وہ ہاں کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ساویہ کے فیصلے کا سبھی کو انتظار تھا اور اس کا فیصلہ......

اس کا فیصلہ گھر والوں سے الگ نہیں تھا۔ اور الگ ہو بھی کیسے سکتا تھا، وہ ساویہ شکیل تھی زارون خلیل نہیں...... وہ خودغرض نہ تھی کہ خود سے وابستہ رشتوں کو دکھ دیتی، اسے ماننا ہی تھا۔ اس کے آنسوؤں میں شدت آگئی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ زارون کے لیے رو رہی تھی اور شاید آخری بار بھی...... اسے بھی سفرِ زیست میں کسی کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنا تھا۔ بارش میں بھی شدت آگئی تھی۔ رائحہ اندر چلی گئی۔ وہ وہیں بیٹھی آنسو بہاتی رہی تھی۔ محبت کو وجود میں ہمیشہ کے لیے دفن کرنا آسان کہاں ہے۔ وجود میں ہجر گھلنے لگا

تھا۔ اس نے اس ہجر کو جان کا روگ نہیں بنایا اور اللہ کی مرضی سمجھ کر آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

"کیسی ہو ساویہ.....؟" وقت کا کام گزرنا ہے سو۔ وہ اپنی رفتار سے گزر رہا تھا۔ گزرے وقت میں وہ ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ علی بے حد۔ کوآپریٹو شوہر ثابت ہوا۔ اس نے ہر قدم پر ساویہ کا ساتھ دیا تھا۔ آٹھ سال مختصر وقت نہ تھا۔ اور نہ ہی اتنا طویل کہ وہ اس آواز کو نہ پہچان سکتی۔ وہ آٹھ سال بعد یہ آواز سن رہی تھی۔ موسم محبت ٹھہرنے کو تھا کہ وہ لوٹ آیا۔ اس نے تحیر سے موبائل کی جگمگاتی اسکرین دیکھی۔ وہ گزرے سالوں میں نہ تو کانٹیکٹ لسٹ سے اس کا نمبر ڈیلیٹ کر سکی تھی اور نہ ہی اس نے اپنا نمبر چینج کیا تھا۔ وہی خوب صورت کانوں میں رس گھولتا گمبھیر لہجہ..... جو مدِمقابل پر سحر پھونک دے۔

"جی کون.....؟" وہ لمحہ بھر کو کمزور پڑی تھی۔ وقت کافی گزر گیا تھا۔ پلوں کے نیچے سے کافی پانی گزر چکا تھا۔ وہ ایک بچے کی ماں مسز علی رفیق تھی اسے مضبوط ہونا ہی تھا اپنے لیے نہ سہی اپنے بچے اور بے حد پیار کرنے اور جان چھڑکنے والے شوہر کے لیے..... اس نے خود کو مضبوط کرتے پُراعتماد لہجہ اختیار کیا۔

"کیا تم مجھے بھول گئی ہو؟" زارون کے لہجے میں درد سمٹ آیا تھا۔ اس نے آہستگی سے سرگوشی کی۔ نہ جانے اسے کیوں لگتا تھا کہ ساویہ اسے بھول نہیں پائی ہوگی۔ زارون کے لہجہ میں کچھ ٹوٹا تھا۔

"مسٹر آپ اپنا تعارف کروادیں....." وہ جو اسے یاد کر کے اس کی جدائی میں پہروں روئی تھی، اپنی محبت کی ناقدری پر ماتم کناں رہی تھی وہ بیگانگی کی انتہا پر سرد مہری سے استفسار کرتی پہچاننے سے ہی صاف انکاری تھی۔ بعض اوقات انسان اپنا بھرم قائم رکھنے میں پُرسکون رہتا ہے۔ وہ علی کے ساتھ زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی کہ وہ اس کا سکون درہم برہم کرنے چلا آیا تھا۔

"مجھے معاف کردو ساویہ..... میں نے تمہارا دل دکھایا ہے۔" زارون کا لہجہ ہنوز ٹوٹے کانچ کی کرچیوں سے لہولہان تھا وہ بیچ راہ میں ہاتھ چھڑا کر پلٹ کر اسے دیکھے بنا آگے بڑھ گیا تھا اس نے سب کچھ پایا تھا۔ من چاہا محبوب..... دولت، پُرتعیش گھر، گاڑیاں، نوکر، چاکر صرف سکون نہ پاسکا تھا۔ ساویہ دم بخود رہ گئی۔ اس کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے معافی مانگے گا۔

"زارون....." جو آنکھیں خواب نہیں دیکھتی ہیں وہ بے رنگ ہوجاتی ہیں، اس کی بے رنگ آنکھوں میں علی نے دوبارہ خواب سجائے تھے۔ وہ بیگانگی کا خول چڑھائے ہوئے تھی۔ خول چٹخ کر رہ گیا تھا۔ دونوں کے بیچ خاموشی در آئی۔

"مجھے تمہاری آہ لگی ہے ساویہ....." زارون کا درد کم نہیں ہورہا تھا۔ وہ نادم تھا۔ اسے اپنے کیے کی سزا ملی تھی۔

"ایسا مت کہو..... میں نے تمہیں کبھی بددعا نہیں دی ہے۔" ساویہ نے تڑپ کر اپنی صفائی دی۔

"تم میرے لیے اولاد کی دعا کرو..... میں ابھی تک بے اولاد ہوں....." وہ سناٹے میں رہ گئی تھی۔ قدرت کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ وہ اپنے ہی گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔

"میں نے تمہیں بہت پہلے ہی معاف کردیا تھا اور اب پھر کہتی ہوں، میں نے تمہیں معاف کیا زارون....." وہ برسوں بعد بھی اس کے دکھ پر رو پڑی تھی۔ اسی لمحے علی اندر داخل ہوا تھا۔ خزیمہ اس کے ساتھ تھا۔ وہ سو چکا تھا۔ علی نے اسے ساویہ کے قریب لٹادیا۔ ساویہ کے چہرے پر ممتا کی چمک ابھری تھی۔

"تھینک یو سو مچ ساویہ....." زارون ممنونیت سے رو پڑا تھا۔ ساویہ نے فون بند کردیا تھا۔ اس نے خزیمہ کا ماتھا چوم لیا۔ اس کی دنیا مکمل تھی۔ چاہنے والا شوہر، بے حد پیارا بچہ اور پُرسکون ازدواجی زندگی اس نے علی پر نگاہ ڈالی۔ وہ اطمینان سے ٹی وی آن کر چکا تھا۔ وہ علی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔

(ختم شد)

باجی رشتے والی

باجیہ سرور ریحان

"تم یقین نہیں کروگی کہ احتشام کے اس دلیرانہ فیصلے پر شوہر صاحب نے مجھے کیا کہا؟" میں اپنے دُکھڑے جو اسے کئی منٹوں سے مسلسل سنا رہی تھی آخرکار وہ بات بھی شامل کرنے کو تیار ہوگئی جو کل رات ہی شوہر صاحب کے مجھ سے کہنے پر میں نے تنگ آکر آج احتشام اور شوہر صاحب کو بتائے بغیر لڑکی اور اس کے گھر والوں سے ملنے کی ٹھانی تھی۔ گو اس کی پشت میری طرف تھی مگر اس کی گہری آنکھیں گاڑی کے بیک ویو مرر سے مجھے مسلسل نظر آرہی تھیں اور ان آنکھوں کو ایک لمحے کے لیے بھی میں نے اپنے دُکھڑے کے شروع ہوتے ہی اپنی طرف سے بے پروا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

خیر مجھے تو یہ معلوم ہی ہے کہ میرا اندازِ گفتگو کچھ ایسا سلجھا، بردبار اور عقلمندانہ ہے کہ مجال نہیں کہ میں کچھ بولنا شروع کروں اور مخاطب مجھے نظر انداز بھی کر سکے..... پھر بھی ایک کم عمر لڑکی وہ بھی ٹیکسی ڈرائیور اوپر سے سڑک پر تیز دوڑتی ہوئی گاڑی کو چلاتے ہوئے اس کا مجھ سے تھوڑا بہت بے پروا ہونا تو بنتا تھا..... مگر یہ لڑکی بہت ماہر ڈرائیور تھی۔ گاڑی بھرے رش میں سے نکلتی چلی جارہی تھی۔ ٹریفک سگنل پر رک کر بھی جیسے وہ وقت کے تھم جانے کا احساس نہ ہونے دیتی۔ پہلے پہل تو

جب میرے دروازے پر یہ لڑکی اس گاڑی نما ٹیکسی کے ساتھ حاضر ہوئی تو مجھے بڑی جھجک آئی اور تھوڑی سی گھبراہٹ بھی ہوئی کہ پتا نہیں اتنی سی تو لڑکی ہے، کراچی جیسے شہر کی معروف اور رش بھری سڑکوں پر پتا ڈھونڈ بھی پائے گی یا نہیں۔ پچھلے دنوں احتشام نے ہی مجھے ایک ایسی ٹیکسی سروس کا نمبر موبائل پر میسج کیا تھا جو صرف خواتین کے لیے وجود میں لائی گئی تھی اور جس کی ڈرائیور بھی تمام کی تمام خواتین تھیں پھر اتنی سی لڑکی کا اتنا مشکل کام کرنا مجھے حیران کر گیا تھا..... اس وقت میں نے اس میسج پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ کیونکہ مجھے جب بھی کہیں جانا ہوتا یا تو اپنے چھوٹے بھائی احتشام کے ساتھ جاتی یا پھر شوہر صاحب کے ساتھ۔ اکیلے اس طرح نکلنے کا سوچنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ میں اپنے اس معرکے کو احتشام اور شوہر صاحب دونوں سے چھپانا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا کہ کئی دنوں بعد شہر میں اکیلے کسی انجان علاقے میں ایک گھر ڈھونڈنے نکل رہی ہوں تو کم از کم ٹیکسی تو ایسی لوں جس کے ڈرائیور سے مجھے کسی بھی قسم کا خوف یا ڈر محسوس نہ ہو۔ میں نے دیے گئے نمبر پر فون کر کے اپنے لیے ٹیکسی منگوائی اور چند ہی منٹوں بعد یہ لڑکی میرے گھر کے آگے اس چھوٹی مگر صاف ستھری اے سی والی گاڑی کے ساتھ حاضر ہوگئی تھی۔ سلام دعا کے بعد میں نے اسے پتا جو کہ ایک پرچے پر میں پہلے ہی لکھ کر لے آئی تھی تھما دیا۔ بس وہی ایک لمحہ تھا جب اس نے مجھے دلچسپی سے دیکھا اور ادب سے مسکراتے ہوئے بتایا کہ کیونکہ وہ وہیں قریب ہی رہتی ہے لہٰذا مجھے فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں، وہ مجھے بہت آرام سے مطلوبہ پتے پر پہنچا دے گی..... میرے دل میں ایک کسک سی اٹھی۔ جہاں ایک معمولی سی ٹیکسی ڈرائیور کی رہائش ہو وہ علاقہ بھی معمولی ہی ہو گا..... یعنی احتشام نے ہماری حیثیت کا خیال نہ کرتے ہوئے بالکل ہی کسی معمولی سی لڑکی کو پسند کر لیا تھا۔

بس اس بات کے ادراک نے یا پھر اس لڑکی ڈرائیور کی ماہرانہ ڈرائیوری نے مجھے اس سے بات کرنے پر مجبور کر دیا..... پھر اب تک مجھے سمجھ بھی تو کوئی نہیں رہا تھا۔ میرے بتایا بھائی، بہن، بابا جانی یہاں تک کے شوہر صاحب بھی احتشام کے ہی حامی ہو گئے تھے۔ ایسے میں ایک سننے والا مل گیا تھا پھر وہ بھی اجنبی..... جس سے پھر دوبارہ شاید ہی ملاقات ہوتی لہٰذا اس اجنبی سے وہ سب کہہ سکتی ہوں جو میں اپنوں سے اب تک کہہ ہی نہیں سکی تھی۔ پھر اس کی گہری آنکھیں جو شیشے سے کبھی سڑک پر نظر ڈالتیں تو کبھی مجھ پر مرکوز ہو جاتیں..... ایسا لگتا جیسے وہ آنکھیں خود مجھے دعوت دے رہی ہوں کہ میں اس کے سامنے اپنے تمام خدشات بغیر کسی تمہید کے بتا دوں..... میں نے اسے شروع سے ساری رُوداد سنانی شروع کر دی اور پھر پچھلی رات کی گئی شوہر صاحب کی بات تک پہنچ گئی..... اس کی گہری آنکھوں میں دلچسپی کچھ اور بڑھتے دیکھ کر مجھے سکون سا ہوا..... میں نے لمبی سانس کھینچ کر ایک ہی لمحے میں شوہر صاحب کی بات من و عن اس کو سنا دی۔

''حیرت یہ ہے بیگم کہ آپ نے ماں بن کر اپنے بھائی کو پالا مگر پھر بھی اپنے بھائی کے مزاج کو نہیں سمجھ پائیں..... آپ تو خود طاقت کی دلدادہ ہیں پھر کیا آپ سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ پسند بھی ایک طاقت ہے؟ جی ہاں کسی کو پسند کروایا نہیں جا سکتا..... پسند کوئی بھی کہیں بھی کسی بھی لمحے آ سکتا ہے اور یہ جذبہ بالکل فطری اور بغیر کسی اثر رسوخ کے ہی اچانک انسان کے دل و دماغ پر اپنا قبضہ جما تا ہے اور آپ اپنے چھوٹے بھائی کی اس طاقت کے آگے کسی قسم کا کوئی بند نہیں باندھ سکیں گی بہتر تو یہی ہے کہ آپ اس کی پسند کو ہی اپنانے ..... کا فیصلہ کر لیں۔''

میں اس کے چہرے کو تو نہیں دیکھ پا رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں شوہر صاحب کی بات سن کر ایک لمحے کو شرارتی سی مسکراہٹ تیرتے ضرور محسوس کر گئی تھی..... مگر مجھے اس پر ذرا بھر بھی غصہ نہیں آیا بلکہ میں خود بھی مسکرا دی جیسے آپ اپنے کسی بہت ہی عزیز کو اپنا کوئی دکھڑا سنانے بیٹھیں اور وہ آپ کی دکھی داستان

کے دوران ہنس، ہنس کر آخرکار آپ کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دے اور پھر آپ کو احساس ہو کہ آپ نے بلاوجہ اتنی سی بات پر اپنی زندگی حرام کر رکھی تھی۔

''کاش یہ لڑکی مجھے پہلے مل گئی ہوتی.....'' یعنی کل سے پہلے کیونکہ کل رات شوہر صاحب کی اس دوٹوک بات سے میں کس قدر چڑ گئی تھی مگر میں خاموش رہی تھی۔ ظاہر ہے ان سے بحث کر کے میں اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ ایک طرح سے تو میں ان سے متفق بھی تھی۔ واقعی کسی کو بھی زبردستی تو پسند نہیں کروایا جا سکتا ناں..... پسند تو کوئی بھی آ سکتا ہے..... مگر پھر بھی احتشام سے مجھے ایسی امید نہیں تھی..... شوہر صاحب کے ساتھ، ساتھ وہ بھی تو جانتا تھا کہ میرا اپنا مزاج کیسا ہے..... کیا عمر تھی اس کی جب امی جان کا انتقال ہوا..... وہ شاید چھٹی یا ساتویں میں پڑھ رہا تھا۔ بڑی بہن ہونے کے ناتے میں نے اس کی تربیت، تعلیم اور کھانے پینے کی فکرمندی میں اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا..... کیونکہ اس سے بڑے باقی بھائی، بہن اپنی تعلیم اور زندگیوں میں مشغول رہتے اور بابا جانی اپنے کاروبار میں اور پھر میرے پاس بھی کچھ خاص کام نہیں ہوتا تھا۔ شوہر صاحب کے والدین تھے نہیں..... گھر میں ہر طرح کی آسائش و آزادی میسر تھی۔ اس پر بال بچے نہ ہونے پر سارا دن میرے پاس کچھ بھی کرنے کو نہ ہوتا لہٰذا احتشام میرے ہاں آ کر میرے اور شوہر صاحب کے لیے ایک اچھی مثبت تبدیلی لے آیا تھا۔ اب جبکہ وہ ایک خوش مزاج، صحت مند اور منچلا سجیلا سا جوان بن کر میرے گھر میں چلتا پھرتا تو مجھے یوں ہی محسوس ہوتا جیسا میرا اپنا ہی بیٹا بڑا ہو گیا ہو..... شوہر صاحب بھی اسے ایسی ہی محبت دیتے اور وہ بھی ہم دونوں میاں، بیوی کو نہایت عزت اور انسیت سے قریب رکھتا۔

مگر چند دنوں پہلے اس نے میرے دل پر عجیب طرح کا بوجھ ڈال دیا یعنی اپنی پسند کا ..... میں تو اچانک ہی اس بوجھ تلے دبا دی گئی اور مجھے بالکل ایسا لگنے لگا جیسے میرا دم گھٹ رہا ہے..... ایسی بات نہیں کہ میں نے کبھی احتشام کی شادی کا سوچا ہی نہیں ہو بلکہ میں نے تو کئی ایک لڑکیاں پہلے سے ہی نظروں میں رکھی ہوئی تھیں اپنے بھائی کے لیے اور چند دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آج کل میں کسی روز بابا جانی سے بات کر کے احتشام کی دلہن لے آؤں گی کہ اس نے یہ ظلم ڈھا دیا..... سب سے زیادہ فکر تو مجھے اپنے دشمنوں کی تھی۔ وہ سب لوگ جن کو میری وجہ سے کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ یہ خبر ملتے ہی کہ احتشام نے میرے ہوتے ہوئے نہ صرف خود سے لڑکی پسند کر لی بلکہ شادی بھی اسی سے ہو رہی ہے تو سارے کے سارے کیسے خوشی کے شادیانے بجائیں گے اور یقیناً سب کے منہ پر ایک ہی بات آئے گی۔

''جو بویا کاٹنے کے دن آ گئے ہیں..... اب پتا چلے گا باجی رشتے والی کو.....''

ہاں میں جانتی ہوں کہ یہ لقب یا عرفیت ''باجی رشتے والی'' میری شخصیت سے کچھ زیادہ میل نہیں کھاتا مگر مجھے ہمیشہ سے ایسا ہی کوئی نک نیم اپنے لیے پسند تھا۔ ایسا لقب جو بالکل سادہ، صاف اور سیدھا ہو اور جو دو لوگوں کے درمیان یا پھر کسی محفل میں لیے جاتے ہی میری شخصیت اور میرے کام کے بارے میں تمام احوال لمحوں میں سمجھا سکے..... گو میں نے یہ کام خود چنا تھا مگر میرا انداز دوسری عام رشتے لگانے والیوں سے کہیں مختلف تھا۔ میں کلائنٹ سے پہلے فون پر رابطہ کرتی پھر اس کو گھر کے ایک کمرے میں بنائے گئے اپنے آفس بلاتی اور اس پر بھی فوراً ہی ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوتی۔ کلائنٹ کو پہلے میرے ہاں کام کرنے والے ملازموں میں سے کوئی میرے آفس میں عزت سے بٹھاتا پھر اُن کو چائے، ناشتا پیش کیا جاتا اور پھر کہیں جا کر میں خراماں، خراماں اپنے آفس پہنچتی۔ پھر مجھے وہ وقت یا لمحہ بھی بے حد پسند آتا جب ہمارا غائبانہ تعارف کئی بار ہو چکا ہو مگر پھر بھی مجھ سے ملنے کا اشتیاق رکھنے والیوں کو مجھے باقاعدہ دیکھ کر ایک زبردست قسم کا حیرت جھٹکا لگے..... ان کے ہاتھ میں اگر چائے کا

کپ ہو تو لہرا جائے یا کسی قسم کے ناشتے کا منہ میں نوالا ہو تو وہ حیرت کے مارے منہ کھلنے پر سامنے بیٹھے ہر ایک کو صاف نظر آئے۔ اس کے بعد بھی ملنے والے مجھ سے ایک بار پھر میرا تعارف میری ہی زبانی سننا چاہتے یعنی مجھ سے ہی سننے پر بضد ہوتے...... اور پھر میں ایک ادائے دلبرانہ لیے چہرے پر مسکراہٹ سجائے بتاتی۔

''جی ہاں آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے اور آپ بالکل ٹھیک پتے پر آئی ہیں۔ میں ہی ہوں۔ میرا نام نہیں لیجیے بس مجھے باجی رشتے والی ہی کہیں۔''

اب کوئی یہ پوچھنا چاہے کہ مجھ جیسی حسین، کم عمر اور امیر لڑکی نما عورت نے ایسا پیشہ (اگر رشتے لگانے کو پیشہ سمجھا جاتا ہو) کیوں اختیار کیا؟ اس کے محرکات کیا تھے؟ تو میرا ایک بار پھر بہت سادہ سیدھا اور صاف سا جواب ہوگا...... ''طاقت......'' جی ہاں طاقت حاصل کرنا وہ نشہ ہے جو انسان کو کبھی کسی بھی عمر میں لگ سکتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ باقاعدہ طاقت کا نشئی ہو چکا ہے۔ میرے پاس پیسہ ہے، خاندان ہے، عزت ہے مگر مجھے تو جنون، طاقت کا تھا...... اب یہی دیکھیں کہ یہ احساس کتنا فخریہ ہے کہ میں ملتے ہی کسی ایک کی زندگی کے کسی ایک دن، ہفتہ یا زیادہ سے زیادہ مہینے پر اس قدر طاقت، دسترس اور اختیار حاصل کر چکی ہوں کہ اس کی آئندہ زندگی کے خوشی یا غم میرے ہاتھ میں ہے...... حالیہ لمحے، دن یا ہفتے بھر میں جو کچھ بھی ہوگا میرے کہنے اور میرے اشاروں پر ہوگا اور اس کے بعد میرے اشاروں پر ناچتی ہوئی کسی بھی لڑکی کی ماں کی طرف سے جو کچھ بھی کیا جائے گا اس کا خمیازہ یا انعام ان کی بیٹی ساری زندگی اپنی سسرال میں بھگتی رہے گی...... جبکہ میں بہت آرام سے اپنا کام نمٹا کر سمدھیانوں کے بیچ سے غائب ہو چکی ہوں گی...... اب بیٹھے رہیں دونوں خاندان الجھی ہوئی گتھیاں سلجھاتے رہیں...... ایسا بھی ضروری نہیں کہ ہر کسی سے ہی مجھے بیر ہو جائے...... کچھ لڑکیاں تو ایسی اللہ میاں کی گائے ہوتی ہیں کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ جہاں میکے میں ہی اتنی زیادتیاں ہو چکی ہیں وہ اگر سسرال میں دو چار تھپڑ بھی کھا لیں گی تو میکے میں آ کر اُف کرنے کی زحمت نہ کریں گی کیونکہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بوجھ کے مانند کشتی کے بھاری ہونے پر بیچ سمندر میں ہی پھینکی جانے کے لائق تھیں...... لہٰذا ایسی لڑکیوں کے لیے میں دل و جان سے کوشش کر کے ایسے لڑکے فراہم کرتی ہوں کہ جو ان کو خوشی یا آرام نہ سہی مگر کم از کم عزت ضرور دے سکیں۔ جواب میں ایسی لڑکیاں ایک طرح سے مجھے بھی بہت احترام، عزت اور اہم گردانتیں کہ ہر تہوار یا خوشی کے موقع پر میرے گھر مٹھائی یا حیثیت کے مطابق تحائف ضرور بھجواتیں جو ایک نظر دیکھ کر میں اپنے ہاں کام کرنے والے ملازموں میں بانٹ دیتی۔

کسی انسان کو اپنا احسان مند دیکھنا بھی تو طاقتور ہونے کی نشانی ہے...... مگر کچھ لڑکیاں...... توبہ، توبہ...... ایسی لڑکیوں کے والدین کا سوچ کر ہی میں کئی بار استغفراللہ ضرور پڑھتی ہوں یعنی اتنے نا اہل کہ بچیوں کے مستقبل کا ذرا نہ سوچ سکیں اور اپنی بچیوں کو ایسی ہی کچھ شوخ، رنگیلی، ناز و ادا سے لبریز بنا دیا۔ ایسی لڑکیوں کا فخر یا گھمنڈ ان کے میکے والے ہوتے ہیں...... ضروری نہیں کہ اکلوتی ہوں کئی بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ ماں، باپ حیات ہوں یا بہت امیر ہوں۔ کہیں، کہیں ایسا بھی دیکھا کہ چار بیٹیاں ہیں باپ کا پیشہ بھی کچھ خاص نہیں، کرایے کے مکان میں رہتے ہیں مگر مزاج اللہ، اللہ ایسا بنایا لڑکیوں کا جیسے ابھی، ابھی تو آسمان سے شہزادی بنا کر اتارا گیا ہو۔ ایسی لڑکیوں اور ان کے ماں، باپ سے مجھے سخت کوفت ہو جاتی...... ایسے میں ہر ممکن کوشش کرتی کہ ایسا کوئی خودسر، بدتمیز یا اکھڑ قسم کا لڑکا ان سے ٹکراؤں کہ جو دیکھنے میں بہت اچھا ہو...... مگر پرکھنے پر معلوم چلے کہ کیا ٹیڑھی کھیر ہے...... ایسے ماں، باپ میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو کچھ اتنی محبت اور اپنائیت سے پال کر جوان کرتے ہیں کہ ہر اچھی شکل صورت کے لڑکے پر ان کی رال ٹپکنے لگتی ہے اور میرا کام اور آسان ہو جاتا

ہے۔ ایسے میں کچھ سمجھدار باپ دبے لفظوں میں مجھ سے اگر لڑکے کی تعلیم، تربیت، نوکری یا خاندان کے بارے میں زیادہ استفسار کر بھی لیتے تو میں جھٹ ان کے آگے ایک امیر رنڈوے یا عمر رسیدہ پروفیسر کی تصاویر ڈال دیتی۔

''ویسے بھی جوان، حسین صحت مند لڑکا نہیں چاہیے تو ان مردوں میں سے کسی کو پسند کر لیں۔'' ماں فوراً تڑپ جاتی اور شوہر کو میرے ہی سامنے ڈانٹ کر چپ کروا دیتی...... مگر کیا کہا جائے کہ یہ زمانہ ہی قابلِ اعتبار نہیں رہا۔ میں حد ممکن ٹیڑھا لڑکا ڈھونڈ لاتی مگر شادی کے چند ہی دنوں میں وہ زن مرید بن کر بیٹھ جاتا...... میرے کلیجے میں اور آگ لگا دیتا...... ایسے میں بھی لڑکی کے گھر والے میرے بڑے احسان مند رہتے مگر پھر مجھے ان سے ان کی بیٹی سے لڑکے اور لڑکے والوں سے ایسی چڑ ہو جاتی کہ میں خود ہی ان سے تمام تعلق توڑ لیتی۔ سب سے زیادہ مشکل وہاں آتی جب میں کسی ایسی لڑکی کا رشتہ لگانے کے لیے چنی جاتی جو کہ نہ صرف پڑھی لکھی ہو مگر ساتھ میں سوچنا، سمجھنا اور باقاعدہ اپنا ایک مزاج بھی رکھتی ہو۔ میں تاسف سے سوچتی کہ ارے یہی وہ قسم ہے لڑکیوں کی جن کی شکل اچھی نہ صورت، پیسہ، خاندان اور پیشہ بھی کچھ خاص نہیں مگر ان کی ہی بدولت ہمارے معاشرے میں طلاق اور دوسری شادی کی شرح بڑھ گئی ہے...... اس قسم کی لڑکیاں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سوچتیں کہ ان کا کام مردوں کے معاشرے میں سوچنا، سمجھنا اور فیصلے لینا کبھی نہیں تھا اور نہ ہوگا...... سمجھ نہیں آتا کہ لڑکیوں کی اس قسم نے پتا نہیں کب اور کیسے مردوں کے آگے ہاتھ باندھنے، ان کی جی حضوری کرنے اور اپنے مجازی خدا کے ہاتھوں اپنی بے عزتی پر باقاعدہ ایک محاذ کھڑا کرنا شروع کر دیا۔ جس کے باعث ہمارے اچھے خاصے سیدھے سادے سے معاشرے میں ایک طوفان، ایک عذاب سا نازل ہو چکا ہے۔

یہ لڑکیاں اپنی زندگی یا قسمت کی ڈور کو اپنے شوہر یا سسرال والوں کے ہاتھ میں دینے کے بجائے اپنے ہاتھ میں رکھنے پر بضد رہتی ہیں اور ایسی ہی لڑکیوں نے مردوں اور ان کے گھر والوں کو باقاعدہ کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے...... ایسی لڑکیوں کا جب بھی مجھے رشتہ لگانے کو دیا جاتا تو میں ایسے مرد چن کر دکھاتی جن کا تھوڑا بہت تھانے یا جیل کا چکر لگ چکا ہو یعنی کہ وہ تھوڑے بہت مجرمانہ حرکات کے مرتکب ہو چکے ہوں...... کیونکہ ایسے ہی مجرم نما لڑکے یا مرد

سوچنے، سمجھنے کا خود فیصلہ لینے والی لڑکیوں کو قابو
میں کر سکتے ہیں۔ وہ نہ تو ایسی لڑکیوں سے دبتے ہیں
اور نہ ہی اپنی عزت بچانے کی فکر میں ان کو فوراً فارغ
کرتے ہیں بلکہ وہ باقاعدہ اپنی بیوی سے مقابلے پر اتر
آتے ہیں، نہ ہی ان کو چھوڑتے ہیں نہ ہی ان کی بات
مانتے ہیں بلکہ کبھی، کبھی تو دونوں ساری زندگی ساتھ
رہتے ہیں اور پھر بھی ایک دوسرے کے نہیں بن
پاتے.....مگر ایسی لڑکیوں کے بارے میں جو ایک بات
مجھے ہمیشہ بہت حیران کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کم بخت
پہلی ہی بار ملنے والوں کو ایک دم ایک لمحے میں اپنی مٹھی
میں کر لینے کی طاقت رکھتی ہیں.....یہی تو وہ قسم ہے جن
کی معمولی شکل صورت، واجبی تعلیم اور خاندانی اثاثہ نہ
ہونے کے باوجود سسرال میں اپنا ایک مقام، عزت اور
رکھ رکھاؤ ہوتا ہے.....ان کے آگے کسی کا بس نہیں
چلتا.....اکثر تو سسرال والے ہی اپنے لڑکے کو برا بھلا
کہہ کر بہو کی پیروی میں لگ جاتے ہیں.....اور یوں
ان کی زندگی اچھی بھلی گزر جاتی ہے۔

اور میں یہ کیسے اور کس طرح تسلیم کر لوں کہ میرا
اپنا احتشام کسی ایسی ہی لڑکی کی طاقت کے زیر اثر آ چکا
ہے؟ جو نقشہ احتشام نے اس کا میرے سامنے کھینچا مجھے
تو اپنی ہی فکر لگ گئی تھی۔ بھلا ایک میان میں دو تلواریں
کس طرح رہ سکیں گی اور اب اتنے سالوں کی محنت اور
ریاضت کے بعد تو احتشام سے جدائی بھی آسان حل
نظر نہیں آتی تھی۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس
قسم کی لڑکیوں میں مردوں کو لبھانے، رجھانے اپنے
جال میں پھنسانے جیسا کوئی ہنر سرے سے ہوتا ہی نہیں
لہٰذا یہ کہہ کر بھی ملے بغیر لڑکی سے میں کسی قسم کا بیر نہیں
رکھ سکتی تھی۔ شوہر صاحب الگ احتشام کی پسند کو منظور
کر چکے تھے.....اب ناپسند کرنے کے لیے کوئی وجہ بھی
تو ہوتی لہٰذا تنگ آ کر احتشام اور شوہر صاحب کو بتائے
بغیر ہی میں نے لڑکی سے ملنے اور مل کر اسے اپنی طاقت
دکھانے کا فیصلہ کیا۔

اور کتنا وقت لگتا جبکہ میرا ڈرائیور تو کبھی احتشام تک
نہیں پہنچتا تھا آخر کار اس نے گاڑی میرے مطلوبہ گھر
کے سامنے روک دی.....میں نے اندر ہی بیٹھے، بیٹھے
گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ اتارے بغیر ارد گرد دیکھا۔ وائٹ
لوے، سو گز کے رقبے پر پرانی طرز پر بنے ہوئے مکانوں کا
معمولی سا علاقہ تھا.....میرے منہ سے بے اختیار گہری
سانس نکلی.....ابھی تک تو میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ
میں لڑکی سے مل کر اسے کیا کہنے والی ہوں۔

''تو کیا آپ رشتہ ختم کر دیں گی.....یا پھر لڑکی
سے کہیں گی کہ وہ خود ہی انکار کر دے؟'' میرے ہاتھ
سے اپنی مزدوری لیتے ہوئے اس نے مجھ سے اچانک
دھیمے لہجے میں پوچھا تو میں گڑبڑا گئی۔ میں نے ابھی
تک اس کے منہ سے چند ایک الفاظ ہی سنے تھے اب
جو پورا جملہ سنا تو یہ احساس ہوا کہ شاید لہجہ کچھ ٹوٹا
بکھرا ہوا سا تھا اور پھر پیسے لیتے ہوئے اس کا سیدھا
ہاتھ کچھ کپکپایا ہوا سا کیوں تھا؟ مجھے احساس تھا آخر وہ
بھی ایک لڑکی تھی اور اسی کی حیثیت کی کسی دوسری لڑکی
کے مستقبل کے لیے اس کا اس طرح جذباتی ہونا فطری
تھا.....میں ایک بار پھر مسکرا گئی۔

''ایسا تو میں نے سوچا نہیں اور نہ ہی انکار کرنے کا
کوئی ارادہ ہے.....اب احتشام کی پسند ہے تو میں انکار
کیسے کر سکتی ہوں۔ بس چاہتی ہوں کہ اس سے مل کر
اسے ذرا اچھے سے سمجھا دوں کہ میں کوئی معمولی سی نند
نہیں ہوں.....باجی رشتے والی ہوں۔ رشتے کرواتی
ہوں.....ایک سے ایک لڑکی ہے میرے پاس.....لہٰذا
مجھ سے بچ کر رہے گی تو بچی رہے گی۔''

یہ بات میں نے صرف اسے ہی بتائی تھی کیونکہ
جہاں میں نے اس سے اتنی باتیں کی تھیں، جہاں اس
نے مجھے اتنا بے تکان سنا تھا تو میرا بھی فرض تھا کہ
بچھڑتے وقت اسے کوئی ایسی تکلیف، دکھ یا پریشانی نہ
دوں جو پھر کئی دنوں تک اس کے حواسوں کو مشکل میں
ڈالتی رہے.....جبکہ لڑکی سے تو ابھی مجھے ایک دو بار اور
ملاقات کرنی تھی اور چند ملاقاتوں تک اسے اس رشتے
سے اپنی ناپسندیدگی اور انکار ہی بتانے والی تھی۔ اس کی

گہری آنکھوں میں شرارت امنڈتی دیکھی تو اب کی بار
میں بھی شرارت سے کھلکھلا پڑی۔

''ویسے بھی تم سے بات کر کے اور تمہارے
ساتھ سفر کر کے بہت مزہ آیا.....میں تو اب یونہی کبھی
کبھار تم کو بلا لیا کروں گی، تم مجھے اسی طرح سڑکوں پر
سیر کرا دیا کرنا اور میں تم سے اپنے دل کی بات بھی کر لیا
کروں گی.....بتاؤ تو نام اپنا.....اگلی بار تمہارے نام
سے ہی ٹیکسی بلاؤں گی۔''

میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ
آ کر گزر گیا۔

''دراصل ہماری کمپنی کا رول ہے ہم اپنا اصل
نام نہیں بتا سکتے.....ہم سب.....''باجی ٹیکسی والی'' ہی
کہلاتے ہیں۔''

میرا موڈ واقعی بہت خوشگوار ہو گیا تھا میں ایک بار
پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ارے تم اتنی چھوٹی سی تو ہو اب میں تم کو بھلا
کیسے باجی کہوں گی اور پھر ہم ملیں گے کیسے؟ چلو پھر تم
مجھے اپنا نمبر دے دو، میں تم کو اپنے گھر بلا لیا کروں گی تم
چھٹی تو کرتی ہی ہو گی ناں.....؟''

مجھے نہیں معلوم کہ میری بے تکلفی کا اس پر کیا اثر
ہو رہا تھا مگر وہ دھیرے، دھیرے مسکراتی رہی اور جب
اس نے مجھے اپنا نمبر نہیں دیا تو جیسے مجھے ایک دم سمجھ آ گیا
کہ وہ مجھ سے کسی قسم کی دوستی یا جان پہچان رکھنا نہیں
چاہ رہی۔ ایسا کئی بار ہوا تھا میرے ساتھ بھی.....کچھ
خاندان میرے ایسے گرویدہ ہو جاتے کہ شادی کے بعد
بھی میرے ساتھ تعلقات رکھنے کی کوشش کرتے رہتے
مگر میں اپنا کام کر لینے کے بعد فوراً ہی ان سے خود ہی
الگ ہو جاتی کیونکہ یہ میرے پیشہ ور ہونے کی نشانی
تھی۔ مگر ابھی، ابھی جو اس کی طرف سے ایسا مجھے ٹکا سا
جواب ملا تو میرا دل ایک دم بجھ گیا.....کچھ لوگ جیسے ہی
نظر آتے ہیں ہمارے دماغ میں گھنٹی بج جاتی ہے جیسے
الہام سا ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارے بہت اچھے، سچے،
مخلص، دوست بن سکتے ہیں اور دل ایک دم ان کی
طرف کھنچتا چلا جاتا ہے مگر پھر وہی ہمیں یکسر نظرانداز کر
کے آگے بڑھ جاتے ہیں تو.....تو بس ایسا ہی کچھ مجھے اس
وقت محسوس ہوا تھا، تھوڑی دیر پہلے کی ساری خوشی کافور
ہو گئی۔ اس کی گاڑی کو زن سے آگے بڑھتے دیکھ کر
مجھے ہوش آیا میں تھکے، تھکے قدموں سے اپنے مطلوبہ گھر
کے دروازے پر پہنچی.....میرے بارے میں جان کر
مجھے بہت عزت و احترام سے گھر کے چھوٹے سے
ڈرائنگ روم میں پہنچایا گیا۔ ملازموں کے بجائے گھر
کے ہی افراد جن میں یا تو بہت زیادہ بوڑھے تھے یا پھر
بالکل ہی ننھے منے سب ہی اپنی، اپنی بساط کے مطابق
میری خاطر مدارات میں لگے ہوئے تھے۔ چند ایک
رسمی بات چیت کے بعد میں نے لڑکی سے اکیلے میں
ملنے کی خواہش کی اور فوراً ہی میری خواہش کے احترام
میں میزبان ایک، ایک کر کے کمرے سے باہر چلے
گئے.....اور تھوڑی ہی دیر میں خراماں، خراماں چال کے ساتھ
وہ نمودار ہوئی اور مجھ سے گلے ملنے آگے بڑھی۔ میرے
منہ سے بے اختیار نکلا۔

''باجی رکشے والی.....'' وہ میرے گلے لگتے، لگتے
ہنس پڑی۔

''اوہ ہاں سوری.....باجی ٹیکسی والی.....ٹیکسی
والی.....ہم، ہم، ہم.....''

میں نے سنبھلنے کی کوشش کرنے میں اپنی بات کی
خود ہی تصحیح کی۔

''تو آپ انکار کرنے نہیں آئیں.....بس مجھے
ٹینشن دینے آئی ہیں.....تا کہ میں جان سکوں کہ آپ
کوئی معمولی عام سی نند نہیں ہوں گی بہت طاقتور اور جابر
قسم کی ساس ہو جائیں گی.....کیوں ٹھیک کہاں ناں؟''

کہاں تو میں اسے سبق دینے آئی تھی اور اب مجھے
ہی اس سے آنکھیں ملانا دوبھر ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں بغیر
دیکھے بھی سمجھ رہی تھی کہ اس وقت اس کی گہری
آنکھوں میں بلا کی شرارت ہو گی۔ تھوڑی دیر تک کمرے
میں خاموشی رہی اور پھر ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

☆☆☆

سلسلے وار ناول

صراطِ عشق

دلشاد نسیم

تُو موجِ صبا، اے جانِ سحر میں یہاں پہ ہوں
تُو آ کے میرے دل میں اتر میں یہاں پہ ہوں
کیوں بے کلی سے پھر رہا ہے تُو گلی گلی
اے آسماں کے چاند اتر میں یہاں پہ ہوں

انسان کی خود مختاری... اس کے عقلِ کل ہونے کا غرور بسا اوقات فریب کی تانے بانے بُننے لگتا ہے... اور یہ تانے بانے ریشم کے نہیں، مکڑی کا جال ہوتے ہیں... مگر اس بات کو سمجھنے تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہو...

"صراطِ عشق" ایسے ہی خود ساختہ، فریبی تانوں بانوں سے بندھی ایک کہانی ہے... جو کہیں کہیں سے سچ بنی ہے اور کہیں پر زیبِ داستاں کے لئے کورے کاغذ پر رنگین لفظوں سے کشیدہ کاری کرنے کی جسارت بھی کی ہے...

یہ ارادوں اور خوابوں کے ٹوٹنے کی کہانی ہے...

محبت میں جینے اور محبت میں مر مٹنے کی کہانی...

محبت کی اگلی حد... جب محبوب پاس نہیں مگر آنکھ اس کے خواب دیکھنے لگتی ہو... وہ کہاں ہے کس حال میں ہے، جاننے لگتی ہو...

ممتا کی آفاقی محبت... دنیاوی محبوب کی فرقت کی کسک... کچھ ملنے اور بہت کچھ کھونے کا المناک قصہ ہے... یہ داستانِ عشق...

اس پل صراطِ عشق پہ لایا ہے مجھ کو دل
اب پھونک پھونک کر مجھے رکھنا ہے ہر قدم

قسط نمبر:15

ارزش کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس بچے کو جس کو وہ اپنا بچہ سمجھ ہی نہیں رہا تھا اُس کے لیے تڑپ کیوں رہا ہے، کیا یہ تڑپ اس لیے ہے کہ وہ نین سے اٹیچڈ ہے یا پھر نین کی بگڑتی ہوئی حالت اسے پریشان کررہی ہے۔

''اگر یہ میرا ہی بیٹا ہے؟'' ارزش کے ذہن میں لمحے بھر میں بجلی کی طرح یہ بات کوندی اور اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت کمزور ہوگئی۔ گاڑی ڈول گئی... بالکل اس کے دل کی طرح......

اسے ایک لمحے میں نین سے شادی اور یو کے جانے سے پہلے کا جو وقت نین کے ساتھ گزرا تھا یاد آنے لگا۔ وہ بہت خوشگوار نہیں تھا کم سے کم ارزش کے لیے...... لیکن نین اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ ان دونوں کا نکاح ہوا تھا شادی کے بندھن میں بندھے تھے، وہ اس کی شرعی بیوی تھی بلکہ اب بھی ہے اسے ایک دم سے کچھ احساس ہوا۔ اس نے نین کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ خاص طور پر اس سے بے خبر رہ کر......

ارزش نے اب خود سے وعدہ کیا کہ وہ نین کو مزید پریشان نہیں کرے گا......اور چھوڑ کر بھی نہیں جائے گا اور خود سے یہ وعدہ کرتے وقت وہ سب کو بھول گیا۔ اسے زلیخا یاد آئی نہ آمنہ...... نہ کوئی اور...... یاد اگر تھا تو صرف اتنا کہ نین بے ہوش ہے اور عالم بے ہوشی میں بھی وہ خضر کا نام لے رہی ہے۔ وہ وقت، وہ مقام جہاں اسے بچے کی شناخت کرنی تھی آ گیا تھا، ارزش کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔

دانیال پہلے سے موجود تھا۔ ارزش کو آتا دیکھ کر بے تابی سے بڑھا ارزش کے دل میں عجیب سی گھٹن ہورہی تھی۔ اس سے یہ سوال نہیں کیا گیا یہ بھی نہیں کہ دانیال تم نے کہیں دیکھا ہے خضر کو...... ایک لمحے کو کئی باتیں دل اور دماغ کو جھنجوڑ رہی تھیں۔ اسی لمحے ایک اور جوڑا آگیا ان کے ساتھ اور بھی لوگ تھے یہ سب مقامی تھے۔ ارزش نے سانس روک کر موجود پولیس کے اہلکاروں کو دیکھا۔

پولیس اہلکار نے اپنے سے کم درجہ اہلکار کو اشارہ کیا۔ تین ساڑھے تین فٹ کا وجود سفید چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ وہ کس کی قسمت کا تاریک وجود ہے یہ ارزش جانتا تھا نہ ہی وہ جوڑا جو پورے لشکر کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ اور ماں بار، بار آسمان کو دیکھ کر خیر کی دعا مانگ رہی تھی۔ ممکن ہے وہ یہ بھی کہہ رہی ہو کہ یہ بچہ اس کا نہ ہو...... ان کا ہو جو ان سے پہلے موجود تھے۔ ارزش سوچنا چاہ رہا تھا لیکن اس ایک لمحے میں اسے سر عارفین یاد آگئے جو کہتے تھے۔

''یہ بھی تمہارے امتحان کا حصہ ہے کہ جب مشکل آئے تو کہو کہ تم تو اس مشکل سے نکل جاؤ...... یہ آئی کسی اور کو آجائے...... یہ بددعا کسی کے لیے بھی نہیں کرنی چاہیے خواہ سامنے دشمن ہی کیوں نہ ہو......''

اور یہ تو دوست تھے نہ دشمن...... تو اجنبیوں کے لیے بھی وہ کیوں ایسا سوچتا...... وہ تو سوچ رہا تھا کہ کاش یہ بچہ ہم میں سے کسی کا نہ ہو۔

لیکن یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔

بچے کے چہرے سے پردہ اٹھ چکا تھا۔ بچے کا سیاہی مائل رنگ زردی میں گھل چکا تھا۔

آنے والا جوڑا بچے کو دیکھ کر پہچان کر ساکت ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آواز آئی اور ماں زمین پر ڈھے چکی تھی۔

دانیال اور ارزش اس بچے کو دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ وہ خضر نہیں ہے مارے خوشی کے ساکت تھے۔

اس مردہ بچے کی ماں کے زمیں بوس ہونے پر وہ سکتے سے نکلے...... دانیال نے ارزش کو دیکھا اور ارزش نے دانیال کو...... اس موقع پر کیا کہتے...... کیا کرتے...... سمجھ سے باہر تھا۔ پھر بھی ارزش نے ہمت کی۔

''کب گم ہوا تھا آپ کا بچہ...؟''

''پرسوں...'' باپ نے اپنے کندھے پر رکھے صافے سے آنسو صاف کیے۔ اس کے ساتھ آنے والے ماں کو سنبھالنے کی کوششیں اور بچے سے لپٹ کر رو کے دہائیاں دے رہے تھے۔

''باہر کھیل رہا تھا محلے کے لڑکوں کے ساتھ شام ہوگئی تو میں نے دیکھا اس کی ماں سے پوچھا...... پر کہیں نہیں ملا...... سارا گاؤں چھان مارا۔'' اس نے اپنی علاقائی زبان میں کہا۔

''تہاڈا کی خیال اے، اے حرکت کس دی ہوگی...... '' ارزش نے تحمل سے پوچھا۔

''کی کہہ سکتے آں...'' اس نے پھر آنسو صاف کیے۔

''بس ہمیں تو انصاف چاہیے'' گاؤں کے لوگوں نے دلیری سے پولیس اہلکاروں کے سامنے اکڑ کر کہا۔

ماں اور باپ دونوں ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کچھ بھی کہتے...... ان کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔

''انصاف بھی ملے گا، پہلے بچے کا میڈیکل ہوگا...... پوسٹ مارٹم ہوگا۔'' ارزش کے لیے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ دانیال بھی بار، بار اپنا خشک حلق تر کرنے کے لیے تھوک نگل رہا تھا۔

''ان کی مدد کیجیے گا... روپے پیسے کے بارے میں مت سوچیے گا۔ میرا فون نمبر لے لیں جب، جب میری ضرورت پڑی میں آجاؤں گا...'' ارزش نے پولیس والوں سے کہا۔

باپ نے زردی مائل بھیگی آنکھوں سے ارزش کو دیکھا۔

''آپ کی مدد سے میرا علی اصغر تو واپس نہیں آئے گا...''

ارزش نے ایک لمحے کو خاموش رہ کر اپنی سانس کو درست کیا اور سوچا کہ ایسا کیا کہے کیا الفاظ ادا کرے کہ باپ کے کمزور دل کو چوٹ نہ پہنچے۔

''آپ تو جانتے ہیں پولیس کے معاملات میں کچہریوں میں کتنا روپیہ پیسہ لگ جاتا ہے میرا (اس نے اگلا جملہ کہنے سے پہلے ایک لمحے کو گہری سانس لی) بیٹا بھی کل سے نہیں مل رہا...... میں آپ کا درد بلکہ آپ بھی میرا درد جان سکتے ہیں، بچے کی ماں بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ جب ہوش آتا ہے پوچھتی ہے...... خیر بچے کے قاتل تک پہنچنے اور اس کی سزا کے لیے جو بھی خرچہ ہوگا، میں دوں گا......''

باپ نے آسمان کو دیکھا اور بلندیوں میں اس خدا کو پکارا جس نے اس کی دعائیں نہیں سنی تھیں مگر وہ پھر بھی اس خدا سے مدد مانگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔

''یا اللہ اس باپ نوں ایدھا بچہ مل جائے...... جیدا...... میرے علی اصغر جیا سیں۔''

ارزش اور دانیال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ گاڑی کی طرف جارہے تھے تو ارزش کے موبائل پر کال آئی۔ دانیال بھی چونکا اسے یقین تھا کال نین کی ہوگی لیکن وہ صدف کی کال تھی۔

''جی صدف......'' ارزش نے کہا۔

''وہ......'' صدف کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''خضر نہیں تھا......'' ارزش نے آہستہ سے کہا۔

''اللہ تیرا لاکھ، لاکھ شکر ہے......'' صدف نے لمبی گہری سانس لے کر شکر ادا کیا۔

''اس بچے کے والدین بھی آئے ہوئے تھے۔'' ارزش نے عام سے لہجے میں کہا۔ صدف کو لفظوں کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔

''اوہ...... وہ تو بہت پریشان ہوں گے۔''

''پریشان...... بہت چھوٹا اور بے معنی سا لفظ ہے...... نین کیسی ہے؟'' دانیال کے کان کھڑے ہوئے۔
''بار، بار خضر کا پوچھ رہی ہے۔ میں دلاسا دے، دے کر تھک چکی ہوں۔''
''ہوں......'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''بس آ رہے ہیں۔'' ارزش نے کہہ کر فون بند کر دیا۔
گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ارزش نے دانیال کو دیکھا۔
''آپ میرے ساتھ چلیں گے یا......؟''
''میں سوچ رہا تھا تھانے جاتا ہوں اور کارروائی کو آگے بڑھاتا ہوں۔''
''اوکے، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا......''
''نہیں، میرے پاس ہے گاڑی۔'' دونوں نے سنجیدگی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
ارزش ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ پھر سے کال آ گئی۔ ارزش نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی اور فون ریسیو کیا۔
ابھی اس نے ہیلو بھی نہیں کہا تھا کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔
''تم یقیناً اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں جاتا نہیں دیکھ سکتے ہو گے۔''
''کون ہو تم......؟'' ارزش یک دم چیخا۔
''میں...... تم مجھے نہیں جانتے لیکن تمہاری بیوی جانتی ہے۔''
ارزش نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔
''تم چاہتے کیا ہو......؟''
''لڑکیوں کا اسکول بند کرا دو......''
''بات واضح کرو...... میرے بیٹے کی موت اور زندگی کا تعلق لڑکیوں کے اسکول سے کیسے ہو سکتا ہے؟''
''تمہاری بیوی کو ہم نے کہا بھی تھا کہ اس زمین پر اسکول نہیں بنے گا...... وہ نہیں مانی......''
''تو بھائی...... طریقے سے بات کرو...... ہم اسکول کہیں اور شفٹ کر دیتے ہیں...... بچے کو اغوا کرنے سے کیا مسئلہ حل ہو جائے گا......''
''سنو بے شک تم باہر سے پڑھ کر آئے ہو گے لیکن مجھے پٹیاں پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں...... اسکول بند کرو...... بلکہ ملیا میٹ کر دو اور آئندہ کبھی لڑکیوں کے اسکول کا نام بھی مت لینا۔''
''مگر کیوں؟'' ارزش بے ساختہ بول پڑا۔
''کیونکہ چوہدری صاحب کہتے ہیں تمہاری بیوی جیسی دو چار اور عورتیں گاؤں میں ہو گئیں تو مردوں کو غلام کر لیں گی۔ ہمارے ہاں مرد غلام نہیں کیے جاتے......'' ارزش نے سر پکڑ لیا۔
''اچھا میری بات سنو...... تم خضر کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے...... اگر اسے کچھ ہوا تو تمہارا چوہدری بچے گا نہ ہی تم...... سمجھے......'' دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔
ارزش نے فوراً دانیال کو فون ملا کر پوری بات بتائی۔ وہ پولیس اسٹیشن کے راستے میں تھا۔ دانیال کو بات بتا کر اس نے ایک نمبر ملایا۔
''ہیلو......'' دوسری طرف سے آواز آئی۔
''السلام علیکم میں ارزش احمد بات کر رہا ہوں اور مجھے......''
''ارے ارزش احمد...... بھگوڑا......'' دوسری طرف سے ہنستی ہوئی آواز آئی۔
''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

افواہوں کے مہلک اثرات

''انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ کوئی بات کسی سے سن کر تصدیق کیے بغیر آگے بیان کر دے۔'' (الحدیث)
موجودہ دور میں جو، جو برائیاں اور منفی قدریں رواج پا رہی ہیں، یہ صالح معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں، یاد رہے کہ من گھڑت اور جھوٹی باتیں نہ صرف دنیاوی اعتبار سے جرم ہیں بلکہ آخرت میں بھی ان کی پاداش میں سخت ترین سزائیں ملیں گی۔
عہدِ نبویؐ میں افواہیں پھیلانے کا کام منافقین کرتے تھے جو ملتِ اسلامیہ کے خیر خواہ نہیں تھے۔ وہ ہر دم اس تاک میں رہتے کہ انہیں کوئی موقع ملے تو وہ ملتِ اسلامیہ پر بھرپور وار کر دیں۔ یہ گروہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانے کے لیے من گھڑت باتیں بناتے تھے۔ قرآن پاک میں اس کا سدِباب کرنے کے لیے مسلمانوں کو یہ حکم ملا کہ اس قسم کی غیر مصدقہ خبر سنیں تو اس کا اچھی طرح جائزہ لیں اور درست حالات سے عوام الناس کو آگاہ و باخبر رکھیں۔
ارشادِ نبویؐ ہے۔ ''گناہ کے لیے یہ بات کافی ہے کہ انسان سنی سنائی بات بیان کرے۔'' قرآن صالح معاشرے کے لیے جہاں ضروری ہدایات دیتا ہے وہاں ایسی بات کو بھی قطع کرتا ہے جو ایک اسلامی ریاست کے پُرامن اور پُرسکون ماحول میں بگاڑ پیدا کر سکتی ہے۔
سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے کہ ''جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور آیات متشابہات کی (اپنی خواہش کے مطابق) تاویلیں کریں۔'' اخلاقی پہلو سے غور کریں تو افواہیں پھیلانا انتہائی گھٹیا اور مذموم حرکت ہے۔ افواہیں پھیلانے میں جن عوامل کا سہارا لیا جاتا ہے، ان میں جھوٹ، تہمت اور کردار کشی جیسی غیر اخلاقی حرکات بذاتِ خود قبیح ہیں۔ پس قرآن و سنت کی روشنی سے وضاحت ہوئی کہ افواہیں پھیلانا بہت بڑا گناہ ہے اور ان پر یقین کر لینا ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

''ابے میں ہوں تیرا اکیڈمی فیلو...... راشد یاد نہیں......''
راشد نامی شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔
ارزش نے ذہن پر زور دیا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کی یادداشت خراب یا کمزور تھی۔ وہ جن حالات سے گزر رہا تھا وہ بہت عجیب تھے۔
''اچھا چل چھوڑ کام بتا......'' راشد نے کہا۔
''ایک نمبر ٹریس کرنا ہے...... اصل میں، میرا بیٹا اغوا ہو گیا ہے۔'' ارزش نے کہا۔
''یونہی نہیں کہتے کہ محبت پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔'' راشد نے کہا۔
بالکل اچانک ارزش کے دماغ میں یہ جملہ گونجا اسے اکیڈمی کی وہ شام یاد آ گئی جب تمام دوست یار بیٹھ کر محبت کے موضوع پر بحث کر رہے تھے۔
''اوہ ...... راشد خان......؟'' ارزش نے سوالیہ سے انداز میں کہا۔
''شکر ہے تجھے یاد آیا۔''
''اصل میں بیٹے کی گمشدگی نے سب کچھ بھلا دیا۔''
''سوری یار اب بتا کہ ہوا کیا ہے؟''
ارزش نے مختصراً سارا احوال بیان کیا اور کچھ دیر پہلے والی گفتگو کا بھی بتا دیا...... تاکہ کال ٹریس کی جا سکے کہ کہاں سے بیٹھ کر مجرم بات کر رہا تھا۔
''آ سکتے ہو......؟'' راشد نے پوچھا۔

محبوب کھڑا ہو...... اس کا ارزش احمد...... مگر سنا ہے اب معجزے نہیں ہوتے۔

نیلی سمندری آنکھوں والی نے آسمان کو دیکھا اور سسکی۔

"اے پاک رب معجزہ نہیں تو کوئی کرامت ہی کر دے میرے محبوب کو مجھ سے ملا دے...... مجھ سے اس کے بغیر رہا نہیں جاتا...... سانس سینے میں اٹکی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔"

یک دم سارے منظر دھندلا گئے...... زلیخا نے پلکیں جھپکیں۔

☆☆☆

ارزش اور راشد دونوں تھانے کی بلڈنگ کے سامنے کھڑے تھے۔ ارزش بے تابی سے اندر داخل ہوا۔

خضر کو دیکھ کر ارزش کی سانس رک گئی۔ رو، رو کر اس کا چہرہ میلا ہو چکا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں۔ جانے انہوں نے اسے کچھ کھانا بھی کھلایا تھا کہ نہیں...... ارزش کو دیکھتے ہی خضر نے بازو پھیلا دیے۔

"بابا......"

ارزش کو پھر ہوش نہ رہا۔ دل میں اٹھتے محبت کے طوفان کو اس نے پہلی بار محسوس کیا۔ وہ تو محبت کو پیروں کی زنجیر سمجھا کرتا تھا۔

راشد دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی مگر ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

خضر کی آنکھیں نیم وا ہو رہی تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔

"راشد لگتا ہے خضر دو دن سے بھوکا ہے، اس کا چہرہ دیکھو کیسا زرد ہو رہا ہے۔"

"ارزش چلو پہلے اسپتال چلتے ہیں ہری اپ...... باقی کے معاملات بعد میں دیکھ لیں گے۔"

ارزش نے کچھ نہیں کہا بس خضر کو گود میں اٹھائے، اٹھائے راشد کی کار میں بیٹھ گیا...... اس کی جذباتی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ وہ ڈرائیو کر پاتا اس نے فون جیب سے نکالا اور صدف کو کال ملائی۔

"ہیلو...... خضر مل گیا ہے۔ وہ بیہوش ہے میں اسے لے کر اسپتال جا رہا ہوں......"

اس نے اتنا کہہ کر کال بند کر دی اس وقت اسے سوائے خضر کے کسی کی پروا نہیں تھی۔

صدف نے بے ساختہ نین کو گلے سے لگا لیا۔ بانو بی بھی وہیں تھیں، سبحان بابا دروازے کے پاس تھے۔

صدف انہیں بتا رہی تھی کہ "خضر مل گیا ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہے ارزش بھائی اس کو لے کر آ رہے ہیں تھوڑی دیر میں......"

صدف نے جان بوجھ کر ایسا کہا...... وہ نہیں چاہتی تھی کہ نین کسی وسوسے میں پڑ کے پھر سے ہوش گنوا دے۔

"ہمارے خضر کو کسی نے برا بھلا...... میرے منہ میں خاک کچھ کہا تو نہیں......؟"

"نہیں......"

"اسے کسی نے اغوا کیوں کیا تھا؟" نین نے اپنی بے چینی کو زبان دی۔

"یہ تو ارزش بھائی ہی بتا سکتے ہیں، وہ آتے ہیں تو ان سے خود تفصیل پوچھ لینا...... میں ذرا میاں صاحب کو بتا دوں......"

صدف نے خوش ہو کر کہا...... میاں کو فون کیا اور دانیال کو بھی جانے کیوں بے ساختہ اس کا نمبر ڈائل ہو گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوچ رہی تھی دانیال پریشان ہوگا۔ دانیال نے پہلے ہی تھانے جا کر اپنی طرف سے کارروائی ڈلوا دی تھی۔ راشد کی کال تو بعد میں گئی تھی دانیال ڈیری فارم سے پہنچ گیا تھا۔

دانیال نے فون بند کرتے ہی ارزش کو کال ملا دی، ارزش اسپتال پہنچ چکا تھا۔

دانیال کی کال پر اس نے حیران ہو کر فون اٹھایا کہ اس کو میں نے تو بتایا نہیں تو کیا نین نے بتا دیا؟

"میں اسپتال میں ہوں......" ارزش نے بتایا۔

"وہ صدف کی کال آئی تو اس نے بتایا کہ خضر مل گیا ہے لیکن اس نے یہ تو نہیں بتایا کہ آپ اسپتال میں ہیں...... مگر کیوں......؟" دانیال نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں نے ابھی گھر پر کسی کو خضر کی طبیعت کے بارے میں نہیں بتایا۔ نین پہلے ہی حواس میں نہیں ہے، خضر کی طبیعت کا سن کر اور پریشان ہو جاتی۔"

ارزش کے دل سے جیسے منجر کا نام سنتے ہی بھاری پتھر ہٹا...... جانے کیوں اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ نین سوائے اس کے کسی کو نہ چاہے نہ کسی سے بات کرے، نہ کسی کے بارے میں سوچے۔

بے خبر ارزش بلکہ بدنصیب ارزش یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ نین تارہ تو وہ لڑکی تھی جس نے سوائے ارزش کے کسی کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔

"میں اسپتال آ سکتا ہوں......؟" دانیال نے جس طرح سے اجازت مانگی ارزش سے انکار نہ ہوا۔

خضر کو ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

ایک، ایک قطرہ بہت آہستہ، آہستہ ڈرپ سے خضر کی نازک نسوں میں اتر رہا تھا۔

ارزش سوچنا چاہتا تھا کہ جانے خضر میرا بیٹا ہے یا نہیں لیکن وہ نین پر شک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی پاک دامنی اس کے شفاف چہرے اور اس کی کشادہ پیشانی اور اجلی آنکھوں سے واضح تھی۔ اس کی پاک دامنی پورے گاؤں کے لوگوں کی گواہی سے ثابت تھی۔ خضر کا چہرہ باؤ جی سے مشابہ تھا۔ اس کا احساس ارزش کو اس وقت ہوا جب وہ پلک جھپکے بغیر خضر کو دیکھ رہا تھا۔ بہت متانت تھی اس کے ننھے چہرے پر، وہ اپنی عمر جیسا شوخ نہیں تھا۔ اس عمر میں تو بچے شرارتی ہی بہت ہوتے ہیں۔ ارزش بہت ساری سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔

دانیال آ چکا تھا۔ اس نے ارزش کو ڈسٹرب کیا نہ ہی خضر کے پاس گیا، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے دروازے پر کھڑا تھا۔

"بابا!" خضر نے آنکھیں کھولیں اور آواز دی۔

ارزش کو اس وقت خضر کی آواز دنیا کی سب سے پیاری آواز لگی۔

"بابا......" ارزش کو خود پر اختیار ہی نہ رہا۔ رو دیا۔

دانیال ڈیوٹی ڈاکٹر کو بلا لایا۔

ڈاکٹر نے ارزش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا۔

"شکر کیجیے بیٹے کو ہوش آ گیا ہے۔"

خضر نے ارزش کو دیکھا اور اٹھنا چاہا۔ ارزش لپک کر اس کے پاس آ گیا۔ خضر کو گلے سے لگا کر کافی دیر تک اس گرمی کو محسوس کرتا رہا جو اولاد کے گلے سے لگانے پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ گرمی جو اسے باؤ جی سے چاہیے تھی۔ وہ گرمی جو بے جی کی گود میں تھی۔

"ہم گھر جا سکتے ہیں؟" ارزش نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

ڈاکٹر نے کچھ دیر اور رکنے کو کہا۔

ارزش کو بار، بار نین کا خیال آ رہا تھا۔

"دانیال!" کچھ سوچ کر ارزش نے دانیال کو آواز دی اور نین کو اسپتال لانے کی درخواست کی۔

''پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگی...... اسے لے آؤ تاکہ اسے کچھ سکون آجائے......''
دانیال تابعداری کے انداز میں فوراً چلا گیا۔ وہ راستے بھر ارزش کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک وہ ارزش، لندن میں تھا اور ماں، باپ کے مرنے پر بھی نہیں آیا اور ایک یہ ارزش جو احساس کا سمندر بنا ہوا ہے۔ وہ کس ارزش کا یقین کرے، وہ آنسو جو وہ خضر کی وجہ سے بہا رہا تھا کسی طرح بھی جھوٹے نہیں لگ رہے تھے۔ اور اب جو اس نے نین کو بلانے کے لیے اسے بھیجا ہے، وہ سوچتا رہا۔
صدف حویلی میں ہی تھی۔ دانیال نے اسے بلا کر خضر کے بارے میں بتایا صدف پریشان ہوگئی۔
''سب ٹھیک تو ہے ناں......؟''
''ہاں خضر، بالکل ٹھیک ہے لیکن ڈاکٹر کچھ دیر اسے اور اسپتال میں رکھنا چاہتے ہیں۔''
''اچھا میں نین کو لے کر آتی ہوں......''
نین بے تابی سے باہر نکلی...... بانو بی اس کی چادر لیے، لیے اس کے پیچھے چلی آئیں، صدف نے چادر پکڑی، گول کمرے میں دانیال کو دیکھ کر نین کا دل بیٹھنے لگا۔
''خضر بالکل ٹھیک ہے۔''
''تو آیا کیوں نہیں......؟'' نین نے بے تابی سے پوچھا۔
''وہ جب ارزش صاحب کو ملا تو کچھ نڈھال تھا ارزش صاحب کو فکر ہوئی کہ کوئی مسئلہ نہ ہو سو اسے اسپتال لے گئے۔ آپ چلیں سب خیر ہے...... سبحان بابا......'' اس نے سبحان بابا کی طرف رخ کر کے کہا۔
''آپ صدقے کا اہتمام کریں ماشاءاللہ خضر میاں بحفاظت گھر آرہے ہیں۔''
سبحان بابا اور بانو بی نے آسمان کی طرف دیکھ کر شکر ادا کیا۔
صدف اور نین اسپتال کے لیے دانیال کے ساتھ چلے تو نین ہی نہیں صدف کے دل میں بھی بہت سے واہمے تھے۔
لیکن وہ اللہ، وہ پاک ذات...... وہ خالق و مالک، وہ زندگیاں دینے والا عظیم ترین ہے۔
خضر کو ارزش کے سینے پر سر رکھے سوتے دیکھا تو دانیال کی آنکھوں میں نمی آگئی...... صدف نے بے ساختہ دانیال کو دیکھا۔ نین رو دی۔ ارزش نے آنکھیں کھول کر سب کو دیکھا نین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
''مبارک ہو...... خضر اب بالکل ٹھیک ہے، ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کل چھٹی مل جائے گی۔''
نین سن ہی کہاں رہی تھی۔ وہ تو خضر کو سینے سے لگا کے کبھی اس کا ماتھا چومتی کبھی گال...... مسلسل گریہ نے اس کے آنسو بھی خشک کر دیے تھے۔ وہ رو تو رہی تھی لیکن آنسو اس درجہ نہیں بہہ رہے تھے۔ ویسے بھی یہ شکر کی گھڑی تھی۔ اور یہ جتنے بھی آنسو تھے سب کے سب شکر کے تھے۔

☆☆☆

سفید حویلی میں دیگوں کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ پورے گاؤں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ خضر کو ساتھ والے گاؤں کے چوہدری نے اغوا کروایا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ چاہتا ہے کہ لڑکیوں کا اسکول بند ہو جائے، وہ تمام لڑکیاں جو اس اسکول میں پڑھتی تھیں پریشان ہوگئیں ابھی اسکول کو کھلے وقت ہی کتنا ہوا تھا۔
حویلی میں صدقہ خیرات کا سلسلہ تھا تو تمام طالبات گروپ کی شکل میں سفید حویلی پہنچ گئیں۔ ارزش وہیں تھا اور ان لڑکیوں کی باتیں بھی سن رہا تھا جو اسکول اور نین کو نجات دہندہ سمجھ رہی تھیں۔
''میں تب تک حوصلے کی دیوار بن کر کھڑی تھی جب تک اکیلی تھی، اب ارزش احمد آگئے ہیں اس بات کا فیصلہ وہی کریں گے۔''
ارزش بری طرح چونکا۔

''آپی اگر انہوں نے منع کر دیا تو؟''
''اسکول بند ہوگیا تو......؟''
''مجھے تو ٹیچر بننا تھا۔''
''مجھے تو ڈاکٹر بننا ہے۔''
''آپی میرا کوئی بھائی نہیں ہے، میں پڑھ لکھ کر بابا کا بازو بننا چاہتی ہوں......''
''یاد رکھنا اللہ تعالیٰ ایک در بند ہوتے ہی دوسرا در کھول دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حالات سے، خواہشات سے کبھی غافل نہیں ہوتا...... مجھے یقین ہے بہت اچھا وقت ہم سب کی راہ دیکھ رہا ہے، بس مایوس مت ہونا......'' نین مسکرائی۔
بچیاں چلی گئیں...... نین بھی گول کمرے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آنے لگی کہ ارزش آگیا۔
''بیٹھو......'' ارزش نے کہا۔ جانے کیوں وہ نین سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔
''تم نے میرا نام کیوں لیا...... جبکہ اب تک سارے کام تم خود کر رہی تھیں۔''
''اس وقت میں اکیلی تھی، مجھے اپنے لیے اور باقی سب کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اب آپ ہیں تو......''
''میری وجہ سے کمزور مت پڑو...... جو فیصلے تم کرتی آئی ہو...... کرتی رہو...... اور جس طرح سے کرتی تھیں اسی طرح سے کرو...... میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مرحلے پر میرا سہارا ڈھونڈو...... اسکول وہ بھی لڑکیوں کا ایک بہت مثبت قدم ہے جو تم نے اٹھایا ہے۔ بچیاں بہت خوش بھی ہیں......''
''مگر اس اسکول کی وجہ سے میرا خضر مجھ سے چھن جاتا تو......؟''
''ایک طرف تو تم درس دیتی ہو کہ مایوس نہیں ہونا دوسری طرف خود مایوسی کی باتیں کرتی ہو...... یہ تو ایمانداری نہ ہوئی۔'' ارزش نے نرمی سے کہا۔
''کیا آپ واپس جانا چاہتے ہیں؟''
ارزش اچانک ہی نین کی زبان سے یہ سن کر پریشان ہوگیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔
''اگر جانا چاہتے ہیں تو میں جیسا آپ کہہ رہے ہیں ویسا کروں گی، ٹھیک ہے اور اگر آپ نے نہیں جانا تو...... سارے فیصلے آپ کو کرنے ہوں گے۔'' نین نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔
ابھی نین کمرے سے نکلی ہی تھی کہ سبحان بابا نے بتایا کہ تھانے سے کوئی ملنے آیا ہے۔
خضر کے ملنے کے بعد پولیس اہلکاروں کا آنا جانا تو ہونا ہی تھا۔ شام کو راشد بھی آگیا...... طے یہ پایا کہ چوہدری کے خلاف ایکشن لیا جائے گا۔ لڑکیوں کا اسکول بند نہیں ہوگا۔
''یہی وجہ تھی جس کے لیے میں نے اپنا گاؤں اپنا ملک چھوڑا......'' رات کھانے کے بعد ارزش نے جھنجلا کر کہا۔
آج پہلا دن تھا اور دن کی بھی رات تھی جب ارزش اور نین دونوں باغ کے اس کونے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جس پر کبھی بے جی بیٹھا کرتی تھیں۔ اور ارزش کے آنے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔
''صرف گاؤں اور ملک ہی نہیں اپنوں کو بھی چھوڑا......''
''ہاں...... چھوڑا...... کیونکہ مجھے یہ سسٹم پسند نہیں تھا۔''
نین کی بات پر ارزش کی آواز بلند ہوئی۔
باغ کے انتہائی کونے پر جہاں سے گھر کا احاطہ شروع ہوتا تھا بانو بی اور سبحان بابا کھڑے تھے۔ گو ان کی توجہ اس طرف نہیں تھی لیکن ارزش کی آواز ان دونوں تک پہنچ گئی تھی۔ اور ان دونوں کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔
''سسٹم کو ٹھیک کرنے کے لیے سسٹم میں رہنا پڑتا ہے...... سسٹم سے بھاگ کر آپ نے کیا ثابت کیا......؟''

بچے کے مسائل، اسباب اور ان کا حل

بچوں کو نشوونما پانے کے لیے مکمل آزادی اور کچھ سہولتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شفقت، محبت اور اتنی آزادی جو بچے کے لیے نقصان دہ نہ ہو اور اردگرد کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے حوصلہ افزائی ضروری چیزیں ہیں، بچپن میں اگر بچے کو بہت زیادہ پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے تو ایسا بچہ بزدل، شرمیلا، خوف زدہ اور دوسری کئی پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے جو ظاہر ہے اس کی آنے والی زندگی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔" (ایک ماہر تعلیم)

ایک عام پڑھنے والا جب "پرابلم چائلڈ" کو ذہن میں لائے گا تو اس سے مراد ایک ایسا بچہ لیا جائے گا جو اپنے والدین کے لیے بہت زیادہ مسائل کھڑے کرتا ہو یا شاید وہ جو بدتمیز، نافرمان یا باغی ہو۔ حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا موضوع ہے جس میں بچے کے رویے سے متعلق کئی خرابیاں شامل ہیں۔ وسیع تر معنوں میں وہ غصے، نافرمانی، ضبط و ضبط اور احساس تحفظ کی، کنارہ کشی، توجہ کی کمی، بے جا خواہشات، انتہاپسندی اور نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتا ہے۔

پروفیسر بی اے ملک کے بقول "نفسیات کی رو سے ایک بچہ اس وقت مسائل زدہ کہلاتا ہے جب وہ اپنی عمر کے دوسرے بچوں سے مختلف رویہ ظاہر کرے یا پھر وہ اس عمر کے بچوں کے لیے طے کردہ اصولوں سے انحراف کرے۔ اگر کوئی بچہ مستقل ایسے رویے کا اظہار نہ کرے تو اسے مسائل زدہ نہیں کہا جاسکتا لیکن اگر کوئی بچہ اکثر اوقات اپنی عمر کے عمومی رویے سے انحراف کرے تو اسی کو ایک پرابلم چائلڈ تصور کیا جائے گا۔

چونکہ ہر معاشرے کے مختلف رسم و رواج ہوتے ہیں اسی لیے جب ہم کسی بچے کا جائزہ لے رہے ہوں تو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کیا وہ اپنی اس سوسائٹی میں موجود خاص رویوں سے انحراف کر رہا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ کسی بھی بچے کے مسائل پر بات کرتے ہوئے ہم تین چیزوں کو خاص طور پر مدنظر رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا بچے کی جانب سے ظاہر کیا جانے والا رویہ شدید اور مستقل نوعیت کا ہے؟ دوسرے کیا وہ رویہ معاشرے کی جانب سے ناپسندیدہ ہے؟ اور اگر ناپسندیدہ ہے تو کیا اہم مسئلہ ہے۔ تیسرے، کیا یہ رویہ بچے کو درست طریقے سے کام کرنے میں رکاوٹ ڈال رہا ہے؟ یہ تین ایسے معیار ہیں جن کی مدد سے طے ہوسکتا ہے کہ کیا یہ بچہ "پرابلم چائلڈ" ہے۔

ذاتی دلچسپی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے

ایک بچے کی کئی جذباتی ضروریات ہوتی ہیں، زندگی کے مختلف حصوں میں مزید ان میں سے محبت، پیار، چاہت، احساس تحفظ، پہچان، والدین اور فیملی کے دوسرے لوگوں کی جانب سے قبولیت کے احساس کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر بچے کو اوپر بیان کی گئی تمام چیزیں مہیا کی جائیں تو وہ ایک عام بچے کی طرح پرورش پائے گا لیکن اسے مستقلاً ان حقوق سے محروم رکھا جائے گا تو اسے مسائل کا سامنا ہوگا اور وہ اپنے والدین کے لیے پریشان کن بچہ بن جائے گا۔ جب ہم گھر کی بات کرتے ہیں تو ہمیں گھر کے افراد کے درمیان تعلقات اور باہمی رویوں کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے، اکثر صورتوں میں بچہ گھر سے ہی مسائل کا شکار ہوتا ہے جہاں والدین اسے مسلسل نظرانداز کرتے ہیں، مثال کے طور پر اسے اپنے ماں، باپ کی جانب سے اصل پیار نہیں مل پاتا... باوجود اس کے اسے تمام دوسری ضروریات مثلاً ٹیوشن فیس، اچھے کپڑے، ٹرانسپورٹ اور جیب خرچ مہیا کیا جارہا ہے لیکن وہ پیار اور محبت ہی نہیں مل پاتا جو اس کی بہتر شخصیت کے لیے ضروری ہے۔ بچے کو اس بات کا احساس دیجیے کہ اس کے والدین صرف اس کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ اسے بھرپور توجہ اور محبت بھی دیتے ہیں۔ بچے کے لیے آپ کی محبت اور شفقت کا لمس بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ ماحول جہاں بچہ پڑھتا رہتا ہے یعنی اسکول اور گھر... اس کے رویے کو متعین کرتا ہے۔ غیرضروری احتیاط، نظرانداز کرنا، حقارت سے دیکھنا، تنقید کرنا، ڈانٹنا، ڈرانا، مارنا، غیرضروری مقابلے بازی جیسے تمام عناصر بچے کو احساس کمتری میں مبتلا کرتے ہیں اور وہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے۔

از: ڈاکٹر نفیسہ آرا صدیقی

"مجھے کچھ ثابت نہیں کرنا" ارزش نے قطعی انداز میں کہا۔

"یہ تو سچ سے بلکہ حقائق سے بھاگنے والی بات ہے۔ حقیقت سے نظر چرانے والی؟" نین نے نرمی سے کہا۔

"نین تم سنبھال رہی ہو... دیکھ رہی ہو، سسٹم سے لڑ رہی ہو سو لڑتی رہو..." ارزش نے قطعی لہجے میں کہا۔

"آپ ساتھ نہیں دیں گے؟"

ارزش نے ایک لمحے کو کچھ سوچا... اس کے ذہن میں زلیخا کا چہرہ روشنی بن کر ابھرا... نین اسے ہی دیکھ رہی تھی بلکہ جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں نے خضر کو اس کے باپ کے تعارف میں ایک لفظ بہت اچھی طرح حفظ کرایا ہے کہ وہ بہت بہادر ہیں...... وہ کسی سے ڈرتے نہیں ہیں، دشمن سے نہ سسٹم سے...... وہ ابھی سسٹم کا مطلب نہیں سمجھتا...... لیکن بڑا ہوگا تو سمجھ جائے گا......"

"تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو......" اس نے بے ساختہ انگریزی میں کہا، جس کا جواب نین نے بھی بہت ٹھنڈے انداز سے انگریزی ہی میں دیا۔

"جو سچ ہے اور جیسا میں نے کہا ہے بتا دیا، آپ تھے نہیں اور اپنے بیٹے کو اس کے والد کی ایک شکل بنا کر دینی تھی۔ اس کا ایسا چہرہ بنا کر دینا تھا جو نہ کوئی مصور ڈرا کرسکتا ہے اور نہ ہی کوئی فوٹوگرافر...... کیمرے میں قید کرسکتا ہے۔"

"مجھے سوچنے کا وقت دو...... کبھی لگتا ہے مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے اور کبھی گاؤں کی مٹی، سفید حویلی کی دہلیز، پیروں کی زنجیر بن جاتی ہے......" ارزش نے گہرے دکھ میں کھو کر کہا۔

"جو شخص سوچنے کا وقت مانگتا ہے سمجھو اس کے پاس کئی راستے ہیں جو بلا سنڈ دینے پر ہو میری طرح وہ سوچتا نہیں......"

ارزش نے ایک لمحے کو نین کو دیکھا اور لمبے، لمبے ڈگ بھرتا اندر چلا گیا۔ نین بیٹھی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں دھند تھی۔ منظر بھی دھندلا گئے، چاند کی کرنیں آنسوؤں نے منتشر کردیں۔

کچھ لوگوں سے اللہ تعالیٰ ان کی انا مانگتا ہے۔

کچھ سے ان کا مال

کچھ سے نفس

کچھ سے جان

کسی سے چاہ

کسی سے ان کی عزت

کچھ صحت ہار دیتے ہیں

کچھ دنیا وار دیتے ہیں

کچھ لوگوں سے خدا تعالیٰ دنیا میں رہنے کی رغبت مانگ لیتا ہے۔ کسی سے ان کا دل

کسی سے ان کی محبت

اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اپنے حساب سے آزماتا ہے...... مگر یہ سب آزمائشیں بندے کو خود سے قریب کرنے کے لیے ہوتی ہیں، نین کی آزمائش کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہورہا تھا۔ کم سے کم اس نے یہی سمجھ لیا تھا۔

"اب میں ارزش کو کیسے سمجھاؤں کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے بیکار نہیں ہے بس ہم کو کچھ علم ہوتا ہے اور کسی، کسی بات پر ہم جان بوجھ کر لاعلمی کا شکار رہتے ہیں، اگر لاعلم رہنے کا فیصلہ ہی کرلیا جائے تو اچھا نہیں ہے اس طرح سے تو

زندگی بیکار ہو جائے گی۔" نین نے اٹھتے، اٹھتے سوچا۔

☆☆☆

ارزش اپنے کمرے میں آیا تو اس کا ذہن بہت بوجھل تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہاں اس کی بہت ضرورت ہے اور پھر جو کچھ چھوڑ کر آیا ہے اس کا بھی خیال آئے جا رہا تھا۔ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا اس نے موبائل پر دیکھا..... زلیخا کا میسج آیا ہوا تھا اور میسج بھی تقریباً دو ڈھائی گھنٹے پہلے..... اس نے کھولا..... حالانکہ زلیخا سامنے نہیں تھی مگر وہ اس بے پروائی پر شرمندہ ہو رہا تھا۔

زلیخا نے لکھا تھا..... "فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے ایسا مشکل عمل جیسے کوئی آگ پر چلتا ہو..... لیکن تم جب بھی فیصلہ کرو اس تدبیر اور تدبر سے کرنا کہ تمہارا فیصلہ مسئلہ سلجھا دے، الجھائے نہیں..... کیونکہ ایک فیصلے میں ایک زندگی نہیں کئی زندگیوں کے فیصلے چھپے ہوتے ہیں..... اور زندگیاں بھی وہ جو خود ہم سے منسلک ہوتی ہیں تو ایسے ظلم سے بچا جو زندگیاں تباہ کر دے..... کسی کا دل توڑ دے کسی کو جیتے جی مار دے۔

زلیخا"

ارزش نے ایک بار نہیں کئی بار زلیخا کا یہ میسج پڑھا۔

کتنی ہی دیر وہ سر پکڑ کے بیٹھا رہا۔

اس سے رہا نہ گیا تو اس نے اسماعیل کو کال ملا دی..... اور ساری کہانی بھی کہہ سنائی۔ کہانی کیا اس کی زندگی کا سچ تھا۔ ایسا سچ جو اس کو جینے دے رہا تھا نہ مرنے..... سکون تھا نہ قرار..... دو کشتیوں پر سوار بھی کبھی ساحل تک پہنچے ہیں؟ وہ اب سمجھنے لگا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو..... ؟"

"میں نہ زلیخا کو ہرٹ کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی نین کو اور خضر..... یار خضر مجھ سے بہت محبت کرتا ہے، مجھے کوئی سپر مین قسم کی شے سمجھتا ہے۔"

"ہماری مشرقی ماں، وہ باپ کو ایسے پیش کرتی ہے کہ بچہ غلطی سے بھی غلطی کرنے کا نہیں سوچ سکتا....."

اسماعیل نے ایک لمبی آہ بھری۔

"میری مان تو باپ بن جا..... ایک بار تو نے اپنی مانی تھی اس بار وقت کی مان لے....." اسماعیل نے صلاح دی۔

"اور زلیخا ..... ؟" ارزش نے پریشانی سے کہا۔

"اگر وہ مسلمان نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں..... لیکن وہ میری وجہ سے مسلمان ہوئی ہے صرف میری خاطر....."

ارزش بے چین ہو رہا تھا۔

"وہ کیا سوچے گی مسلمان زبان کے اتنے کچے ہوتے ہیں۔" اسماعیل ہنس دیا۔

"تو مسلم کی اتنی فکر اور شرعی رشتوں کی کوئی پروا نہیں....."

"تو، تو مجھے شرمندہ نہ کر....." ارزش نے پہلو بدلا۔

"اچھا ایک بات کر، دونوں کو اپنے حالات بتا دے..... زلیخا کو بھی اور نین تارہ کو بھی ..... اور دیکھو وہ کیا کہتی ہیں....."

اسماعیل کی بات میں دم تھا لیکن ارزش خود میں اتنا دم محسوس نہیں کر رہا تھا کہ ان سے بات کرے۔

یہ اور بات کے دروازے پر کھڑی نین نے ساری باتیں سن لیں..... وہ تو یہ ہی کہنے آرہی تھی کہ خود کو مت آزماؤ جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ..... لیکن یہاں دروازے پر آکر اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ دا

دبے پاؤں واپس چلی گئی تھی۔

اسے بتنا دکھ تھا جس طرح سے اس کا دل ٹوٹا تھا وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس وقت وہ ایک نئی آزمائش کے ساتھ اپنے کمرے میں جا کر اللہ سے سوال جواب کرنا چاہ رہی تھی۔ ضبط کرتی لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی کمرے تک آئی۔

خضر سو رہا تھا..... لمبی، لمبی سانس لے کر دکھ کی کڑوی گولی حلق سے گرتے آنسوؤں کے ساتھ نگل کر پانی کا گلاس پی کر بھی چین نہ آیا تو اس نے اٹھ کر وضو کیا..... اور جائے حاجت کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"اے میرے پاک پروردگار دعا تو ہر آنے والی مصیبت کو ٹال دیتی ہے تو پھر مجھے دعا کا سائبان دے، دے۔ میں ٹوٹنا نہیں چاہتی۔ اگر میں ٹوٹی تو ایک ماں ہار جائے گی۔ مجھے سرخرو رہنا ہے۔ دعا بھی دین کا ستون ہے۔ دعا ہی مومن کا ہتھیار ہے تو مجھے اس ہتھیار کے ذریعے راہ نجات دکھا دے۔ اے میرے رب دعا روشنی ہے تو پھر آنے والا وقت روشن کر دے۔"

نین نے ہاتھ چہرے پر پھیرے تو اسے احساس ہوا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس وقت صبر ہی اس کا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار ہے۔ لیکن صبر کے کچھ گھونٹ اتنے کڑوے ہوتے ہیں کہ پوری زندگی کی مٹھاس چھین لیتے ہیں۔

☆☆☆

ارزش نے زلیخا کو جواب میں بہت کچھ لکھنا چاہا لیکن ہر بار لکھ کر مٹاتا رہا..... اور آخر میں یہ سوچا کہ وہ کال کر کے ہی بات کرے گا۔

صبح معمول کے مطابق حویلی میں سب اٹھ چکے تھے۔ ارزش ناشتے کے لیے میز پر آیا تو وہاں نین تھی اور نہ ہی خضر، سبحان بابا موجود تھے۔

"کیا بات ہے ناشتے پر کوئی نہیں، میرا مطلب ہے نین آئی نہیں ابھی تک ... ؟"

"وہ خضر میاں کے ساتھ ہیں....." سبحان بابا نے بتایا۔

"خضر کی طبیعت ٹھیک ہے ناں .....؟"

اس نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی پلٹ گیا۔ خضر جاگ چکا تھا۔ دروازے پر دستک دے کر ارزش نے اپنے آنے کی اطلاع دی۔

"آپ ..... ؟" نین نے نظر ملائے بغیر کہا۔

"ہاں ناشتے پر تم تھیں نہ خضر تو یہیں چلا آیا۔"

بانو بی کھڑی مسکرا رہی تھیں وہ ارزش کی بے تابی کو اس کی نین محبت سمجھ رہی تھیں۔

"آپ ناشتا کریں ہم آجائیں گے ..... خضر کچھ سست ہے تو....."

"بانو بی....." ارزش نے نین کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بانو بی کو آواز دی..... "ہم تینوں کا ناشتا یہیں لا دیں، آج ہم یہاں اپنے بیٹے کے پاس ناشتا کریں گے۔"

بانو بی خوشی، خوشی "ابھی لاتی ہوں بیٹا۔" کہہ کر چلی گئیں۔

خضر اچک کر ارزش کی گود میں بیٹھ گیا۔

اگر رات والی بات نہ سنی ہوتی تو آج نین کے لیے یہ عید کا دن ہوتا۔ ناشتا لگ گیا۔ کھاتے، کھاتے ارزش نے نین کو دیکھا۔

"تم کچھ چپ، چپ سی لگ رہی ہو....."

"ہاں، ہوں چپ چپ....." اس نے سچائی سے کہا۔

"تمہاری عالیہ پھپھو کا فون تھا۔" انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ ویسے اب کیا ہوا ہے؟" علیزے نے مسکرا کر پوچھا۔

"عالیہ کی تو عادت ہے۔ ہر گھر میں فون کر کے خبریں جمع کرنے اور پھر مطلب اور ضرورت کے تحت یہاں سے وہاں پھیلانے کی۔" فرح نے ناگواری سے کہا۔ ان کا تعلق عورتوں کے اس قبیلے سے تھا، جو بلاوجہ سسرال سے ایک تعصب یا ضد باندھے رکھتے ہیں۔

فرح اپنے سسرالی رشتوں کی چھوٹی سے چھوٹی خامیوں کو فوراً ہائی لائٹ کرتیں اور خوبیوں کو صبر کے کڑوے گھونٹ کی طرح پی کر بھولنے کی کوشش میں رہتیں۔ ایک عمر اس طرح گزارنے کے بعد انہوں نے یہ زہر اپنی اولاد کے ذہن میں بھی اتار دیا تھا۔ خاص کر علیزے ماں کی ہر بات کا اثر جلدی لیتی تھی۔ جبکہ علیزے سے بڑی تحریم اور علی خاندانی سیاست سے دور رہنے کی کوشش کرتے۔

"عالیہ پھپھو کی عادت سے کون واقف نہیں ہے۔" علیزے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"واقف تو سب ہی ہیں مگر مجبور ہیں تو ایسے بیٹے بنے ہیں جیسے عالیہ سے زیادہ اچھا اور ہمدرد کوئی ہے ہی نہیں۔ اب بھی محترمہ فون کر کے نئی اطلاع سنا رہی تھیں کہ اسد کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا ہے۔" فرح نے اپنے دل کی اصل جلن کا اظہار کیا تو علیزے چونک گئی۔

"اسد چاچو واپس آ رہے ہیں۔ یہ تو اچھی بات ہے ناں ماما!" علیزے نے خوش ہو کر کہا۔

"ہمیں اسد کراچی میں رہے یا لاہور میں۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تمہاری پھپھو ہمیشہ کی طرح اسد اور شہلا کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ شہلا ایسی، شہلا ویسی... ہمارا کیا تو کسی کو نظر ہی نہیں آتا۔"

ماما نے منہ بنا کر کہا تو علیزے نے سمجھ کر سر ہلایا۔ اس کی ماما کی اپنی دیورانی شہلا سے بھی نہیں بنی تھی۔ وجہ شہلا کی سوبر اور پُروقار شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کا سسرال میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہونا تھا۔ یعنی اپنی دونوں جیٹھانیوں فرح اور عظمیٰ سے زیادہ وہ تعلیم یافتہ تھی اور ایک کالج میں اردو کے لیکچرار کی نوکری بھی کر رہی تھی۔

شہلا سے ایک جانا انجانا حسد اور مقابلہ فرح کو ہمیشہ سے محسوس ہوتا تھا جبکہ عظمیٰ موقع پرست تھی۔ پیٹھ پیچھے چاہے کتنی برائی کر لیتی، منہ پر بہت میٹھی اور اچھی بن جاتی تھی۔ جبکہ دونوں نندیں عالیہ اور فرحانہ بھی شہلا کے اچھے اخلاق اور اعلیٰ طریقوں سے بہت متاثر تھیں۔ فرح چونکہ رشتے اور عمر میں ان سب سے بڑی تھیں، اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ سسرال میں صرف ان کی حکمرانی اور تعریفیں ہوں۔ عظمیٰ کو تو وہ اپنی دبنگ شخصیت کی وجہ سے دبا لیتی مگر شہلا اسے برابر کا چیلنج دیتی۔ اصل میں شہلا اسے چیلنج نہیں کرتی تھی، وہ اپنی فطرت کی وجہ سے خود ایسا سوچ لیتی تھیں۔

"شہلا چچی ویسے تو بہت اچھی ہیں۔ بہت دوستانہ مزاج ہے۔" علیزے نے کچھ سوچ کر انداز میں کہا۔

"ہونہہ! یہ سب طریقے ہوتے ہیں اچھا بننے کے اور اچھا بن کر گھر کی سب باتیں معلوم کرنے کے۔ تم شہلا سے زیادہ باتیں مت کیا کرو۔" ماما نے ہمیشہ کی طرح ہدایت دی تو علیزے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھ سے زیادہ تو تحریم آپی کی ان سے دوستی ہے۔" علیزے نے مسکرا کر کہا۔

"تحریم کی تو ہمیشہ سے اپنے ددھیال والوں سے بہت بنتی ہے۔ اپنے باپ کی لاڈلی جو ہے۔" انہوں نے چڑ کر کہا۔

"جی نہیں! پاپا کی زیادہ لاڈلی میں ہوں۔ تحریم آپی بڑی ہیں ناں۔ اس لیے پاپا ان کی سن لیتے ہیں۔" علیزے نے جلدی سے کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئیں۔ علیزے جانتی تھی کہ آنے والے کئی دن ماما کے اسی طرح گزرنے تھے۔ سسرالی رشتوں سے چڑنے اور ایک فاصلہ رکھنے کے باوجود وہ ان سب کے بارے میں ہر خبر بھی ضرور رکھتی تھیں۔

☆☆☆

اگلے کئی دن تک فرح کا موڈ ایسے ہی خراب رہا۔ جب تک اسد اور شہلا لاہور شفٹ نہیں ہو گئے۔ عظمیٰ سے ملنے والی سب رپورٹس سن سن کر فرح کو مزید غصہ آتا کہ عالیہ اور فرحانہ دونوں اسد اور شہلا کے گھر آئے روز چلی جاتیں اور ان کا گھر سیٹ کروانے میں مدد کریں۔

"ہمارے کسی مسئلے یا کام میں تو کبھی کوئی آگے نہیں آیا۔" ایک دن فرح نے تپ کر عظمیٰ سے کہا تو عظمیٰ نے مزید جلتی پر تیل چھڑکا۔

"تو اور کیا بھابی! شہلا کو تو سب سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اگر اس نے ماسٹرز کیا ہے تو ہم کون سا جاہل ہیں۔" عظمیٰ نے منہ بنا کر کہا۔

"ہونہہ! ماسٹر بھی کس میں کیا! اردو میں---! بھلا اُردو کو کون پوچھتا ہے؟ آج کے زمانے میں سب انگریزی بولنا اور سننا پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے میری علیزے ایم۔ اے انگلش کر رہی ہے۔ فر فر انگریزی بولتی ہے۔" فرح نے اترا کر کہا۔

"ہاں علیزے کا لہجہ شروع سے بہت اچھا رہا ہے۔ میرے بچے بھی انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے ہیں۔ ان کی انگلش کم از کم شہلا کے دونوں بچوں سے اچھی ہی ہو گی۔" عظمیٰ نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"تو اور کیا! میری شادی تو اتنی جلدی ہو گئی تھی۔ میٹرک ہی مشکل کر سکی۔ ورنہ ایم اے اردو کرنا کون سی بڑی بات ہے۔" فرح نے حقارت سے کہا۔

"تو اور کیا! میری شادی بھی ایف۔ اے کے فوراً بعد ہو گئی تھی۔" عظمیٰ نے جلدی سے کہا۔

"ہونہہ! ایف۔ اے کیے بھی پانچ سال گزر گئے تھے۔ تب جا کر رشتہ ہوا تھا۔ مجھے پاگل سمجھ رہی ہے۔" فرح نے تلملا کر دل میں سوچا۔

دوسری طرف عظمیٰ کے بھی کچھ ایسے ہی خیالات تھے۔

"میٹرک بھی پورا نہیں کیا تھا۔ سنا تو یہ ہے کہ

فرح بی بی کو پڑھنے سے زیادہ دلہن بننے کا شوق تھا۔" عظمیٰ نے طنزیہ انداز میں سوچا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم اسد اور شہلا کی دعوت کرو گی؟ علیزے کے پاپا تو بہت کہہ رہے ہیں مگر میں نے منع کر دیا۔" فرح نے منہ بنا کر کہا۔

"توبہ کریں! اتنا فالتو کا وقت نہیں۔ بچوں کے امتحان ہو رہے ہیں۔" عظمیٰ نے جلدی سے کہا۔

"ربل کے لیے کوئی ٹیچر لی؟ تم بتا رہی تھیں کہ اسے پڑھنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ تم نے علیزے کو پڑھانے کے لیے کہا تھا مگر اس کی اپنی مصروفیت بہت ہیں۔ ایم اے انگلش کرنا کون سا آسان ہوتا ہے۔" فرح نے اترا کر کہا۔

"خیر انگلش تو میرے بچوں کی بھی بہت اچھی ہے۔ ربل اور حسن کی اردو بہت کمزور ہے۔ لکھنے میں مشکل ہوتی ہے ویسے ایک ٹیچر آتی ہے پڑھانے۔ امید ہے کہ کچھ بہتری تو آئے گی۔" عظمیٰ نے منہ بنا کر کہا تو فرح طنزیہ مسکرانے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد دونوں نے فون بند کر دیا۔

"بہت ہی بددماغ عورت ہے۔"

عظمیٰ نے شہلا کا نمبر ملاتے ہوئے فرح کے بارے میں خود کلامی کی۔ وہ شہلا کی نرم آواز سنتے ہی شہد جیسے لہجے میں بات کرنے لگی۔ عظمیٰ کو دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اسی میٹھی زبان سے وہ زہر گھول رہی تھی۔

☆☆☆

"یہ ہفتہ تو اسد اور شہلا کا دعوتوں میں گزر جائے گا۔ کل عظمیٰ نے انہیں کھانے پر بلایا ہے۔ دو دن بعد فرحانہ نے۔"

عالیہ نے فون پر فرح کو بتایا تو فرح، عظمیٰ کی چالاکی پر حیران رہ گئیں۔

"یہ عظمیٰ ہمیشہ سے ایسی ہی ہے۔ اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ۔" فرح نے تپ کر سوچا۔

"آپ اپنی لاڈلی بھابی کی دعوت نہیں کریں گی؟"

فرح نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''نہیں!'' عالیہ نے اطمینان سے کہا تو فرح حیران رہ گئی۔
''حیرت ہے۔ ورنہ آپ تو سب سے پہلے دعوت کرتی ہیں۔'' فرح نے کہا تو عالیہ ہنس پڑی۔
''اس لیے کہ میں اپنی تینوں بھابیوں اور فرحانہ کو اگلے اتوار کو کھانے پر بلا رہی ہوں۔ کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ ہم سب بہن بھائی اکٹھے نہیں ہوئے۔ اس لیے سوچا کہ اسد اور شہلا کے بہانے باقی سب کو بھی مدعو کر لوں۔'' عالیہ نے مسکرا کر کہا۔
''جی ویسے تو آپ کو کبھی ہمارا خیال نہیں آتا ناں۔'' فرح نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''تمہیں جب بھی دعوت کو کہا ہے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر منع کر دیتی ہو۔'' عالیہ نے گہری سانس لے کر کہا۔
''جبکہ ایک حدیث شریف ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔
پوچھا گیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ کون سے حقوق ہیں؟
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
''جب بھی کسی مسلمان سے ملو تو اس کو سلام کرو، جب وہ دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کرو۔ جب وہ تم سے نصیحت طلب کرے تو اس کو اچھی نصیحت کرو، جب وہ چھینک کے بعد الحمدللہ کہے تو اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہو اور جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کو جاؤ اور جب وہ فوت ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ میں جاؤ۔'' (صحیح مسلم)
عالیہ نے نرمی سے حدیث سنائی تو فرح شرمندہ ہو گئیں۔
''ارے ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تم چاہے بلاؤ یا نہیں۔ ہم تو ضرور آئیں گے۔'' فرح نے جلدی سے کہا تو عالیہ مسکرا دی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔
''یہ عظمیٰ تو بہت چالاک نکلی! مجھے کچھ کہا اور اچھا بننے کے لیے فوراً دعوت رکھ لی۔''
فرح نے کچھ سوچا اور پھر دو دن بعد شہلا اور اسد کو رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ فرح پیچھے کیسے رہ سکتی تھیں۔
☆☆☆
''اسد چاچو! آپ تو پہلے کی طرف اسمارٹ ہیں۔ شہلا چاچی نے تھوڑا وزن گین کر لیا ہے۔''
علیزے نے میٹھا سرو کرتے ہوئے کہا تو شہلا ہنس پڑی۔
''تم نے ٹھیک کہا۔ میرا وزن تین کلو بڑھ گیا ہے۔ تھوڑی بے پروائی ہے۔ ان شاء اللہ جلد کنٹرول کر لوں گی۔'' شہلا نے مسکرا کر کہا۔
''صرف تین کلو پر اتنی پریشانی! ہماری بیوی کا تو کئی کلو بڑھ گیا ہے مگر کوئی فکر ہی نہیں۔''
سلیمان نے مسکرا کر فرح کو دیکھا تو سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ فرح کا چہرہ سرخ ہو گیا جبکہ علیزے نے سب کو ہاں پر ہنستے دیکھا تو اسے برا لگا۔
''شہلا تمہاری جاب کا کیا بنا؟'' سلیمان نے مسکرا کر پوچھا۔
''سلیمان بھائی! (فلاں) کالج میں انٹرویو تو دیا ہے۔ امید ہے کہ بات بن جائے گی۔'' شہلا نے نرمی سے کہا۔
''بھئی اردو کی ٹیچرز کی کیا وقعت ہے۔ علیزے کو تو ابھی سے اتنے بڑے اداروں سے جابز کی آفرز آ رہی ہیں۔'' فرح نے جلدی سے کہا۔
''علیزے بیٹی! آپ کا کون سا سمسٹر ہے؟''
اسد نے متاثر انداز میں پوچھا تو علیزے فوراً پاس آ کر اسد چاچو سے منہ بگاڑ بگاڑ کر انگلش میں بات کرنے لگی۔ شہلا نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر نظر انداز کر کے فرح سے باتیں کرنے لگی۔ علیزے نے انگلش بولتے ہوئے کئی بار شہلا کو دیکھا۔ وہ ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے شہلا ان پڑھ اور ناسمجھ ہے۔ جو اسد اور اس کی بحث میں حصہ نہیں لے پا رہی ہے۔
کچھ دیر کے بعد اسد اور سلیمان باتیں کرنے لگے تو علیزے کا رخ بچوں کی طرف ہو گیا۔ وہ تیرہ سالہ مناہل سے انگلش میں باتیں کرنے لگی۔ مناہل مناسب انداز میں رک رک کر اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی جب علیزے اور فرح عجیب انداز میں ہنسنے لگیں۔
''شہلا! مناہل کی انگلش پر توجہ دو۔ آج کل کے بچے تو فر فر انگلش بولتے ہیں۔''
فرح نے اترا کر کہا تو شہلا نے سر ہلایا جبکہ مناہل کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو گیا تھا۔ دعوت ختم ہوتے ہی وہ گھر چلے گئے تو فرح نے علیزے کو سراہا۔
''تم نے آج میرا بدلہ شہلا سے لے لیا۔ جب تم اسد سے انگلش میں باتیں کر رہی تھیں تو شہلا کے چہرے کے رنگ دیکھنے والے تھے۔''
فرح نے مذاق اڑایا تو علیزے بھی ہنسنے لگی۔
''ابھی فون کر کے تحریم آپی کو بتاتی ہوں۔'' علیزے نے مسکرا کر کہا۔
''اس وقت کینیڈا میں دن کا وقت ہو گا۔ کر لو کال۔''
فرح نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ تحریم شادی کے بعد سے کینیڈا میں مقیم تھی۔ علیزے نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور موبائل لینے کمرے میں چلی گئی۔ فرح نے کافی عرصے کے بعد آج سکون محسوس کیا تھا شہلا کو اس طرح نیچا دکھا کر۔
☆☆☆
''مناہل! کیا کر رہی ہو؟'' شہلا کمرے میں آئی تو مناہل کو انگلش کی کتاب کھول کر پڑھتے دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔
''ماما! میری انگلش علیزے آپی جیسی کیوں نہیں ہے؟ سچ میں مجھے اتنی شرمندگی ہوئی۔'' مناہل نے اداسی سے کہا۔
''اس میں اداسی والی کیا بات ہے؟ تمہیں علیزے کی سب باتیں سمجھ آ رہی تھیں اور تم اسے جواب بھی دے رہی تھیں ناں!''
شہلا نے سوال کیا تو مناہل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر تمہاری انگلش کمزور کیسے ہوئی؟ علیزے تم سے عمر میں بڑی ہے۔ یونیورسٹی کی طالبہ ہے جبکہ تم ابھی اسکول میں ہو۔ بیٹا ہر چیز وقت اور محنت کے ساتھ، ساتھ بہتر ہو جاتی ہے۔ تم کوشش جاری رکھو۔'' شہلا نے نرمی سے سمجھایا تو منائل نے مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔

مگر علیزے جہاں بھی ملتی، جب بھی ملتی اس کا فوکس منائل کی انگلش کو خراب ثابت کرنا ہوتا تھا۔ ایسا ہی عالیہ کے گھر اس شاندار دعوت میں ہوا۔

علیزے کے اس رویے کی وجہ سے منائل کی شخصیت کا اعتماد کم ہونے لگا۔ اسے انگلش پڑھتے، بولتے ایک عجیب سا ڈر محسوس ہونے لگا۔

وہ نفسیاتی طور پر علیزے کے خوف کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ شہلا کو لاہور کے مشہور کالج میں لیکچرار کی جاب مل گئی۔ یہ سنتے ہی فرح اور علیزے حیران رہ گئیں۔ کچھ دن کے بعد شہلا نے اچھی جاب کی خوشی میں گھر میں شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔

منائل کو دعوت کے دن کا سوچ کر پریشانی ہو رہی تھی کہ علیزے پھر سب کے سامنے اس سے انگلش میں بات کرے گی اور اس کے اٹک کر یا رک کر انگلش بولنے پر مذاق اڑائے گی اور فرح تائی کئی دن تک پورے خاندان میں فون کر کر کے منائل کے کند ذہن اور نالائق ہونے کا ذکر کریں گی۔

''مما میں دعوت والے دن نانو کے گھر چلی جاؤں گی۔'' دعوت سے ایک دن پہلے منائل نے کہا تو شہلا نے چونک کر اس کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔

''کیوں؟'' شہلا نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''دعوت پر علیزے آپی سب کے سامنے پھر انگلش میں مجھ سے سوال جواب کریں گی اور......!'' منائل کہتے ہوئے رو پڑی۔

شہلا نے فوراً اسے گلے سے لگا کر چپ کروایا۔

''بیوقوف لڑکی! یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے۔ کیا میں نے تمہیں یہ سکھایا ہے کہ خطرہ یا مشکل دیکھ کر وہاں سے فرار ہو جاؤ؟''

شہلا نے سوال کیا تو منائل نے نفی میں سر ہلایا۔

''مما! میری انگلش بری نہیں ہے مگر علیزے آپی جیسی اچھی بھی نہیں، میں کیا کروں؟'' اس نے پریشانی سے کہا تو شہلا نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

''تم بس خاموشی سے میرا ساتھ دو۔ باقی سب میں دیکھ لوں گی۔''

شہلا نے مسکرا کر کہا تو وہ حیرانی سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جس پر کچھ کرنے کا عزم جھلک رہا تھا۔

☆☆☆

دعوت بہت شاندار رہی۔ ہر کوئی شہلا کے اتنے اچھے اور مشہور کالج میں جاب ملنے پر حیران ہونے کے ساتھ، ساتھ متاثر بھی تھا اور دعوت کا انتظام بھی بہترین تھا۔ فرح اور علیزے سے شہلا کی اتنی تعریف ہوتے دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ انہیں اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو حسبِ توقع منائل کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔

منائل نے جیسے ہی علیزے کو اپنے پاس آ کر بیٹھتے دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ شہلا یہ دیکھ چکی تھی۔ وہ بھی چوکنی ہو گئی۔

علیزے نے حسبِ عادت منائل کا مذاق اڑانے کے لیے مشکل اور تیز لب و لہجے میں انگلش بولنا شروع کر دی۔ منائل فوراً گھبرا گئی۔ اسی وقت شہلا مسکراتے ہوئے آگے بڑھی اور تحمل سے علیزے کے سوالوں کا جواب دینے لگی۔ شہلا کو اتنی مہارت سے انگلش میں بات کرتا دیکھ کر فرح اور علیزے ہکا بکا رہ گئیں۔ علیزے فوراً چپ کر گئی مگر شہلا آج اسے کچھ سمجھانے کا سوچ چکی تھی۔ اس نے منائل کو اشارہ کیا۔

''منائل! کل تمہارا تقریری مقابلہ ہے ناں! علیزے تمہاری تیاری کروا دے گی۔ کیوں علیزے؟'' شہلا نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی چچی ضرور۔''

علیزے نے فوراً سر ہلایا تو منائل جلدی سے میز پر رکھی اپنی تقریر اٹھا کر لے آئی۔ یہ تقریر علامہ اقبال کے ''نظریۂ خودی'' پر تھی۔ جس میں ان کی شاعری کے کئی حوالے بھی موجود تھے۔ منائل نے لکھی ہوئی تقریر علیزے کو پکڑائی تو وہ چونک گئی۔

''یہ تو اردو میں ہے۔'' علیزے نے حیرانی سے شہلا چچی کی طرف دیکھا۔

''ہاں تو کیا تمہیں اردو پڑھنی نہیں آتی؟''

شہلا نے سنجیدگی سے سوال کیا تو علیزے نے گھبرا کر آس پاس بیٹھے سب لوگوں کو دیکھا۔ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔

''اردو پڑھنا کون سا مشکل کام ہے۔'' فرح نے منہ بنا کر کہا تو علیزے نے تھوک نگل کر ماں کی طرف دیکھا۔ اسے سب سے مشکل یہی کام تو لگتا تھا۔

''علیزے کیا ہوا؟ تقریر پڑھو۔''

شہلا نے مسکرا کر کہا تو علیزے نے اثبات میں سر ہلایا اور تقریر پڑھنا شروع کی۔ ابتدائی چند جملوں کے بعد وہ مشکل الفاظ اور جملوں پر مسلسل اٹکنے لگی۔

''علیزے آپی! یہ لفظ ایسے بولتے ہیں۔ یہ ایسے، اور یہ والا......!''

منائل جس کی اردو بہت اچھی تھی جلدی سے غلط پڑھتی علیزے کی مدد کرنے لگی۔ منائل اپنی سادگی میں اسے درست لفظ بتا رہی تھی مگر علیزے اور فرح کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔

''علیزے! تمہاری اردو اتنی کمزور ہے۔ مجھے تو آج پتا چلا۔'' عظمیٰ نے سب سے پہلے طنز کیا تو علیزے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں تو اپنے بچوں کی خراب اردو پر پریشان تھی مگر شکر ہے کہ سب کا ایک جیسا حال ہے۔'' عظمیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''انگلش میڈیم میں پڑھنے والے زیادہ تر بچوں کی اردو خراب ہی ہوتی ہے۔'' فرح نے فوراً کہا۔

''مگر میرے بچوں کے ساتھ تو ایسا نہیں ہے۔ میرے بچے انگلش بھی اچھی بول لیتے ہیں اور اردو بھی الحمد للہ۔ کیوں علیزے! منائل آپ کے ساتھ انگلش میں بات کر لیتی ہے ناں؟'' شہلا نے مطمئن انداز میں سوال کیا تو علیزے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

علیزے نے جلدی سے کہا۔

''ہاں! یہ بات میں نے بھی اسے سمجھائی تھی کہ علیزے آپی ایم۔ اے انگلش کر رہی ہیں، ابھی تمہارا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔''

شہلا نے سب کے سامنے علیزے کو نرم لہجے میں باتیں سناتے ہوئے کہا تو علیزے نے سر ہلاتے ہوئے مما کی طرف دیکھا۔ جو آج خود حیران تھی کہ شہلا ایسا بھی کر سکتی ہے۔ شہلا نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا۔

''بات صرف اتنی سی ہے کہ زبان چاہے کوئی بھی ہو، اس کی اہمیت اپنی جگہ ہوتی ہے۔ جیسے آج کے زمانے میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے اچھی انگلش بولنا اور لکھنا ضرور آنی چاہیے، بالکل اسی طرح اپنی قومی زبان سے بھی مکمل آگاہی ہونا ضروری ہے۔ بلکہ میرا ماننا تو یہ ہے کہ ہمیں سب زبانیں سیکھنی چاہئیں، سمجھنی چاہئیں۔ ہر زبان کا اپنا حسن ہے، اپنا ذائقہ ہے۔ آپ کا علم چاہے ایک زبان پر مشتمل ہے یا کئی زبانوں پر، اسے کسی کو نیچا دکھانے یا تکبر کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ایسے علم کا کیا فائدہ جو آپ کو علم کی عظمت سمجھانے کے بجائے تکبر کے پہاڑ پر بٹھا کر بونا بنا دے۔ بھلا انسانوں میں بونے کب اچھے لگتے ہیں۔ امید ہے میں اپنی بات اچھی اور صاف اردو میں آپ سب کو سمجھا چکی ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس کا انگلش میں ترجمہ بھی کر سکتی ہوں۔ علیزے کی طرح بہت اعلیٰ نہ سہی پر اپنی بات تو سمجھا ہی لوں گی۔ کیوں علیزے؟''

شہلا نے مسکرا کر علیزے اور فرح کی طرف دیکھا جو نگاہیں چراتے ہوئے سر ہلا رہی تھیں۔ شہلا جانتی تھی کہ اس کا پیغام جن کے لیے تھا، انہیں سمجھ آ گیا ہے۔ وہ مطمئن ہو کر میٹھا سرو کرنے کے لیے اٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کا بنایا خاص میٹھا سب کو ہی بہت پسند آیا۔ بالکل اس کی میٹھی اور مکمل زبان اردو کی طرح......

❁❁❁

منی ناول

قصہ دل

شبینہ گل

دوسرا حصہ

شاہوں کا شاہ عشق ہے، صدر، صدور عشق
دربار دل میں تخت نشیں ہے حضور عشق
صحرا نوردیوں میں کھپاتا ہے قیس کو
کچے گھڑے پہ کرتا ہے دریا عبور عشق
فرہاد تیرے ہاتھوں کا تیشہ بھی تو ہے
شیریں! تجھے بھی کر گیا چودہ، چور عشق

رانجھے تیرا بھی جرم نقط کار عشق ہے
ہیرے! تیرا بھی سارے کا سارا قصور عشق

☆☆☆

بڑی ہی مختصری کہانی تھی محبت کی..... چہرے اور جسم پر جگہ جگہ تشدد کے نشانات اور سر کے زخم پر تین چار ٹانکے لیے محبت اپنے مسخ شدہ چہرے کے ساتھ بیڈ پر

لیٹی نوحہ کناں تھی۔ لب خاموش اور آنکھیں تر بتر......
اسے اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ یہ سب اسی طرح ہوگا۔ وہ بیوقوف تو نہ تھی، انجان بھی نہ تھی...... پھر کیوں خود کو طاقت ور اور چاردن کی محبت کو اتنا زورآور سمجھ بیٹھی تھی جو اس کے فولادی خاندان سے ٹکرا کر پاش، پاش نہ ہوتی۔ اس کے گھر والوں کی طرف سے انکار اور پھر شاہنواز سے نکاح کے منصوبے کے بعد کورٹ میرج کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ بچا تھا نہ فرید کے پاس۔ کیونکہ اس طرح شادی کے لیے تو فرید کے گھر والے بھی نہ مانتے۔ اسی لیے کورٹ میں نکاح کر کے فرید اسے اپنے ساتھ لے گیا جہاں اسے ایک دوست نے عارضی طور پر رہائش فراہم کر دی۔ وہ پاتال میں بھی چلے جاتے تب بھی ثمینہ کے خاندان والوں کے لیے انہیں ڈھونڈ نکالنا ذرا بھی مشکل ثابت نہ ہوتا۔ ثمینہ جانتی تھی اپنے خاندان کے اثر رسوخ کو پھر بھی بیوقوفی کر بیٹھی۔ شاید ہر شخص دوسرے کو بیوقوف سمجھ کر ایسی ہی ایک کوشش ضرور کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے بھی کوشش کر دیکھی۔

اس کی ماں اور چاچی جس دن ہاسٹل پہنچیں اور وہ انہیں وہاں نہ ملی، اس کے اگلے ہی دن اس کے باپ کے کارندوں نے ان دونوں کو گردن سے دبوچ کر ان کے قدموں میں لا گرایا۔ اس کے باپ نے فرید کے آگے طلاق نامہ پھینکا جس پر دستخط کرنے سے فرید نے صاف انکار کر دیا۔ ثمینہ نے بھی پُرزور احتجاج کیا۔ اسے تو اس کے چچا یعنی ماوئی کے باپ نے بندوق کا دستہ مار کر زخمی کر دیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد فرید کو تشدد کا نشانہ بنایا اور کنپٹی پر پستول رکھ کر طلاق نامے پر سائن کروا لیے۔ فرید کو ثمینہ سے لاکھ محبت سہی مگر اس کی خاطر وہ جان نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے خاندان کا واحد وارث تھا۔ اس لیے اس نے اپنی چاردن کی محبت کا گلا گھونٹ دیا اور طلاق نامے پر دستخط کر کے چپ چاپ واپسی کی راہ پر قدم دھر دیے۔ ثمینہ کے سر کے زخم پر ٹانکے لگوا کر اسے واپس اسی حویلی لے جایا گیا جس سے وہ جان چھڑا کر بھاگی ...مگر ناکام رہی تھی۔

یہ بات شاہنواز کے گھر تک نہ پہنچتی، یہ ناممکن تھا لیکن ثمینہ کے باپ حشمت خان نے اپنی بہن جنت بی بی کی منت کر کے اسے بات آگے پھیلانے سے روکا۔ جنت بی بی نے لعن طعن کر کے بچپن کا رشتہ توڑ دیا اور بھائی سے بھی قطع تعلق کر لیا۔ مرد کو عورت کے سامنے ہاتھ جوڑنے پڑے تھے، یہ بات حشمت خان کے لیے تکلیف کا باعث تھی مگر یہ تکلیف دینے والی بھی اس کی اپنی سگی اولاد تھی۔ جنت بی بی کا یہ احسان بہت تھا کہ اس نے خاندان میں ذاتی چپقلش کا بہانہ بنا کر بھتیجی کی عزت بچالی جو ثمینہ خود نہ بچا سکی تھی۔ اس رات پہلی بار ثمینہ نے اپنے باپ اور بھائیوں سے مار کھائی۔ ان کا غصہ بجا تھا جو اتنی آسانی سے اتر بھی نہیں سکتا تھا۔ تھک کر چور ہو جانے تک انہوں نے ثمینہ کو بے دردی سے پیٹا۔ بیلٹ، پائپ، جوتے، چمڑے کا کوڑا...... غرض انہیں جو بھی سخت چیز نظر آتی گئی وہ اٹھا کر اسے مارتے گئے اور ستم بالائے ستم یہ کہ سب کو سختی سے تاکید کر دی کہ اس کے کسی زخم پر...کوئی مرہم لگایا جائے نہ جسم پر ٹکور کی جائے گی۔ اس رات حویلی کے مکینوں نے کھانے کے بجائے ثمینہ کی دلدوز چیخوں سے شکم سیری کی۔ اس رات ثمینہ کے اس عمل سے ان کے خاندان کی لڑکیوں میں بغاوت کا پہلا بیج بویا گیا تھا۔ اسی رات پہلی بار ثمینہ کے ایسے انجام کے باوجود ہر لڑکی نے ایک بار ضرور یہ سوچا تھا کہ بغاوت بھی ممکنات میں سے ہے۔

اور اس رات...... ماوئی خان کی اپنے گھر اور خاندان سے نفرت میں کروڑ گنا اضافہ ہوا تھا۔

☆☆☆

ماوئی ایک ہفتہ خاموشی سے گھر میں بیٹھی رہی۔ اسے لگا کہ اب اسے کالج جانے نہیں دیا جائے گا لیکن کچھ دن بعد حالات معمول پر آگئے اور بے بے نے اس سے کالج جانے کا پوچھا تو وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ اسے یہ خوش فہمی ہرگز نہیں تھی کہ اس کے باپ کو اس پر اعتبار بہت ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے ان کے خاندان کا جو مقام تھا وہی ان کے پیروں میں مصلحت کی بیڑیاں ڈال دیتا تھا۔ اسی مصلحت کے

تب وہ ثمینہ کے کیے کی سزا پورے خاندان کی [illegible] دینے سے قاصر تھے۔ ایک [illegible] کالج چھڑانے کے وہ ہرگز مناسب [illegible] لڑکیوں کو پابند کرنے پر وہ بات کھل جاتی جسے چھپانے رکھنے کی التجا حشمت خان نے جنت بی بی سے بھی کی تھی اور اپنے چھوٹے بھائی رحمت خان سے بھی۔ یوں ماوئی تو ہاسٹل واپس چلی آئی البتہ ثمینہ کے پیروں میں وہی زنجیریں پڑ گئیں۔ ماوئی ہاسٹل پہنچی تو سبھی نے پریشانی اور تشویش کا اظہار کیا۔ فائزہ اور آمنہ سے معلوم ہوا کہ منزہ اس کے لیے بے حد بے چین تھی۔ اسے بے حد افسوس ہوا۔ اپنے مسائل میں الجھے اسے منزہ کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ خیال آتا بھی کیسے، سب کی جان پر جو بنی تھی۔ وہ اسی وقت اپنا سامان رکھ کر منزہ کو کال کرنے وارڈن کے دفتر کی طرف بھاگی۔ دوسری طرف منزہ اس کی آواز سنتے ہی رو پڑی۔

''کہاں چلی گئی تھیں تم؟ بدتمیز، بے وفا... بے مروت لڑکی۔ بات مت کرو مجھ سے۔ اپنا فون نمبر تک نہیں دیا کبھی۔ ویسے خیریت تو تھی ماوئی؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک تھی؟ گھر میں سب خیریت تھی؟ کوئی مسئلہ تو نہیں تھا؟'' لڑتے لڑتے وہ غصہ بھول کر تشویش سے پوچھنے لگی تو ماوئی نے خود کو اس کی محبت اور خلوص کے آگے زیر بار محسوس کیا۔ جھوٹ سچ جوڑ کر کہانی بنائی اور اسے سنا دی۔

''بس کچھ نہ پوچھو منزہ۔ تمہیں تو میں نے بتایا تھا ناں کہ ویک اینڈ پر میری کزن کا نکاح تھا۔ عین وقت پر خدا جانے کس حاسد کی باتوں میں آکر پھپھو نے رشتہ ختم کر دیا۔ سارے خاندان میں میری کزن کی بدنامی جو ہوئی وہ الگ، میرے تایا اور تائی کی طبیعت ایسی بگڑی کہ سب کا دھیان اسی طرف لگ گیا۔ ہم سب اکٹھے ہی تو رہتے ہیں۔ کسی کو اپنے کام کاج کا، پڑھائی کا کچھ ہوش نہ رہا۔ ایسے میں بھلا میں کالج آنے کی بات کیسے کر سکتی تھی۔ اب ذرا حالات کچھ سنبھلے ہیں تو میں آگئی ہوں۔'' کہانی کافی مضبوط تھی، منزہ بہل گئی اور ماوئی نے سکھ کی سانس لی۔ بلاشبہ ان دونوں کی [illegible]

☆☆☆

اگلی صبح وہ [illegible]
سامنے کھڑی تھی [illegible] اور آمنہ [illegible] ہاسٹل میں [illegible] مہذب لڑکی اس نے بھی نہ [illegible] [illegible] بعد بھی خاموشی چھائی رہی، دروازہ [illegible] کوشش نہ کی تو وہ [illegible] دروازہ کھول دیا۔ اس کی حیرت خوشگوار حیرت میں بدل گئی۔ سامنے منزہ کھڑی تھی۔

''ارے تم......'' منزہ نے اسے گلے لگا کر زور سے بھینچ لیا۔

''ماوئی کی بچی تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں کہ میں نے تمہیں کتنا یاد کیا۔ تمہاری کال کے بعد ساری رات میں ٹھیک سے سو نہیں پائی۔ صبح مجھ سے ناشتا بھی نہیں کیا جا رہا تھا، مجھے بس تم سے ملنے کی جلدی تھی۔ میرے تو حلق سے نوالہ ہی نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ میں نے بابا جانی کی منت کی کہ پلیز مجھے جلدی کالج ڈراپ کر دیں۔'' وہ بنا رکے بولتی ہوئی اندر آئی اور اپنا بیگ اس کے بستر پر پھینک کر ساتھ لایا بڑا سا شاپر میز پر رکھ کر کھولنے لگی۔ ماوئی منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھ اور سن رہی تھی۔

''ممی مجھ پر ہنس رہی تھیں۔ پھر انہوں نے سب کام چھوڑ کر مجھے بڑا سا میرا سارا ناشتا بنا کے دیا اور کہا کہ یہ ساتھ لے جاؤ، اپنی سہیلی کے ساتھ مل کر کھا لینا۔'' شاپر میں سے ٹفن برآمد ہوا جس میں کافی سارے آملیٹ تھے اور دوسرے ٹفن میں بہت سارے پراٹھے۔ پورا کمرا خوشبوؤں سے مہک گیا۔ ماوئی سر تھام کر بستر پر بیٹھ گئی۔

''اُف میرے خدایا! تم کیا چیز ہو منزہ؟'' منزہ ان سنی کیے کمرے میں موجود ریک میں رکھی پلیٹیں اٹھا

کران میں ناشتا نکالنے لگی۔

''فائزہ اور آمنہ کہاں ہیں؟ اور باقی لوگوں کو بھی یہیں بلا لو یار......'' اسی وقت فائزہ اور آمنہ آگے پیچھے ہاتھوں میں ٹوتھ برش اور تولیے اٹھائے اندر داخل ہوئیں اور ٹھٹک کر رہ گئیں۔

''ارے! یہ کون لایا؟'' منزہ نے ہنس، ہنس کر انہیں بھی اپنی بے تابی کی داستان سنائی تو وہ دونوں بھی اس کا مذاق اڑانے لگیں۔

''پر اب زنیرا اور فارحہ کے ناشتے کا کیا بنے گا؟ وہ دونوں بھی کچھ نہ کچھ لے کر آنے والی ہوں گی، تو اتنے ڈھیر پراٹھے کون کھائے گا؟'' آمنہ نے ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا تو منزہ نے گردن اکڑائی۔

''ان دونوں کو میں رات کو ہی کال کر کے منع کر چکی ہوں کیونکہ ممی کے آگے یہ ڈراما کرنے کا میں نے رات سے ہی سوچ لیا تھا۔ سو وہ دونوں اب تم لوگوں کے لیے کچھ اور لے کر آئیں گی۔'' ان تینوں کے منہ کھل گئے۔

''واہ رے منزہ بی بی، ہم تو تمہیں ڈرامے باز سمجھے تھے پر تم تو پوری فلم نکلیں......'' فائزہ نے مزاحیہ انداز میں کہا تو منزہ نے اسے ایک دھپ رسید کی۔ ہادیٰ جا کر باقی لڑکیوں کو بھی بلا لائی جو اُن کے سیکشن کی تھیں۔ روز تو صرف پراٹھوں کی خوشبو پھیلتی تھی، اس روز جب آملیٹ کی بھی خوشبو ہاسٹل کے برآمدوں میں پھیلی تو دوسرے سیکشنز کی لڑکیوں نے بھی حملہ کر دیا۔ سب ہنس رہی تھیں، ایک دوسرے سے نوالے چھین رہی تھیں، چھین چھین کر کھا رہی تھیں اور سب کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ محبت سے، خوشی سے...... ہادیٰ کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں مگر آنسوؤں کی جھلملاہٹ سے۔ خوشی کے آنسو...... محبت کے آنسو...... اور محرومیوں کے...... ناتمام آرزوؤں کے آنسو۔

یہی تو اصل محبت ہے...... جو محبوب کے ساتھ، ساتھ اس سے جڑے ہر شخص کو سیراب کرتی ہے۔ جیسی منزہ کی محبت ہادیٰ کے لیے تھی...... بے غرض اور معصوم۔

☆☆☆

وہ بری طرح رو رہی تھی، سسک رہی تھی، اپنے مالک کے آگے، اس پاک رب کے آگے جس کے آگے رونے میں اسے کبھی عار نہیں محسوس ہوئی۔ اس نے بچپن سے یہی سیکھا تھا...... وہ جو رب ہے، وہی سب ہے۔ وہ جب بھی اپنے نفس سے ہارنے لگتی تو بس اس کے آگے سربسجود ہو جاتی۔ رات کے پچھلے پہر جب ساری دنیا میٹھی نیند سوتی تب وہ اپنے رب سے راز و نیاز کرتی۔ دنیا والوں کے لیے وہ بے حد انا پرست ہو سکتی تھی لیکن وہ اپنی انا صرف اپنے رب کے آگے توڑتی تھی۔ اسی لیے اس پہر روتی تھی جب اس کے آنسوؤں کا خدا کے سوا کوئی گواہ نہ ہو۔

''میں خود کو بے بس ہوتا پاتی ہوں، میں محبت کو صرف آپ کا حق سمجھتی ہوں، میں شرک سے ڈرتی ہوں۔ جس بات سے آپ نے منع کیا ہے میں اسے کرنا تو دور کی بات اس پر سوچنا بھی نہیں چاہتی لیکن میرا سب کچھ جاننے والے، میرا دل بدل رہا ہے، میرے اختیار سے نکل رہا ہے، اسے میری مٹھی میں کر دے۔ مجھے اپنے پسندیدہ رنگوں میں رنگ دے۔ مجھے دنیا نہیں چاہیے۔ میری محبت کے حق دار آپ اور آپ کے رسول ﷺ کے بعد میرے محرم رشتے ہیں اور یہی ہونے چاہئیں۔ میری محبت کا حق دار بس وہی ہو جسے آپ نے میرا شریکِ سفر چن رکھا ہے۔ میں اپنے نفس کو اپنے جذبات کو آپ کے حوالے کرتی ہوں۔ اپنے آخری نبی ﷺ کے صدقے میرے دل کو قرار دے دیں، مجھے اپنی فرمانبردار بندی بنا لیں۔'' وہ...... زنیرا محمود... جسے لگنے لگا تھا کہ اس کے دل کی دنیا بدل رہی ہے۔ وہ بے سکونی کی زندگی نہیں چاہتی تھی، اسی لیے اپنے رب سے کہہ رہی تھی کیونکہ اسے ناراض کر کے بھی بھلا کبھی سکون ملا ہے......

☆☆☆

باتھ روم سے نکل کر وہ اپنے بستر تک آئی تو نگاہ غیر ارادی طور پر بھٹک کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے سے ٹکرا گئی۔ دھلے چہرے کو دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے اس کے ہاتھ وہیں تھم گئے۔ ایک ہاتھ بے جان سا ہو کر پہلو میں جا گرا۔ کون تھی وہ لڑکی جو آئینے میں استادہ نظر آرہی تھی؟ خشک، الجھے، بکھرے، روکھے بال، زردی مائل رنگت یا سیاہی مائل زرد رنگت...... فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ گہرے سیاہ حلقوں کے بیچ ویرانی اور وحشت سے لبریز اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، چہرے پر جا بجا نیل، پپڑی زدہ ہونٹ، نحیف وجود اور شکنوں سے پُر میلا کچیلا لباس۔ یہ کس کا وجود تھا بھلا؟ یہ محبت کا وجود تھا...... محبت کا وجود یا محبت کا تحفہ؟ وہ جو شاعر کہتا ہے ناں...... کیا ملا محبت میں؟ تو اسے یہ ملا...... داغ...... گھاؤ...... اور یہ زندان......

جناح کالج پشاور کی لائق فائق طالبہ ثمینہ خان...... یوں تقیرنیوں کی طرح اس پُرتعیش زندان میں پڑی تھی، جہاں اس کی ماں تک اس کا چہرہ دیکھنے نہیں آتی تھی۔ باپ اور بھائیوں کی مار سے لگنے والے زخم بنا مرہم کے سڑ، سڑ کر خود ہی ٹھیک ہو گئے تھے البتہ چہرے اور جسم پر سیاہ داغ چھوڑ گئے تھے، یادگار کے طور پر۔ چوبیس گھنٹوں میں اسے صرف ایک وقت کا کھانا دیا جاتا تھا تاکہ وہ زندہ تو رہے لیکن دوبارہ ایسی سنگین جرأت کی اس میں ہمت رہے نہ طاقت۔ اس کا دماغ خوراک سے بس اتنی ہی قوت وصول کرے جو اس کے جسمانی افعال کو رواں رکھنے میں معاون ثابت ہو، زیادہ سوچ بچار بھی وہ نہ کر سکے۔ یہ بھی اس پر بہت بڑا احسان تھا کہ اسے اس کے اپنے ہی پُرتعیش کمرے میں قید کیا گیا تھا۔ بس اتنا سا ظلم کیا تھا کہ پچھلے لان میں کھلنے والی اس کے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کو باہر سے کیلیں ٹھونک کر بند کر دیا گیا تھا اور پھر اس پر پلستر کا لیپ کر دیا گیا۔ یہ بھی اس پر احسان ہی تھا کہ اسے زندہ رہنے دیا گیا، ورنہ قتل تو ان کے قبیلے میں کھانے کے بعد میٹھے جیسی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے صبح کا پتا چلتا نہ شام کی خبر ہوتی۔ باہر سے آنے والی آوازوں سے وہ بس اندازے ہی لگا سکتی تھی۔ کبھی وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی تو پھر نمازیں ہی پڑھتی چلی جاتی۔ قرآن اٹھا لیتی تو پھر پورا دن قرآن ہی پڑھتی رہتی۔ اگر کبھی خالی الذہن یونہی بستر پر بیٹھ جاتی تو پورا دن گزر جاتا، وہ پہلو تک نہ بدلتی۔ ایک ہی رخ بیٹھے، بیٹھے صبح سے شام کر دیتی، اسے احساس ہی نہ ہوتا۔ اس کا دماغی توازن دھیرے، دھیرے بگاڑ کی طرف رواں دواں تھا لیکن پروا کسے تھی۔ اور پروا ہوتی بھی تو بھلا کیسے؟ کوئی اندر آتا تو جان پاتا کہ وہ کس حال میں ہے۔ دن میں صرف ایک بار نوکرانی محض کھانے کی ٹرے رکھنے اور پچھلے دن کی ٹرے اٹھانے کے لیے آتی تھی اور بس......

زندگی نے ثمینہ کے ساتھ بہت سنگین کھیل کھیلا تھا۔

☆☆☆

افشاں نے بے حد احتیاط سے وہ خوب صورت لباس استری کر کے تہ کیا اور شاپر میں ڈال کر سلیقے سے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ یونیفارم پہن کر گیلے بال سلجھائے، ہلکی پھلکی جیولری پہنی اور خود پر ڈھیر سارا پرفیوم چھڑک کر خود کو آئینے میں دیکھا اور زیرِ لب گنگنانے لگی۔

''آج لگتا ہے میں ہواؤں میں ہوں
آج اتنی خوشی ملی ہے
آج بس میں نہیں ہے من میرا
آج اتنی خوشی ملی ہے''

وہ واقعی بہت خوش تھی کیونکہ وہ اپنی پلاننگ میں کامیابیاں حاصل کرتی جا رہی تھی۔ چادر اچھی طرح طرح لپیٹ کر بیگ اٹھائے وہ کمرے سے نکلی تو اختر بیگم سامنے ہی برآمدے میں ستون کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اس کے قریب سے گزرنے پر انہوں نے ناک سکیڑی پھر ماتھے پر تیوریاں سجا کر اسے ٹوکا۔

''اتنا پرفیوم کیوں لگایا ہے؟'' وہ ٹھٹک کر رکی اور ناگواری سے ماں کو دیکھا مگر کوئی الٹا جواب دے کر وہ مصیبت مول نہیں لے سکتی تھی۔

''غلطی سے ڈھکن نکل کر گر گیا تو پرفیوم زیادہ نکل آیا۔'' اختر بیگم کی آنکھوں میں سختی سی پھیل گئی۔

''تو جاؤ جا کر دوسرا یونیفارم پہنو۔''

''وہ میلا ہے۔'' اس نے سپاٹ انداز میں کہا تو اختر بیگم بے چین ہو گئیں۔ وہ نکلنے لگی تو ان کی نظر گھڑی کی سمت گئی۔

"تمہاری بس تو پونے سات بجے آتی ہے۔ یہ سوا چھ بجے سے کہاں جارہی ہو؟" افشاں کے اندر الاؤ بھڑک اٹھا۔ اس نے بمشکل ضبط کیا اور ان کی طرف مڑی۔

"بس کا روٹ تبدیل ہوا ہے، کچھ دن تک یہی بس پورے حیات آباد سے لڑکیوں کو لے گی۔ اس لیے ساڑھے چھ بجے سٹاپ پر آئے گی اور پانچ سات منٹ تو اسٹاپ تک کا بھی راستہ ہے آپ جانتی ہیں۔" وہ خاموش ہو گئیں لیکن ان کے دل کو تنبیے لگ گئے۔ اگلے اسٹاپ پر پہنچ کر افشاں نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ اسٹاپ پر بلیک مرسڈیز کھڑی تھی جس کے hazards آن تھے۔ وہ محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی اس طرف چل دی۔ کار کے قریب پہنچا تو پچھلی سیٹ کا لاک کھل گیا۔ وہ شانِ بے نیازی سے بیٹھ گئی۔ گاڑی کے آٹو میٹک لاک خود بخود بند ہو گئے۔ اب گاڑی کا رخ حیات آباد کے غیر آباد حصے کی طرف تھا۔ سنسان میدانی علاقے میں پہنچ کر گاڑی رکی اور ڈرائیور نیچے اتر گیا۔ گاڑی کے شیشوں پر مکمل سیاہ بلائنڈز لگے تھے۔ کوئی باہر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے، بیٹھے ہی کسی طرح کپڑے تبدیل کیے، بالوں میں برش پھیرا اور لپ سٹک لگائی۔ ڈرائیور گاڑی میں نہیں تھا اس لیے وہ مطمئن تھی مگر وہ ایک نئے ماڈل کی کار تھی جس میں اکیلی ہو کر بھی وہ اکیلی نہ تھی۔ پل، پل کی وڈیو کہیں بہت خوب صورتی کے ساتھ محفوظ ہوتی جا رہی تھی، اس کے وہم وگمان میں آئے بنا ہی......

آہ...... یہ کم عقل عورت......!

☆☆☆

کالج میں دسمبر کی چھٹیاں ہوئیں تو سب سے زیادہ منزہ اداس ہوئی۔ وہ بار، بار ماوئی کو گلے لگا کر رونے لگ جاتی اور اس سے وعدے لینے لگتی۔

"مجھے فون کرو گی ناں؟" ماوئی مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتی اور اس کے آنسو پونچھتی۔

"اور اب چھٹیوں کے بعد ایک ویک اینڈ تم میرے گھر گزارہ کرو گی، ہاسٹل میں اکیلے نہیں رہو گی۔ اوکے؟"

"اوکے بابا اوکے......" منزہ ہنس دیتی۔ ماوئی کا خود بھی سرما کی چھٹیوں میں گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ ہاسٹل میں رہ کر لوگوں کو مشکوک کیوں کرتی۔ گو کہ چترال، اسکردو اور ایسے ہی دیگر برفانی شہروں سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں بھی راستے بند ہونے کی وجہ سے ہاسٹل میں رہتی تھیں لیکن ان کی تو مجبوری تھی۔ ماوئی کا گاؤں تو محض ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گاؤں جانا ہی پڑا۔ گاؤں پہنچتے ہی اسے ثمینہ کا خیال آیا۔ وہ اس سے ملنے تائی کی طرف گئی مگر ان کی تائی جنہیں سب بی بی جان کہتے تھے، نے اسے ثمینہ سے ملنے سے روک دیا۔

"لورے (بیٹی) ثمینہ سے کوئی نہیں مل سکتا۔ تمہارے تایا نے سب کو سختی سے منع کر رکھا ہے کہ اس کے کمرے کا کوئی رخ بھی نہ کرے۔ مجھے بھی پابند کیا ہوا ہے۔ بس دعا کرو کہ اس کا کہیں رشتہ ہو جائے تو وہ کمرے سے نکل پائے۔" آخر میں ان کا لہجہ یاس بھرا ہو گیا تو ماوئی نے ان کا ہاتھ تھام کر سہلایا۔

"بی بی جان سب ٹھیک ہو جائے گا، پریشان مت ہوں۔ کوئی رشتہ ہے کیا آپ کی نظر میں؟" اس کے سوال پر وہ قدرے متذبذب ہوئیں پھر گول مول جواب دیا۔

"بس دعا کرو۔" وہ کہوں یا نہ کہوں کی کیفیت کے بیچ معلق تھیں، ماوئی سمجھ گئی کہ ابھی وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

"دعا تو ہر وقت کرتی ہوں بی بی جان۔" انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی طرف دیکھا۔

"تم تو اس کی سہیلی ہو ناں، تم ضرور دعا کیا کرو، تمہاری دعا قبول ہو گی۔" ماوئی ان کی باتوں پر متعجب ہو رہی تھی۔ ان کے خاندان میں تو جملے بھی تول، تول کر گن، گن کر ادا کیے جاتے تھے۔ پھر وہ اپنے جذبات کا اظہار اتنا کھل کر کیسے کر رہی تھیں۔ پہلی بار اس نے ان میں ماتا کی وہ جھلک دیکھی جو حویلی کی کسی ماں میں اسے کبھی نظر نہیں آئی۔ شاید مجبوراً...... یا شاید مصلحتاً......

"آپ تو ماں ہیں بی بی جان، سہیلی سے زیادہ ماں کی دعا قبول ہوتی ہے۔" اس کی بات پر ان کے آنسو چھلک پڑے لیکن اگلے ہی لمحے اِدھر اُدھر دیکھ کر... خوف زدہ انداز میں انہوں نے آنسو پونچھ ڈالے۔ ماوئی کو ان پر بے حد ترس آیا۔ ارد گرد کوئی موجود نہیں یہ تسلی کر کے وہ بولیں۔

"ایسی ماں کی کیا دعا قبول ہو گی جو خاندان کے رواجوں کے خوف سے اپنی بیٹی کو کبھی سینے سے لگا کر چوم بھی نہ سکی ہو، جس نے کبھی اپنی بیٹی پر اپنی ماتا نچھاور نہ کی ہو، ایسی ماں کو تو اوپر والا دعا کرنے کا حق بھی نہیں دیتا ہو گا۔ میں تو اپنا دکھ تک بیان نہیں کر سکتی، اپنے آنسو تک بہا نہیں سکتی۔ صرف تم ہو جو ثمینہ کے قریب ہو، اس لیے جانتی ہوں کہ تم میرے آنسوؤں کا راز نہیں کھولو گی تو تمہیں دکھا دیے اپنے بے بس آنسو۔" ماوئی کی آنکھوں میں کب کے رکے آنسو آزاد ہو گئے۔ وہ اس وقت ان کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ تایا حشمت اس وقت حجرے میں ہوتے تھے اور ملازمائیں اپنے، اپنے کاموں میں مصروف ہوتی تھیں۔ بی بی جان نے اٹھ کر دروازہ لاک کیا پھر اس کے پاس آ کر قریب ہو کر بیٹھ گئیں اور آہستہ، آہستہ بولنے لگیں۔

"تمہارے تایا ایک رشتے کی کوشش میں ہیں۔ بڑا اچھا خاندان ہے اور بہت ہی اچھا لڑکا۔ بس دعا کرو کہ انہیں اس معاملے کی خبر نہ ہونے پائے۔ تمہارے تایا نے اس کو مارا تو بہت ہے لیکن ہے تو آخر وہ اس کی سگی اولاد ہی ناں۔ دل میں تو وہ بھی اس کے رشتے کے لیے پریشان ہیں، اور دیکھو لڑکا ایسا ڈھونڈا ہے کہ شاہنواز تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں۔ ثمینہ، شاہنواز کو پسند نہیں کرتی تھی ناں تو جیسا اسے پسند تھا، جاوید بالکل ویسا ہی ہے۔ بس اب یہ رشتہ پکا ہو جائے۔" ماوئی کو جھٹکا لگا تو گویا بی بی جان جانتی تھیں کہ ثمینہ کی پسند کیسی ہے۔ ہائے یہ مجبوریوں میں لپٹی مائیں جو مجبوریوں اور مصلحتوں کی چادر خود پر اچھی طرح لپیٹ تو لیتی ہیں لیکن چادروں کے اندر چھپے جذبات اور خواہشات کو مار نہیں پاتیں۔ وہ جذبات سانس لیتے رہتے ہیں، بس کسی کو نظر نہیں آتے۔ اسی لمحے ماوئی کو یکایک احساس ہوا کہ شاید اس کی ماں بھی ایسی ہی ان دیکھی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اگر اسے بھی تنہائی میں کریدا جائے تو شاید وہ بھی مصلحتوں کی چادر اتار کر اپنا زخم، زخم وجود اپنی اکلوتی بیٹی کو دکھا ہی دے۔ پہلی بار وہ ماں اور مصلحت کے مشترکہ غم کو سمجھ پائی تھی۔

ہائے ماں...... ! وہ بوجھل دل لیے وہاں سے اٹھ آئی۔

☆☆☆

دسمبر کی دس دن کی چھٹیاں گزار کر وہ واپس آئی تو منزہ اس کے سر ہو گئی کہ اب وہ جو ایک ویک اینڈ ہاسٹل میں گزارتی ہے وہ اس کے گھر گزارہ کرے۔ نیا سال شروع ہو گیا تھا اور کالج میں پڑھائی زوروں پر تھی۔ آئے دن ٹیسٹ اور اسائنمنٹس...... ویک اینڈ پر تو جیسے ہر ٹیچر ٹیسٹ دینے کو تیار بیٹھی ہوتی۔ ہاسٹل میں لڑکیاں مل کر پڑھائی کرتی تھیں تو بہت فائدہ ہوتا۔ پہلا ویک اینڈ آتے ہی منزہ نے ماوئی کو اتنا عاجز کر دیا کہ وہ بیگ پیک کر کے تیار ہو ہی گئی۔ ہفتے کی دوپہر بالآخر وہ منزہ کے ساتھ اس کے گھر چلی ہی گئی۔ اس کے بابا کی طبیعت کچھ بہتر نہیں تھی تو انہوں نے منزہ کو لینے کے لیے ڈرائیور بھیج دیا۔ منزہ کے خوب صورت گھر کے وسیع پورچ میں گاڑی رکی تو ڈرائیور نے دروازے کھولے اور دونوں گاڑی سے اتریں۔ روش عبور کر کے برآمدے تک پہنچیں تو راشدہ بیگم، ماوئی کے استقبال کے لیے دہلیز پر ہی کھڑی تھیں۔ انہوں نے جو ماوئی کو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ کھوئی، کھوئی سی کیفیت میں انہوں نے اس کا ماتھا چوما پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر کر محبت سے اسے دیکھتی رہیں اور یکایک اسے بھینچ کر گلے لگا لیا۔ ماوئی کے روم، روم میں ماتا کی ٹھنڈک سرایت کر گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسی طرح اسے خود سے لگائے رکھیں اور انہوں نے واقعی اگلے کئی لمحے اسے خود سے لپٹائے رکھا۔ منزہ کو ان کے اس درجہ التفات پر حیرت سی ہوئی۔

"پہلی ہی ملاقات میں ایسی محبت......" "ویسے تو منزہ چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے ماوئی، ماوئی کر کے ان

سب کا دماغ کھاتی رہتی تھی اور سب اس کی اس دیوانگی پر ہنستے بھی رہتے تھے، نہ کبھی کسی نے ماوئی کے لیے بہت دلچسپی کا اظہار کیا نہ ہی ممی نے کبھی ایسا کوئی ردِعمل ظاہر کیا جس سے وہ یہ گمان کرتی کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اسے ایسا محبت بھرا پروٹوکول دیں گی۔ اسے خود سے الگ کر کے راشدہ بیگم نے ایک بار پھر بے حد محبت سے اس کا ماتھا چوما تو منزہ بے ہوش ہونے والی ہوگئی۔ ماوئی خوب صورت تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ وہ دیوانی ہی ہو جائیں، بات کچھ اور ہی تھی جو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تو ممتا اور محبت کے سمندر ٹھاٹھیں مارتے نظر آ رہے تھے۔ بابا بھی باہر آ گئے تو راشدہ بیگم پیچھے ہٹ گئیں۔ بابا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھیروں دعائیں دیں۔ ماوئی کے لیے آنسوؤں کو آنکھوں کے کٹوروں میں روکے رکھنا محال ہوگیا۔

کیا باپ ایسے بھی ہوتے ہیں؟ وہ تو جیسے لمحوں میں مالا مال ہوگئی۔ نائمہ اس کے کندھے پر لٹکتا بیگ اتار کر اندر لے گئی۔ محبت کا ایک اور انوکھا انداز...... اسے لیے وہ سب ساتھ ہی برآمدے میں آئے تو بابا نے شگفتگی سے کہا۔

"تو بالآخر منزہ صاحبہ اپنی عزیز از جان سہیلی کو ویک اینڈ کے لیے گھر لانے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔"

"جی بابا جانی۔ اور اب ماوئی ہر دوسرا ویک اینڈ ہمارے گھر ہی گزارہ کرے گی۔" منزہ اٹھلا کر بولی۔

"ویلکم...... ویلکم......" بابا نے خیر مقدمی انداز میں گرمجوشی سے کہا تو راشدہ بیگم بھی باورچی خانے میں جاتے، جاتے رک کر بولیں۔

"ضرور، ضرور، کیوں نہیں۔ یہ بھی ماوئی کا اپنا گھر ہے۔" پھر مسکرا کر پیار سے ماوئی کو دیکھا اور منزہ سے بولیں۔

"چلو منزہ باقی باتیں بعد میں، پہلے بہن کو کمرے میں لے جاؤ، فریش اپ ہو جاؤ، میں کھانا لگاتی ہوں۔" ان کی بات پر ماوئی بے اختیار بول اٹھی۔

"آپ کیوں آنٹی...... میں اور منزہ مل کر کھانا لگائیں گے۔ بس ہم دو منٹ میں فریش ہو کر آتے ہیں۔ یہ کام تو ویسے بھی بیٹیوں کے کرنے کا ہوتا ہے ناں۔" اس کی بات پر راشدہ بیگم مسکرا دیں۔

"ماوئی آپی! آپ کی وجہ سے تو شاید منزہ آپی کچھ کام کر لیں ورنہ تو سارے کام ممی ہی کرتی ہیں۔" نائمہ چہکی تو منزہ نے کمرے میں جاتے، جاتے پلٹ کر اسے گھورا۔

"موٹی، تم خود کون سا اٹھ کر پانی پی لیتی ہو۔ خود تو چینل تبدیل کرنے کے لیے ریموٹ پر بٹن دبا کر بھی تھک جاتی ہو۔" ماوئی ہنسنے لگی۔

"اونہوں، بری بات...... چلو منزہ کمرے میں۔ اور نائمہ......" راشدہ بیگم نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا تو وہ چپکی بیٹھ گئی۔ بابا زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ بس یہی مناظر تو اس کے گھر میں نہیں ملتے تھے۔ ماوئی حسرت بھری نظروں سے دیکھتی منزہ کے پیچھے، پیچھے چل دی۔

☆☆☆

وہ پہلی نظر میں اس کا اسیر ہوا تھا۔ اگر وہ خوب صورت تھی تو صرف وہی تو خوب صورت نہیں تھی دنیا میں۔ اس کے آس پاس حسن کی کمی تو نہ تھی پھر بھی وہ ہر پری چہرہ چھوڑ کر اس کا اسیر کیوں ہوا؟ انوکھا کیا تھا اس میں؟ ایسا کیا تھا کہ اسے دیکھتے ہی دل چاہا کہ وہ اس کی راہوں میں پھول بچھا کر اسے خوش آمدید کہے۔ شاید اس کی وجہ اجلے من کی شفافیت تھی۔ جو اس کی آنکھوں سے چھلکتی تھی اور وہ معصومیت جو بچوں کی طرح اس کے چہرے کو چمکائے رکھتی تھی۔ جو بھی تھا، احمر بری طرح ماوئی کا دیوانہ ہوا۔ جب یونیورسٹی سے واپسی پر اس نے برآمدے میں قدم رکھا تو ماوئی سامنے ہی ڈائننگ ٹیبل پر برتن لگاتی بابا کی کسی بات پر زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ وہ مبہوت رہ گیا۔ اس کی موہنی مسکان نے اسے وہیں باندھ لیا۔ اتنے دن سے سن رہا تھا کہ منزہ کی عزیز از جان سہیلی ویک اینڈ گزارنے ان کے گھر آ رہی ہے تب اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں پہلی نظر میں شدید ترین محبت کا شکار ہو جائے گا۔ وہ فریش ہو کر آیا تو سب کھانا شروع کر چکے تھے۔ کھانے کے دوران اس نے بھی ممی کے غیر معمولی التفات کو واضح طور پر محسوس کیا پھر منزہ کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر کندھے اچکا دیے۔ وہ سلاد کا رسیا تھا سو پہلے سلاد سے پلیٹ بھری اور کھانے لگا۔ ماوئی نے رک کر قدرے حیرت سے سلاد سے مکمل بھری اس کی پلیٹ کو دیکھا پھر اپنا کھانا کھانے لگی۔

"ماوئی بیٹا ہمارے ہاں دوپہر کو ہلکا کھانا کھایا جاتا ہے، اسی لیے میں نے دال چاول بنا لیے لیکن ڈنر پر تمہارے اعزاز میں صحیح اہتمام ہوگا، اس لیے تم محسوس نہ کرنا۔" ممی نے اس کی پلیٹ میں مزید شامی کباب رکھتے ہوئے کہا تو اس نے ان کا ہاتھ روک دیا۔

"آنٹی میں تکلف بالکل نہیں کرتی۔ میں سب کچھ لے لوں گی اور اہتمام کی بھلا کیسی بات کر دی آپ نے۔ ماں کے ہاتھ کی بنی تو دال بھی مرغ مسلم پر بھاری ہوتی ہے اور آپ نے تو بنائی بھی بہت ذائقے دار ہے۔ مجھے بہت مرغوب ہے دال چاول اور ساتھ میں شامی کباب۔ کسی اور اہتمام کی تو چاہت ہی نہیں رہ گئی۔" ممی تو اس کی بات پر سو جان سے قربان ہو گئیں۔ تمام وقت وہ اسی کی پلیٹ کو بھرنے اور اسے کھلانے میں یوں مگن رہیں جیسے وہ ان کی دور دیس بیاہی بیٹی ہو جو عرصے بعد میکے آئی ہو۔ منزہ، نائمہ اور احمر کے بیچ مسلسل نوک جھوک چل رہی تھی۔ اظفر خاموش طبع بچہ تھا، وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا اور وہ...... ماوئی خان...... وہ زندگی کے ان رنگوں سے یوں مبہوت تھی کہ اس کا دل چاہا کہ وقت ٹھہر جائے۔ وہ یوں ہی ان کے بیچ بیٹھی رہے ان کے خاندان کا حصہ بن کر۔ اپنی اس خواہش پر وہ چونکی پھر سر جھٹک کر مسکرا دی۔ احمر اس کے تمام تاثرات پڑھ رہا تھا اور اس کے بابا...... وہ اپنے بیٹے کے تاثرات پڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

راشدہ بیگم نے دودھ کا گلاس دانش صاحب کو تھمایا اور اپنا گلاس لیے بستر کے ساتھ پڑے کاؤچ پر بیٹھ گئیں۔

"بچوں کو دے آئیں دودھ کے گلاس؟" دانش صاحب نے ایک گھونٹ بھر کر پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

"لگتا ہے ماوئی بہت بھا گئی آپ کو۔ ایک ہی ملاقات میں اتنی محبتیں؟ ہمیں تو رشک آ رہا ہے بھئی۔" وہ ہنس دیں پھر ان کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر برسوں پرانے زخم ادھڑ گئے۔ اپنی فاریہ آج ہوتی تو بالکل ایسی ہی ہوتی۔ ہے ناں؟" دانش صاحب بغور انہیں دیکھنے لگے۔ وہ اپنی شریکِ حیات کی ہر بات کو بہت توجہ سے سننے کے عادی تھے۔

"یاد ہے ناں آپ کو، کتنی من موہنی سی تھی وہ۔ اتنے برسوں میں پہلی بار ایسا ہوا کہ کسی لڑکی کو دیکھ کر فاریہ یوں یاد آ گئی کہ میں خود پر قابو ہی نہ رکھ پائی۔" ان کی بات پر وہ اداسی سے مسکرا دیے۔ انہیں بھی فاریہ کی یاد آ گئی۔

"ہاں شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" پھر کسی انوکھی سی سوچ کی چمک ان کے چہرے پر لہرائی۔

"لیکن بیٹی تو ہم اسے بھی بنا سکتے ہیں۔" دودھ پیتے، پیتے راشدہ بیگم چونکیں۔

"کیا مطلب؟"

"ارے! بیٹے کی ماں ہو کر مطلب پوچھتی ہو!" انہوں نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا تو راشدہ بیگم نے تعجب سے آنکھیں سکیڑیں۔

"واہ بھئی واہ، داد دینی پڑے گی آپ کی سوچ کو تو۔ رشتے جوڑنے کی رفتار میں تو عورتوں کو بھی مات دے دی آپ نے۔" وہ ہنس کر گلاس اٹھائے کھڑی ہو گئیں۔

"رشتے تو آپ کی اولاد بھی جوڑتی نظر آ رہی ہے۔ آپ ماوئی سے نظر ہٹا کر ذرا اِدھر اُدھر بھی دیکھیں تو آپ کو پتا چلے۔" ان کے معنی خیز انداز پر راشدہ بیگم کا ہاتھ دروازے کی ناب پر جما رہ گیا۔

"آپ سیدھی بات کیوں نہیں کرتے آخر؟" انہوں نے آنکھ کی جنبش سے گلاسوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ گلاس باورچی خانے میں رکھنے باہر نکل گئیں۔ بات جان لینے کی جلدی تھی مگر وہ تمام گلاس دھوئے بنا کمرے میں جا بھی نہیں سکتی تھیں۔ ان کی نفاست انہیں

ایسی بے پروائی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ سنک کے پاس آئیں تو ریک میں پانچ گلاس دھلے ہوئے رکھے تھے اور ان سے ٹپکتا پانی بتا رہا تھا کہ وہ بالکل ابھی ایک آدھ منٹ پہلے ہی دھو کر ریک میں الٹائے گئے ہیں۔ راشدہ بیگم بے اختیار مسکرا دیں۔ یہ حرکت یقیناً ماوئی کی تھی ورنہ تو منزہ ایسی تیز تھی نہ نائمہ اتنی سگھڑ...... اور پھر نائمہ کو تو سوئے ہوئے گھنٹا گزر بھی چکا تھا۔ وہ اپنے گلاس دھو کر زیر لب مسکراتی کمرے میں داخل ہوئیں اور دانش صاحب کے سامنے بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں۔

"اب بتائیں کیا بات ہے؟" وہ جو سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک نظر صوفہ کم بیڈ پر گہری نیند سوئی نائمہ کو دیکھا اور بولے۔

"بات تو سیدھی سی ہے بیگم صاحبہ۔ آپ کی بڑی صاحبزادی تو پہلے ہی اپنی سہیلی کی دیوانی ہیں، سہیلی صاحبہ گھر آئیں تو آپ کو بھی اسیر کر لیا۔ اب جو دیکھیں تو آپ کے فرزند ارجمند بھی کچھ گھائل نظر آتے ہیں، اگر آپ آنکھیں کھلی رکھیں تو......" راشدہ بیگم کی آنکھیں اور منہ دونوں کھل گئے۔

"کیا واقعی؟" وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ انہوں نے واقعی احمر پر دھیان نہیں دیا تھا۔ ان کی توجہ تو مکمل طور پر ماوئی پر ہی تھی۔

"اگر واقعی ایسا ہی ہے تو یہ تو اچھی بات ہے۔" دانش صاحب مسکرا دیے۔ وہ فاریہ کا دکھ فراموش کر گئی تھیں۔ فاریہ ان کی بڑی بیٹی تھی جو احمر کے بعد اور منزہ سے پہلے پیدا ہوئی۔ وہ اس قدر موہنی صورت کی بچی تھی کہ جو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس کے مقابلے میں منزہ اور نائمہ تو کچھ بھی نہ تھیں۔ وہ عادتاً بھی ایسی فرشتہ صفت تھی کہ سارا دن بھی نہ اٹھاؤ تو روتی نہ تھی۔ ہمہ وقت مسکرانے والی ایسی بچی جس کی خوش مزاجی پر ہر شخص حیران ہوتا کہ بھلا ایسا کب ہوا ہے کہ اتنی ننھی بچی ہو اور اپنی حاجات اور تکالیف بیان کرنے کے لیے بھی نہ روئے۔ وہ اپنی بھوک یا دوسری کسی بھی ضرورت کے لیے ذرا سا منہ بسور کر ماں کو اشارہ دیتی اور بس...... لیکن وہ دلکش بچی صرف ایک سال کی عمر لکھوا کر دنیا میں آئی تھی۔ اس کے لیے اترا رزق اس کے فوت ہو جانے کے بعد کئی ماہ تک ان کے وجود میں ٹیسیں مارتا رہا اور اس کی جدائی کو سہنا محال کر دیتا۔ وہ معمولی سی بھی بیمار نہ تھی کہ انہیں صبر آ جاتا...... وہ تو بالکل بھلی چنگی صحت مند بچی تھی اور یہی قلق راشدہ بیگم کو چین نہیں لینے دیتا تھا۔ وہ احمر سے دو برس چھوٹی تھی، اس کے فوت ہونے کے چار سال بعد منزہ پیدا ہوئی اور جب تک وہ نہیں ہوئی، راشدہ بیگم سنبھل نہیں پائیں۔ منزہ کی آمد نے فاریہ کی جدائی کے گھاؤ بھرے۔ پھر دو سال بعد نائمہ اور اس کے دو سال بعد اظفر کی آمد ہوئی تو وہ پوری طرح سنبھل گئیں اور بچوں میں مصروف ہو کر فاریہ کا غم فراموش کر گئیں۔ یہ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے عرصے بعد ماوئی کو دیکھ کر وہ گھاؤ پھر سے ہرے ہو جائیں گے۔ پھر دانش صاحب کی دکھائی راہ پر قدم، قدم چلتے ان کی پوری رات سہانی گزری۔

☆☆☆

تین ماہ...... تین ماہ کم نہیں ہوتے...... پہاڑ جیسے ہوتے ہیں...... اگر دن رات کسی انسان سے بات کیے بنا کسی زندان میں گزارے جائیں...... تین ماہ...... کسی قحط زدہ ملک کے باسیوں کی نفسیات سمجھانے کے لیے کافی ہوتے ہیں جب چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار کھانا کھانے کو ملے...... اور تین ماہ...... بہت ہوتے ہیں ایک نارمل انسان کو نفسیاتی مریض بنانے کے لیے۔ اس سے پہلے کہ وہ مکمل طور پر دماغی توازن کھو بیٹھتی، اس پُر تعیش زنداں کے دروازے کے دونوں پٹ پورے کھول دیے گئے۔ اندھیرے کمرے کے اندر جب باہر کی روشنیاں داخل ہوئیں تو ثمینہ نے بے اختیار آنکھوں پر بازو رکھ لیا...... خوشگوار ہوا کے نامانوس جھونکے اندر آئے تو وہ خائف سی ہو گئی۔ اس نامانوس فضا میں ایک بہت نرم، مانوس سی مہک لہرائی تو وہ کروٹ لے کر اٹھ بیٹھی۔ چوکھٹ پر...... بی بی جان کھڑی تھیں۔ اس کی ماں...... ان کے چہرے کے تاثرات عجب تھے اور ثمینہ کے عجیب تر...... پورے تین ماہ بعد وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ ثمینہ تو بولنا ہی بھول چکی تھی لیکن بی بی جان...... وہ اس کی حالت دیکھ کر بولنا بھول گئیں۔ اجڑا سراپا اور ڈھانچے نما جسامت والی یہ لڑکی جو انسان ہی لگ رہی تھی، وہ وجود تھا جسے نو ماہ انہوں نے اپنے اندر سینچا تھا اور پاؤں، پاؤں چلنے تک گود میں کھلایا تھا، خونِ جگر پلایا تھا اور سینے لگایا تھا۔ آج اسے دیکھ کر انہیں مسکرانے تک کی اجازت نہ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پگھل جاتیں اور انہیں پگھلا دیکھ کر وہ بکھر جاتی، وہ چہرے پر سپاٹ تاثرات پھیلائے قدم، قدم آگے بڑھتی اس کے بستر کے پاس آ کر ٹھہر گئیں۔ پھر ان کے لب ہلے۔

"ہم...... تمہاری شادی کر رہے ہیں۔" تین ماہ کی خاموشی کے بعد کوئی بات سنی بھی تو کیا...... دوسری قید کا پروانہ۔ اس کی نظروں میں خوف آ سمایا۔ کچھ کہنے کی سعی میں اس کے لب پھڑ پھڑائے لیکن تین ماہ کی گونگی زندگی کے بعد الفاظ اور آواز دونوں ہی بے وفائی کر گئے۔ اسے لب ہلانے کی کوشش کرتا دیکھ کر بی بی جان نے شہادت کی انگلی اٹھا کر سرد لہجے میں تنبیہ کی۔

"کوئی سوال مت کرنا، نہ کوئی جرأت۔ بس اتنا جان لو کہ تم بہت خوش بخت ہو کہ اتنا کچھ کر کے بھی بہترین بدل رہا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ واپس مڑ گئیں اور چوکھٹ تک پہنچ کر پلٹیں۔ کمرے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور نوکرانیوں کو آوازیں دی۔

"زہی...... صائمہ...... شیما......" تینوں دوڑی چلی آئیں، کمرے کا کھلا دروازہ اور اس میں بی بی جان کو کھڑا دیکھ کر ان کے منہ بھی پورے کھل گئے۔

"ثمینہ بی بی کو میرے کمرے میں لے جاؤ اور اس کمرے کی اچھی طرح صفائی کر کے رہائش کے قابل بناؤ اور فریدہ کو میرے پاس بھیجو۔" نوکرانیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ فریدہ بی بی جان کی خاص ملازمہ تھی، اس کا بلاوا ثمینہ کے لیے بھی حیران کن تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے صائمہ کے ہمراہ ماں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

قید کی سختیوں اور خوراک کی کمی کی وجہ سے ثمینہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔ اس کی حالت اب پ

فریدہ خانم کا افتخار

روٹری کلب آف لاہور سا؟ نے منجمنٹ کمیٹی آف پی سی ایس آئی آر ہاؤسنگ سوسائٹی کے تعاون سے میوزک سینٹر میں "جشن آزادی مشاعرے" میں بطور "مہمان شاعرہ" مدعو کیا اور کلام پڑھنے پر "اعزازی شیلڈ" سے نوازا۔ شکر الحمدللہ

ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان از خود سنا رہی تھی۔ یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اسے رشتے کی غرض سے کسی سے ملوایا جاتا۔ اسے اپنے کمرے میں منتقل کر کے بی بی جان نے فریدہ کو اس کی خدمت پر مامور کر دیا۔ وہ اس کی خوراک کا خیال رکھتی۔ پھل، دودھ، جوس، خشک میوہ جات غرض ہر وہ چیز جس سے اس کی صحت تیزی سے بہتر ہوتی، اسے استعمال کروائی جانے لگی۔ اس کا جرم بڑا سہی لیکن آخر کو وہ ایک نامی گرامی سیاستدان اور قومی اسمبلی کے ممبر کی بیٹی تھی اور اندرونی تنازعات کو دنیا کے سامنے نہیں لایا جاتا، اسی لیے پہلے اسے انتہائی راز داری سے قید میں رکھا گیا اور پھر قیدو بند کی صعوبتوں کے نشانات مٹانے کے لیے پشاور کے سب سے مہنگے پارلر میں اس کی بکنگ کروا دی گئی۔ اچھی خوراک اور پارلر کی سروسز سے ثمینہ ایک ماہ کے اندر، اندر نکھری ستھری حالت میں واپس آ گئی۔ ویک اینڈ پر ماوئی گھر آئی تو یہ خبر اس کی منتظر تھی، وہ کھل اٹھی۔ حویلی اسے بنا قہقہوں کے جگمگاتی ہوئی لگی۔ اس کی ساری کلفت و بیزاری اڑنچھو ہو گئی۔ وہ ثمینہ سے ملنے کو.... بےتاب ہو گئی۔ بھابی جمیلہ نے اسے تفصیلات بتائیں۔

''باباجی اندر ہی اندر خاموشی سے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہے تھے۔ چچا جان اور پھوپی جنت کی منت کر کے باباجی نے ثمینہ والی بات کو باہر نکلنے سے روکا ہوا ہے اسی لیے اب تک کسی کو اس بات کی خبر نہیں ہوئی اور انہیں رشتے ڈھونڈنے میں آسانی ہو گئی۔ بی بی جان کے خاندان سے دور کے رشتے داروں میں جاوید خان کا رشتہ ملا ہے۔ رشتے داروں سے رشتے داری کی امید تو نہیں رکھی پر پردے داری کی پوری امید رکھی ہے۔ باباجی نے اتنا بڑا رسک لیا ہے، دعا کرو پردہ قائم رہے اور ثمینہ کا گھر بس جائے۔ جاوید گھر کا بڑا بیٹا ہے اور بہت سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ جیسا ثمینہ چاہتی تھی۔''

آخری بات پر ماوئی چونکی پھر دکھ سے مسکرا دی۔ گویا ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا دل کیا مانگتا ہے، بس آنکھیں بند کیے رکھیں سب نے اور یہ ہو گیا۔ ماوئی نے دل سے دعا کی اور ثمینہ سے ملنے تایاجی کے پورشن کی طرف چل دی۔ ثمینہ کو دیکھ کر اسے دلی خوشی ہوئی، وہ اچھی لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی ویرانی تھی۔ ماوئی نے بھابی سے ملی ساری معلومات اسے دے دیں۔

''دل و دماغ سے تمام خدشات اور ماضی کی باتوں کو جھٹک کر نئی زندگی شروع کرو ثمینہ۔ تم فرید کو بھول جاؤ گی۔ جاوید لالہ اور ان کا خاندان بہت اچھا ہے۔ وہ ہمارے کنبے سے بہت مختلف ہیں، تمہارے سارے زخم بھر جائیں گے۔'' ثمینہ محض مسکرا دی، کم گو وہ پہلے بھی تھی لیکن اب بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ پر ماوئی کی باتوں سے کچھ مطمئن ضرور ہوئی تھی۔

☆☆☆

رحمت خان .... ماوئی کا باپ، حشمت خان کا چھوٹا بھائی یعنی ثمینہ کا چچا تھا جو گن پوائنٹ پر اسے فرید سے طلاق دلوا کر گھر لایا تھا۔ بھائی کی حیثیت سے حشمت خان نے اس بار بھی اسے شادی کے معاملات میں آگے، آگے رکھا۔ جب اس کی جاوید خان سے ملاقات ہوئی اور اس کا خاندانی پس منظر معلوم ہوا تو وہ حسد سے پاگل ہونے لگا۔ حشمت خان گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس رشتے نے اس کی بیٹی کی زندگی سنوار کر بھائی کے دل سے محبت کا پودا اکھاڑ پھینکا ہے۔ اب اس دل میں حسد اور بغض کا بیج نمو پا رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی حالت شاہنواز اور جنت بی بی کی بھی تھی۔ یہ تین افراد دل میں کینہ چھپائے دن رات انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔

''جس بے حیا لڑکی نے میرے بیٹے کے منہ پر کالک ملی وہ اس کی زندگی کو سیاہ کر کے اب خود کیسے شہزادے سے بیاہ رچا رہی ہے۔ حشمت ایسا خود غرض اور نیچ نکلے گا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' دھیمی آواز میں سانپ کی سی پھنکار لیے جنت بی بی کہہ رہی تھی اور رحمت خان بھی سرخ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ شاہنواز اسی وقت اٹھ کر گیا تھا۔ وہ بھی اپنی غیرت پر یہ تازیانہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ جاوید خان تو احتشام سے بھی کئی گنا بڑھ کے خوب صورت، خوب رت، مالدار اور رعب والا ہے۔ میری پاکباز، نیک اور معصوم بچی کا تو ایسا اعلیٰ نصیب نہیں ہوا اور اس... بد کردار لڑکی کے نصیب میں ایسا انسان...'' طیش اور غم سے رحمت خان بے قابو ہو رہا تھا۔ جنت بی بی کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اگر جاوید خان حقیقت سے واقف ہوتا تو کیا تب بھی اس بے حیا سے شادی کرتا رحمت؟'' رحمت خان نے چونک کر بہن کو دیکھا۔ اسے بہن کے چہرے پر شاطرانہ چمک دکھائی دی، وہ رحمت خان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اور جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں شعاعوں کے ذریعے سوچوں کے پیغامات نے سفر طے کیا اور رحمت خان نے لب بھینچ لیے۔ وہ گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

جاوید خان کے گھر والوں نے شاندار بری بنائی، لاکھوں کے زیورات چڑھائے، بھاری زیورات، لمبی چوڑی رقم اور جائداد مہر میں لکھی۔ ایک، ایک رسم پر پانی کی طرح پیسہ بہایا اور پورے چاؤ سے ثمینہ کو رخصت کروا کر لے گئے۔ ثمینہ پر ٹوٹ کر روپ چڑھا۔ جاوید خان بھی بہت خوبرو لگ رہا تھا۔ اس کی حسین سنگت میں ثمینہ کے زخم واقعی بھر گئے۔ ماوئی کی بات سچ نکلی، وہ واقعی فرید کو بھول گئی اور خود پر بیتے مظالم بھی فراموش کر گئی۔ وہ بھی ان کے قبیلے کا تھا لیکن ان کے ہاں سختیاں کم تھیں، عورت ایسی بے مول نہ تھی۔ پابندیاں صرف کنواری لڑکیوں کے لیے تھیں۔ شادی کے بعد انہیں میکے اور سسرال دونوں جگہ حیثیت کے مطابق مان دیا جاتا تھا۔ ثمینہ گھر کی بڑی بہو تھی، اس کا تو درجہ ہی اور تھا۔ غصہ اور انا تو جاوید خان میں بھی تھی لیکن اس کا استعمال وہ بے جا نہیں کرتا تھا۔ وہ محبت کرنے والا اور احساس کرنے والا مرد تھا، ہمہ وقت ماتھے پر تیوریاں سجائے نہیں پھرتا تھا..... مسکراتا بھی تھا۔ جاوید خان کو کھلتی ہوئی گندمی رنگت والی سادہ اور کم گو ثمینہ پسند آئی اسی لیے اس نے اسے عزت بھی دی اور محبت بھی۔ ثمینہ کو بھلا اور کیا چاہیے تھا۔ خاندان میں ان کی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ حسب روایت وہ پہلے سسرال کی دعوتیں نمٹاتی پھر میکے کی باری آتی۔ زندگی گل و گلزار ہو گئی تھی۔ مسلسل ایک ماہ سسرالی دعوتوں کے بعد میکے کی دعوت کا آغاز حشمت خان کے گھر سے ہوا۔ ثمینہ اپنی نادانی بھول چکی تھی اور اس کے گھر والے بھی معاف کر چکے تھے۔ لیکن حاسدین بھلاتے ہیں نہ معاف کرتے ہیں۔

جب وہ جاوید خان کے ہمراہ میکے آئی تو ان دونوں کے چہروں پر پھیلا سکون، خوشی اور باہم محبت و ہم آہنگی رحمت خان، جنت بی بی اور شاہنواز کو بری طرح چبھی۔ وہ اسے محروم تمنا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک بہترین طعام کے بعد ان دونوں کو قیمتی تحائف کے انبار کے ہمراہ رخصت کیا گیا۔ جاوید خان کو سسرال سے ملا پروٹوکول اور تحائف بے حد پسند آئے۔ گھر کے ہر فرد کے لیے قیمتی تحائف الگ سے دیے گئے تھے۔ وہ رات ان دونوں کی زندگی کی خوب صورت ترین اور یادگار ترین رات تھی۔ دوسری طرف وہی رات رحمت خان اور شاہنواز کے لیے کانٹوں بھری ثابت ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''ہماری کزنز بورڈ کے امتحان دیتی ہیں اور ہم یونیورسٹی کے امتحان دیں گی، کتنے اعزاز کی بات ہے ناں! ہیں تو ہم بھی فرسٹ ایئر کی طالبات لیکن ہم یونیورسٹی کی طالبات مانی جاتی ہیں۔ پراؤڈ ٹو بی آ ہوم اکانومسٹ۔'' منزہ فخر سے گردن اکڑا کر بولی تو ماوئی ہنس دی۔ وہ دونوں اس وقت ساری گپ شپ اور مستیاں بھلائے ادھورے کام نمٹانے میں مگن تھیں۔ فروری کا اوائل دن تھا اور پڑھائی عروج پر تھی۔ ہر ٹیچر اسائنمنٹس، ٹیسٹ اور پراجیکٹس دینے میں آگے، آگے تھی۔ پریکٹیکل بھی زور شور سے چل رہے تھے۔ آرٹ کے پراجیکٹس کے لیے لڑکیاں سب سے زیادہ ہلکان ہوتیں کیونکہ ان میں نمبروں کا دارومدار صفائی، اوج کمال اور خوب صورتی پر ہوتا۔ فروری کے آخر یا مارچ کے پہلے ہفتے میں بی ایس سی کے ضمنی امتحان بھی لیے جاتے، اس لیے سب لڑکیاں اپنے مشاغل اور

مسائل بھلا کر سنجیدہ ہوگئی تھیں۔ ٹیچرز پر بھی انتظامیہ کی طرف سے طالبات کو اسی فیصد کورس مکمل کرا دینے کا دباؤ تھا جبکہ بقیہ بیس فیصد ضمنی امتحانات کے بعد اپریل میں مکمل کروایا جاتا۔ مئی کا مہینہ امتحانات کی تیاری کا ہوتا جس میں چھٹیاں دے دی جاتیں کیونکہ جون میں سالانہ امتحانات ہوتے تھے۔ ان چند مہینوں میں تقریباً ہر طالبہ اپنی ٹیچر سے نالاں وشکوہ کناں نظر آتی۔ صرف ماوی اور منزہ تھیں جو اپنے کالج کی دیوانی تھیں۔ پورا کالج بھی ٹیچرز کی یا کالج کے اصولوں کی برائیاں کرتا پھرے لیکن وہ دونوں ہر سخت سے سخت اصول میں سے بھی مثبت پہلو نکال لینے میں ماہر تھیں۔

ضمنی امتحان کی ڈیٹ شیٹ نوٹس بورڈ پر لگی تو لڑکیوں کی پریشانی کا گراف تیزی سے بلندیوں کو چھونے لگا۔ فرسٹ ائیر پہلے، پہلے تجربے کی بنا پر باقی کلاسز سے زیادہ پریشان دکھائی دیتی۔ یونیورسٹی امتحان کی سختی اور پیپروں کے حوالے سے سنا بھی تو بہت کچھ تھا۔ کورس کی کتابیں پڑھ کر انہی میں سے سوالات کے جوابات پرچے میں لکھ کر کالج آجانے والی لڑکیاں جب یہ سنتی تھیں کہ کالج میں کورس کی کتاب لازمی نہیں بلکہ باہر سے بھی سوال آجاتے ہیں تو ان کے ہاتھوں کے طوطے' مینا سب اڑ جاتے۔ ان دنوں ٹیچرز لائبریری سے پچھلے پانچ سالہ پرچے نکلوا کر ان میں آیا ایک ایک سوال پڑھ کر طالبات کو سمجھاتیں اور سوالات کیسے انوکھے رخ سے آتے ہیں، لڑکیاں دیکھ، دیکھ کر خوفزدہ ہوتی رہتیں۔ ٹیچرز فرسٹ ائیر پر خصوصی توجہ دیتیں اور انہیں جواب لکھنے کا بہترین طریقہ سمجھاتیں، بہترین نوٹس کے لیے ریفرنس بکس کے نام لکھواتیں، تب منزہ زور، زور سے سر ہلا، ہلا کر کہتی۔

''اس کالج کے اصول جتنے بھی سخت ہوں لیکن یہاں کی ٹیچرز جیسی کسی اور کالج میں نہیں ملیں گی۔ اتنی مخلص، محنتی اور دوستانہ انداز والی کہ ہر وقت مدد کے لیے تیار رہتی ہیں اور ماتھے پر شکن تک نہیں آتی۔'' اس کی بات سچ تھی۔ ہوم اکنامکس کا ماحول ہی جداگانہ تھا۔ ٹیچرز کا رویہ بے حد دوستانہ ہوتا اور طالبات کی ہر بات کو اہمیت دی جاتی۔ ہر دو ماہ بعد ہر ٹیچر کلاس میں لڑکیوں کو اپنا نام لکھے بنا پرچے پر فیڈ بیک دینے کا کہتیں جس میں طالبات کو جو بھی شکایات ہوتیں وہ کھل کر لکھ دیتیں۔ ٹیچرز تمام پرچیاں پڑھ کر طریقہ تدریس میں بہتری لانے کی کوشش کرتیں اور طالبات کے اعتراضات کے جواب بھی خوش دلی سے دیتیں۔ یوں ٹیچرز کو برا بھی نہیں لگتا اور لڑکیوں کی شکایات بھی دور ہو جاتیں۔

☆☆☆

وہ فرحان کے ساتھ گھر کے پچھلے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ملاقات کی یہ آزادی بھی اسے فرحان کی وجہ سے ہی حاصل ہوئی تھی جو سارے خاندان کا چہیتا تھا۔ خاندان کی تمام لڑکیوں کو افشاں سے اس بات پر حسد محسوس ہوتا تھا کہ وہ فرحان جیسے اعلیٰ لڑکے کی من چاہی منگیتر ہے۔ اسے اس بات پر نہ کوئی فخر تھا نہ خوشی لیکن خاندان والوں کو جلانے کے لیے وہ اس بات پر اترائی، اترائی پھرتی۔ اختر بیگم نے برآمدے سے گزرتے ہوئے کھلے دروازے کے پار انہیں بیٹھے دیکھا، عین اسی لمحے افشاں نے اپنا سر فرحان کے کندھے پر ٹکا دیا۔ ان کے حلق میں اندر تک کڑواہٹ گھل گئی۔ وہ ان کی بیٹی تھی، ان کا خون...... اور وہ اسے بہتر طور پر جانتی تھیں۔ انہیں اس پر ذرا بھی اعتبار نہیں تھا، پورے خاندان میں فرحان ہی تھا جو نہ جانے کیوں اور کس جذبے کے تحت اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ جو بھی تھا لیکن اختر بیگم کو افشاں کا فرحان سے یہ التفات جھوٹا لگتا اور چونکہ ایسے کئی مظاہرے انہوں نے پہلے بھی دیکھ رکھے تھے اس لیے انہیں اس پر ذرا اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنی ہی باتوں میں مگن تھے۔

''بس تمہارا بی ایس سی ہو جائے تو میں شادی کروالوں گا، مزید مجھ سے تمہارے بغیر نہیں رہا جاتا۔'' وہ اس کا مرمریں ہاتھ تھامے سچائی سے کہہ رہا تھا۔ افشاں نے بے اختیار اپنا سر اس کے کندھے سے ہٹایا۔ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب تر ہوگئے۔

''کیا تمہارے بھی ایسے ہی احساسات ہیں؟'' زمان نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا تو وہ سر جھکا گئی۔

''ہاں فرحان! میں اپنے گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے عاجز آچکی ہوں۔ نہ جانے کیوں تم نے بی ایس سی کی شرط لگا رکھی ہے۔'' افشاں کو مکمل بھروسا تھا کہ وہ یہ شرط ختم نہیں کرے گا اس لیے دھڑلے سے ایسا شکوہ کیا، وہ نثار ہو گیا۔

''ایسے نہ کہو، ورنہ چھوڑ دوں گا یہ ضد......'' افشاں گڑبڑا گئی، پھر پورے اعتماد سے بولی۔

''اچھا؟ کیا واقعی؟ لیکن اب تو مجھے اپنا کالج اتنا پسند آگیا ہے کہ میرا دل کرتا ہے میں ایم ایس سی بھی یہیں سے کروں لیکن میں جانتی ہوں امی، ابا نہیں مانیں گے۔'' اس نے منہ بسورا تو فرحان سو جان سے فدا ہو گیا۔

''تم ایم ایس سی کرنا چاہتی ہو تو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ تمہارے امی ابو کو میں سمجھا لوں گا بس تم بری ہو کے رہو، میری ہی بنی رہو۔'' اس نے جذب سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''تمہاری ہی تو ہوں۔ پورے خاندان میں ایک تم ہی تو مجھے سمجھتے ہو، ورنہ تو میرے خونی رشتے بھی مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔ میری اپنی ماں کو بھی مجھ سے زیادہ پرائے لوگوں کی باتوں پر اعتماد ہے۔'' وہ اگر اداکارہ بنتی تو اعلیٰ پائے کی اداکاری کرتی۔ اس اداکاری کے مظاہرے وہ فرحان کے سامنے خوب کرتی اور یوں اسے اپنی مٹھی میں قید رکھتی تھی۔ عورت کے آنسو تو ویسے بھی چٹان جیسے مرد کو بھی بھربھری ریت بنا دینے کی قوت رکھتے ہیں اور پھر من پسند عورت کے آنسو تو اسے پانی بنا کر ساتھ بہا لے جاتے ہیں۔ فرحان بھی پانی بن گیا اور افشاں کی باتوں کے بہاؤ میں بہتا چلا گیا۔

''سارے جہاں کے آگے ایک تم میرا ہاتھ تھام کر اپنے اعتبار کی سند نہ دیتے تو میں کیسے جی پاتی بھلا۔ میں کیسے بھلا دوں کہ تم نے اس وقت میرا ساتھ دیا جب سب نے نظریں پھیر لی تھیں۔ زندگی میں تم ہی میرا واحد روزن ہو۔ تم جو کہو گے میں وہی کروں گی۔'' افشاں نے اپنی آنکھوں میں زمانے بھر کا کرب بھر لیا، یہی تو اس کا ترپ کا پتا تھا۔ فرحان کے دل پر براہ راست چوٹ پڑی۔

''بس افشاں بس...... دکھی مت ہوا کرو۔ میں اپنی زندگی میں تمہاری آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ تم خود کسی سے مت الجھنا، تمہاری ہر بات کے لیے میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں۔ ہماری شادی تمہارے ایم ایس سی کے بعد ہی ہوگی بس تم یکسوئی سے پڑھائی کیا کرو۔ ساری زندگی پڑی ہے پھر تو تمہیں ہی دیکھنا ہے اور تم ہی سے باتیں کرنی ہیں۔ لیکن ایک بات تم بھی ہمیشہ یاد رکھنا۔'' وہ ایک پل کو رکا تو افشاں کی سانس تھمی۔ اس کا اگلا جملہ کیا ہوگا وہ بخوبی واقف تھی، جو وہ ہر وقت دُہراتا تھا، اور ہر بار افشاں کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا۔

''کیا......؟'' اس نے عادتاً سوال کیا۔

''جب شادی ہو جائے گی تب صرف میں اور تم...... تیسرا وجود اپنے اور تمہارے بیچ مجھے کوئی بھی برداشت نہیں، اپنی اولاد بھی نہیں۔ اس بات کا خاص دھیان رکھنا کہ میں تمہیں دیکھوں اور تم مجھے...... خاموشی، سکوت اور محبت۔ اس کے علاوہ کوئی جذبہ صادق نہیں۔ سب سچ ہے...... سب بکواس......'' وہ کہتا جا رہا تھا اور افشاں پل، پل مر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جب، جب نومولود کی نرمی و نزاکت محسوس کرنے کو تڑپتے، اس کی فرحان سے نفرت بڑھتی جاتی۔

☆☆☆

اگلے ویک اینڈ پر وہ منزہ کے ساتھ اس کے گھر گئی تو راشدہ بیگم پہلے سے بڑھ کر بے قراری سے ملیں۔ نائمہ بھی بے اختیار اس کے گلے لگ گئی اور شرمیلے سے اظفر نے ہاتھ ملایا۔ وہ دونوں اندر گئیں تو بابا اور احمر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ پہلی بار احمر سے اپنے تاثرات کو قابو کرنا محال ہو گیا۔ بابا سے سر پر پیار لے کر جب وہ سیدھی ہوئی تو نظر بے اختیار احمر کی نظروں سے جا ملیں۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ نازک حسیات نے کچھ معنی خیز اشارے دیے، وہ بری طرح کنفیوز ہو کر سامنے سے ہٹ گئی۔ اس روز سبھی کے تاثرات میں کچھ انوکھا پن تھا جو ماوی کو کچھ مختلف ہو جانے کا سگنل دے رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ ویک اینڈ اسے کیا تحفہ دینے والا

ہے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ دونوں کمرے میں آئیں تو منزہ اس کا ہاتھ تھام کر بستر پر آ بیٹھی۔ اس کے انداز میں کچھ تو الگ سا تھا جو ماوٸی نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

''کیا بات ہے منزہ؟'' وہ خاموشی سے محبت بھری مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے دیکھتی رہی تو ماوٸی الجھ سی گئی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' منزہ کی مسکراہٹ کچھ اور گہری اور معنی خیز ہوگئی۔

''ایک بات پوچھوں، برا تو نہیں مانو گی؟'' ماوٸی نے بھویں سکیڑ کر مشکوک انداز سے اسے دیکھا۔

''ایسی بھی کیا بات ہے یار...... کہو......''

''میری بھابی بنو گی......؟'' ماوٸی کو لگا کسی نے اس کے سر پر بم پھوڑ دیا ہو یا بھاری پتھر برسا دیے ہوں۔ اسے لگا کہ اس کی دھڑکن رک گئی ہے اور رنگ سفید پڑ گیا۔ اس بار سب کا حد سے بڑھا التفات، احمر کی بدلی، بدلی نگاہیں، بہت کچھ واضح ہونے لگا۔ اس کے اندر کا الارم تھم گیا کیونکہ بات کھل گئی تھی۔ چند لمحے لگے اسے حواس قابو کرنے میں اور پھر اس نے منزہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''یہ کیسا مذاق ہے منزہ......؟'' منزہ کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ ماوٸی کے تاثرات اس کے لیے قطعی غیر متوقع اور عجیب تر تھے۔

''یہ مذاق نہیں ہے ماوٸی، ہم سب کی دلی خواہش ہے۔ ممی کو تم میں اپنی بچھڑی بیٹی نظر آتی ہے، بابا کو بھی تم پسند ہو، میں، نائمہ، اظفر، سب تمہیں چاہتے ہیں اور...... احمر بھائی بھی تمہیں پسند کرنے لگے ہیں، یہی بات سب سے اہم ہے۔ تم ہمارے خاندان کی مشترکہ خواہش بن گئی ہو۔'' ماوٸی نے اپنے لب سختی سے بھینچ لیے اور نفی میں سر ہلانے لگی۔ اس کے چہرے پر چھایا خوف کوئی بچہ بھی بہ آسانی جانچ سکتا تھا۔

''نہیں منزہ...... یہ ممکن نہیں......''

''مگر کیوں......؟'' منزہ بری طرح بے چین ہوگئی۔

''کیا تمہیں احمر بھائی پسند نہیں؟ کیا ہمارا گھرانا پسند نہیں؟'' ماوٸی بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کسی آبشار کی صورت بہہ نکلے، رنگت خطرناک حد تک سفید پڑ گئی۔ منزہ کے لیے اس کا یہ ردِعمل پریشان کن بھی تھا اور حیران کن بھی۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس گئی اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تو وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ منزہ کو دکھ سا ہونے لگا۔

''سوری، آئم رئیلی ویری سوری ماوٸی۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم یوں ہرٹ ہو جاؤ گی۔ پلیز تم روؤ تو مت مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔ پلیز ماوٸی چپ ہو جاؤ۔'' وہ اس کے آنسو پونچھنے لگی لیکن ماوٸی اور تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ منزہ سے اسے سنبھالنا محال ہوگیا۔ وہ اسے کھینچ کر زبردستی بستر پر واپس لائی۔

''یہاں آؤ، بیٹھو تم۔'' اسے حقیقتاً افسوس ہو رہا تھا لیکن ماوٸی کے اس طرح تڑپ کر رونے کی وجہ بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس نے اسے رونے دیا۔ جب وہ خوب رو چکی تو منزہ نے پانی لا کر اسے پلایا۔ پانی پی کر اس نے آنسو پونچھے اور سر جھکا کر بچوں کی طرح بیٹھ گئی۔ جیسے بچے بڑوں کی مار کھانے کے بعد خاموش سر جھکائے منہ بسورے بیٹھ جاتے ہیں۔ منزہ کو بے اختیار اس پر پیار آگیا، وہ گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''اب اگر مناسب سمجھو تو اتنا بتا دو کہ ایسے کیوں روئیں؟ میرے خیال میں میری بات اتنی بھی تکلیف دہ نہیں تھی۔ اتنا تڑپ کر رونے کے پیچھے اصل وجہ شاید کچھ اور ہے۔ کیا میں صحیح سمجھ رہی ہوں؟'' ماوٸی نے لب بھینچ کر اسے دیکھا پھر نظر چرا لیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ منزہ نے گہری سانس بھری پھر پاؤں اوپر کر کے بیٹھی اور کمبل کھول کر اپنے اور ماوٸی کے اوپر پھیلا دیا۔ نرم گرم کمبل نے دونوں کو حرارت کا میٹھا سا احساس دیا۔

''میری منگنی بچپن میں ہی میرے چچا زاد کزن سے ہو چکی ہے منزہ۔'' منزہ کا پورا منہ کھل گیا۔ یوں لگا جیسے کمبل میں کوئی درز رہ گئی تھی جس سے خنک ہوا اندر گھس کر پڈیوں کو سرد کرنے لگی۔

''تم...... تم نے ...... کبھی بتایا کیوں نہیں ماوٸی؟ کیا ہم دوست نہیں ہیں؟ کیا اب بھی اجنبیت کی کوئی دیوار باقی ہے؟ اتنی اہم بات تم نے اب تک چھپائے رکھی، کیوں ماوٸی؟'' منزہ کے انداز میں اتری دکھ کی چبھن سے ماوٸی بے چین ہو اٹھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے منزہ، ایک تم ہی تو میری بہتری دوست ہو تمہارے سوا تو کوئی بھی نہیں ہے۔''

''پھر کیوں چھپایا......؟'' وہ خفا ہوئی۔

''چھپایا نہیں......'' وہ تڑپی۔

''بتایا بھی تو نہیں...... کیا فرق ہے دونوں باتوں میں؟''

''بہت فرق ہے منزہ......'' ماوٸی جیسے بہت تھک کر بولی اور بیڈ کے سرہانے سے سر ٹکا لیا۔ اس کی آنکھیں کنڈر اور چہرہ زمانوں کی تھکن کی زردیاں لیے بوڑھا سا لگ رہا تھا۔ منزہ چہرے پر خفگی پھیلائے اسے دیکھنے لگی جواب اس کے کمرے کی چھت کے ڈیزائن کو گھور رہی تھی۔

''اس بات میں ایسا تھا ہی کیا بتانے لائق، جو تم سے شیئر کرتی؟'' اب کے منزہ چونکی۔ اس کا رونا، بلکنا، تڑپنا، منگنی کے بارے میں ایسی بات کرنا اور پھر یہ بات...... کچھ تو تھا انہونا سا...... کچھ ایسا جو صحیح نہیں تھا۔

''پلیز ماوٸی کھل کر بات کرو۔'' ماوٸی سیدھی ہو کر بیٹھی اور نگاہیں اپنی کھلی ہتھیلیوں پر جما لیں۔ بات بھی اب اس کی ہتھیلی کی طرح کھلنی ہی تھی کیونکہ وقت آگیا تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے اندر کی تھکن کا کچھ حصہ ہوا کے سپرد کر دیتی اور سکون کے کچھ پل حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ فروری کی سرد ترین رات میں ماوٸی نے اپنی سرد مہری زندگی کے اسرار کی پرتیں کھولنی شروع کر دیں۔ گرم کمبل اور کمرے میں جلتے ہیٹر کے باوجود اس کی زندگی کی سرد مہری منزہ کے وجود میں یخ جھرجھری دوڑا گئی۔

''میں ملک کی چار بڑی سیاسی جماعتوں میں سے ایک کے مشہور رہنما اور قومی اسمبلی کے ممبر رحمت خان کی بیٹی ہوں منزہ...... تم نے نام سن رکھا ہوگا لیکن اس نام کے ساتھ جڑی حقیقتیں کوئی نہیں جانتا۔ ہمارے قبیلے میں عورت کی حیثیت ڈھور ڈنگر سے بھی نچلے درجے کی ہے۔ بظاہر ہمارے خاندان کا ایک نام ہے، ساکھ ہے، مرد و زن سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، بظاہر ہماری عورت پر کوئی پابندی نہیں، آنا جانا، گھومنا پھرنا، پہننا اوڑھنا، خرچہ پانی، فیشن...... کوئی بھی چیز ممنوع نہیں لیکن یہ سب دنیا کو دکھانے کے لیے ہے۔ ہماری زندگیوں کی اصل حقیقت ہم ہی جانتے ہیں۔'' وہ ایک ہاتھ سے مسلسل دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی کو مسل رہی تھی۔ یوں جیسے لکیریں مٹا دینا چاہتی ہو لیکن انسان کے چاہنے سے اس کی قسمت کا لکھا مٹ سکتا تو رونا ہی کس بات کا تھا بھلا۔

''ہمارے ہاتھوں میں پڑی ہتھکڑیاں اور پیروں میں پڑی بیڑیاں ہمارے قیمتی اور خوب صورت ملبوسات کے اندر پوشیدہ ہوتی ہیں۔ وہ کسی کو نظر آ سکتی ہیں اور نہ ہی ہمیں اپنا تن کھول کر وہ زنجیریں دکھانے کی اجازت ہے۔ جوڑ یا بے جوڑ، ہمارے رشتے ہماری پیدائش کے ساتھ ہی طے کر دیے جاتے ہیں۔ ہماری آزادی صرف تکمیلِ تعلیم تک ہوتی ہے اور ہماری قید کا آغاز ہماری شادی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ تم اس قید کی اذیت کا اندازہ نہیں لگا سکتی منزہ جس میں جسم آزاد نظر آئے لیکن روح مقید ہو۔'' رات ڈھل رہی تھی اور ماوٸی ٹیک لگائے پیر پسارے یوں سکون سے بول رہی تھی جیسے پریوں کی داستان سنا رہی ہو لیکن اس کے لفظوں میں ٹوٹے کانچ کی چبھن منزہ صاف محسوس کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بکھری زندگی کی خون آلود دھجیاں واضح دکھائی دیتی تھیں۔

''ہم بیویاں نہیں باندیاں بن کر جاتی ہیں۔ شوہر کی ایک آنکھ کی ایک جنبش کی غلام۔ اس ایک جنبش کو نظر انداز کرنا گویا کبیرہ گناہ ہے۔ ہمیں بیمار پڑنے کا حق ہے اور نہ سست پڑنے کا۔ ہمارے شوہر ہمارے وجود کے ایسے مالک ہیں کہ وہ ہمیں جانوروں کی طرح جھنجھوڑ بھی دیں تو ہمیں اُف کہنے کا حق نہیں۔'' منزہ کو

جھرجھری آگئی۔

''اور اس سب کے باوجود ہمیں اتنا درجہ حاصل نہیں ہوتا کہ ہم اپنی ہی اولاد کے کسی معاملے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکال لیں۔ اولاد کے نام سے لے کر اس کے آخری مقام تک کے بارے میں ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا فیصلہ ہمارے گھر کا مرد لیتا ہے۔ عورت کو صرف حکم سنانا ہے چاہے وہ اس کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ میری ماں چاہ کر بھی مجھے یا لالہ کو چوم نہیں سکتی، ہمیں بے حس بننا پڑتا ہے۔ عورت مرد کی صرف ضرورت ہے، محبت نہیں۔ عورت سے محبت گناہ ہے ہمارے خاندان میں کیونکہ عورت کو محبت دو تو وہ سر چڑھ جاتی ہے اس لیے اسے پیر کی جوتی بناؤ، سر کا تاج نہیں۔ تاکہ وہ پیروں سے اوپر نظر بھی نہ اٹھا سکے۔''

منزہ کی آنکھ سے ایک آنسو چپکے سے لڑھک گیا۔ وہ اتنی محو تھی کہ محسوس ہی نہ کر پائی۔ ماوئی نے مسکراتے ہوئے اس کا آنسو اپنی انگشت شہادت پر چنا تو وہ چونکی۔

''کیا یہ ظلم نہیں منزہ کہ ہمیں دنیا کی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں سے روشناس کروا کر بینائی چھین لی جاتی ہے؟ آزادی کا چہرہ دکھا کر ہاتھوں میں بیڑیاں تھما دی جاتی ہیں...... اگر ہمیں روزِ اول سے ہی ان پڑھ، جاہل رکھا جاتا، گھروں میں مقید رکھا جاتا تو شاید تب ہم ان بیڑیوں کو قیمتی زیور سمجھ کر تن پر سجا لیتیں، پیروں میں پازیب بنا کر پہن لیتیں لیکن یوں......'' ایک سسکی اس کے حلق سے آزاد ہوئی تو اس نے لب بھینچ لیے۔ منزہ نے تکلیف اور دکھ سے آنکھیں زور سے میچ لیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ماوئی کو خاموش کروا دے۔ اس سے تو صرف سننا محال تھا، ماوئی خود پر سہتی کیسے تھی؟

''جب تم مجھے افشاں کے بارے بتا رہی تھیں تو تمہارا حرف، حرف درست تھا۔ تم نے صحیح کہا تھا کہ بن روزن کے کمرے میں صرف محبت گھٹتی سانسیں بحال نہیں کر سکتی۔ یہ بات مجھ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔ احتشام، میرا منگیتر اور چچا زاد، مجھ سے بالکل ویسی ہی محبت کرتا ہے جیسے افشاں کا منگیتر اس سے کرتا ہے لیکن صرف محبت انسان کو کچھ نہیں دیتی۔ پابندیوں، روایتوں اور مجبوریوں میں جکڑی محبت جو صرف بند کمروں میں ظہور پذیر ہو اور کمرے سے باہر روایتوں کی بھینٹ چڑھ کر محبت کو اجنبی بنا دے، ایسی محبت گھٹن زدہ قفس میں روزن نہیں بنا کرتی بلکہ سم قاتل بن جاتی ہے۔ وہ محبت جو وہ کسی گناہ کے مانند چھپا کر مجھے دے گا، کیونکہ ہمارے خاندان میں مرد کی عورت سے علی الاعلان محبت مردانگی کے منافی سمجھی جاتی ہے۔ احتشام بھی یہی کرے گا۔ بند کمرے میں مکمل میرا اور کمرے سے باہر بیگانہ۔ یہی اصول ہے، خواہ کچھ بھی ہو جائے، وہ کبھی میرے دکھ میں ہم راہی بن سکے گا، نہ درد میں ہمدرد۔ کیا کروں میں ایسی بزدل محبت کا؟'' وہ خاموش ہو گئی اور جیسے ساری کائنات خاموش ہو گئی۔

''ایسا کیوں ہے ماوئی؟'' منزہ کے سوال میں بچکانہ ضد تھی، ماوئی تلخی سے ہنس دی۔

''بس یہ اصول و قوانین ہیں ہمارے ہاں، مردانگی کے معیار ہیں۔ میرے خاندان کی عورتیں کیسے جیتی ہیں یہ میں جانتی ہوں۔ سوچو ایسے شخص کے بارے میں منزہ جسے اپنی موت کا دن پہلے سے معلوم ہو، اس دن کے قریب آ جانے کا خوف کیا اسے بھیک کی طرح ملی ہوئی درمیانی مہلت کو بھی ڈھنگ سے جینے دے گا؟ وہ موت سے پہلے ہی مر جائے گا۔ بس یہی حال ہے ہمارا بھی، ہم خوب جانتے ہیں کہ ہماری کھل کر سانس لینے کی یہ مدت کتنی ہے۔ ایسی کرب ناک آگہی کے ساتھ اس وقتی آزادی کے خوش گوار پل بھی خوشگوار نہیں لگتے منزہ...... ہم پل، پل مرتے ہی رہتے ہیں۔'' منزہ نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

رات آدھی بیت چکی تھی، خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور ماوئی کی داستانِ حیات ان دونوں کی آنکھوں سے نیند چھین کر لے گئی تھی۔ رتجگے کا یہ تجربہ منزہ کے لیے پہلا تھا جبکہ ماوئی کی تو زندگی عبارت تھی ایسے رتجگوں سے۔

☆☆☆

محبت میں جب ہمدردی کا عنصر بھی شامل ہو جائے تو محبوب رونے کے لیے کاندھا دینے کے ساتھ، ساتھ گولی کھانے کے لیے سینہ بھی پیش کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ہمدردی کسی بھی جذبے کے لیے عمل انگیز کا سا کام کرتی ہے۔ ماوئی کے لیے ان سب کے دلوں میں موجود محبت پر جب ہمدردی کا تڑکا لگا تو جذبات کی شدت نقطۂ ابال کو چھونے لگی۔ جب وہ راشدہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر روئی تو اسے اپنی بہو بنا لینے کے فیصلے میں اگر چند فیصد بھی کوئی تذبذب حائل تھا تو وہ بھاپ بن کر اڑ گیا۔ ان کا ارادہ مزید مضبوط ہو گیا۔ دانش صاحب نے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ کا یقین دلایا۔

''اگر تم اپنے سسٹم کے خلاف آواز اٹھانا چاہو اور ہماری بیٹی بننا چاہو تو ہم ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہیں اور اگر تم ایسا نہیں چاہتی تب بھی میں سب کو سنبھال لوں گا لیکن دونوں صورتوں میں ہماری مکمل حمایت تمہیں حاصل رہے گی، تمہارے جانی تحفظ کی میں تمہیں یقین دہانی کرواتا ہوں۔ مگر بات وہی ہے کہ جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔'' جو بات ان کہی ہو وہ تڑپاتی نہیں، ان کہی ایک بار لفظوں میں ڈھل جائے تو نیندوں سے سکون کا عنصر کھا جاتی ہے۔ دل میں ٹھہری ہوئی کسک بن کر لحظہ لحظہ اپنے حصول کے لیے اکساتی ہے۔ ماوئی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ جب تک جذبے ان کہے تھے، وہ مطمئن تھی، صابر و شاکر تھی اور ثابت قدم بھی۔ جذبوں کو زبان کیا ملی کہ دل کی خلش کو ہوا دے گئی۔ ثمینہ کی آواز کہیں سے اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

''محبت ہو گئی ہے ناں۔ پہلے محبت جو نہیں ملی تھی، اب ملی ہے تو چھوڑی نہیں جا رہی۔ تم خود بتاؤ ماوئی، کیا تم احتشام سے شادی کر کے اس زندان میں خوش رہ لو گی؟ اگر تمہیں بھی فرید جیسا کوئی چاہنے والا، کوئی نجات دہندہ مل جائے تو کیا تم اسی دل سے احتشام کی بن پاؤ گی؟ دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دینا۔'' اس نے بے اختیار دل پر ہاتھ رکھا اور وہ دل کی گہرائیوں سے ثمینہ کے جذبات سمجھ گئی۔ اس کی تڑپ، اس کا جنون اور پھر وہ جرأت...... یہ سب مراحل کیسے طے کر لیے ثمینہ نے، اب وہ بخوبی سمجھ رہی تھی۔ پھر منزہ کی آواز کان میں گونجی۔

''جہاں خاندان والے سخت ہوں، ماحول گھٹن زدہ ہو وہیں لڑکیاں بغاوت کرتی ہیں۔ اس میں کوئی انوکھی بات نہیں کیونکہ بغاوتیں گھٹن ہی کی گود سے جنم لیتی ہیں۔ بے جا پابندیاں بھی ایک حد تک ہی برداشت کی جا سکتی ہیں۔ برتن گنجائش سے زیادہ بھرا جائے تو چھلکنا لازم ہے۔ پھر چھلک کر بہنے کا راستہ نکل ہی آتا ہے، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔'' اس کا دماغ سُن ہو گیا۔ اس بار ویک اینڈ سے ہاسٹل واپسی سوہانِ روح لگ رہی تھی۔ وہ کئی بار برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر واپس چڑھی اور بار، بار منزہ اور اس کی ممی کے گلے لگ کر روئی۔ سب کی آنکھیں نم تھیں۔ اس بار احمر انہیں چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ کار کے پاس دروازہ کھولے منتظر کھڑا یہی منظر دیکھ رہا تھا اور دل کو مغموم ہونے سے روک نہیں پا رہا تھا۔

''میں آپ کو بہت مس کروں گی آنٹی، کاش میری ماں آپ جیسی ہوتی یا کاش میں آپ کی بیٹی ہوتی۔ آپ نے میری محرومیوں کو جگا دیا ہے آنٹی اب بہت درد ہوتا ہے۔'' وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تو راشدہ بیگم نے اسے خود میں بھینچ لیا۔

''میں ہوں ناں تمہاری ماں بیٹا، آنٹی نہیں ممی کہو مجھے۔'' اس نے آنکھیں سختی سے بند کر کے ان کے مہربان سینے میں منہ چھپا لیا۔ بن مانگے، بنا مول کے مل رہی تھیں اسے یہ انمول محبتیں...... وہ دل اور دامن دونوں بھر لینا چاہتی تھی تاکہ زادِ راہ رہے۔

''اوکے ممی۔'' انہوں نے خود اسے کار میں بٹھا کر یوں رخصت کیا جیسے بیاہتا بیٹی کو سسرال رخصت کرتے ہیں۔ سارے راستے وہ منزہ سے لگی آنسو بہاتی رہی اور احمر کے دل میں اترتی چلی گئی۔ وہ ہاسٹل کے گیٹ پر اتری تو احمر نے اتر کر اس کا بیگ اٹھایا اور گیٹ تک آیا۔

''تمہارا فیصلہ جو بھی ہوا، تم ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گی۔ خواہ تمہارا فیصلہ ہزار بار بدلے، میں تمہیں ہمیشہ اسی جگہ کھڑا ملوں گا...... ہر بار۔'' وہ اپنی

جگہ پر منجمد ہوگئی، نہ آگے بڑھ سکی، نہ پیچھے مڑ کر اسے جاتا دیکھ سکی۔ وہ بیگ اس کے پیروں کے پاس رکھ کر مڑا اور کار میں جا بیٹھا۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور دور تک چمک دار سڑک پر جاتی اس گاڑی کو دیکھتی رہی پھر نقطہ بن کر معدوم ہو جانے پر وہ تھکے، تھکے قدموں سے آگے بڑھی اور ہاسٹل گیٹ کے اندر قدم رکھ دیا۔

☆☆☆

وہ اپنے دوستوں میں راجا اندر جیسی حیثیت رکھتا تھا۔ بلاشبہ اس کی شخصیت پُرکشش تو تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ اس جیسا یا اس سے بڑھ کے دنیا میں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ اس سے کہیں زیادہ وجیہہ شخصیت کے مالک لڑکے ڈیپارٹمنٹ میں موجود تھے لیکن اس کے انداز میں کوئی بات تھی، کوئی خاص قسم کی مقناطیسیت، جو مقابل کو جکڑ لیتی تھی۔ اس کا پہناوا بہت اعلیٰ تھا، چال ڈھال میں رعب، انداز میں بے نیازی، آنکھوں میں غرور اور قدم اٹھانے کے انداز میں ایسا انوکھا پن تھا کہ سرسری اٹھی پہلی نظر ارادتاً دوسری بار اس پر ضرور اٹھتی تھی۔ حالانکہ اس کے نقوش بھی عام سے تھے اور رنگت بھی گندمی۔ وہ کوئی گلفام تھا نہ یونانی دیوتا۔ بس اس کا قد بہت لمبا اور جسامت کسرتی تھی۔ اس کے ہر ہر انداز میں مردانہ پن جھلکتا تھا اور اسی لیے اسیرانِ ہمایوں خان کی فہرست خاصی لمبی تھی۔ خصوصاً لڑکیوں میں۔ ہمایوں خان آفریدی کو کوئی لڑکی ''نہ'' نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ لیڈی کلر تھا۔ خود سے کبھی کسی کے پیچھے نہیں بھاگتا تھا لیکن جو اس کے پیچھے چل کر آتی تھی اسے انکار بھی نہیں کرتا تھا۔ ''مغرور'' وہ لفظ تھا جو اس کے لیے موزوں ترین تھا۔ یونیورسٹی فن فیئر میں وہ اپنی قاتل ڈریسنگ کے ہمراہ پورے جوش و جذبے سے شریک تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی تھی جس کے فن فیئر کا پورے پشاور کو کھلا دعوت نامہ تھا۔ پورے شہر میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے بل بورڈز اور بینرز کے ذریعے اشتہاری مہم چلائی گئی تھی۔ ہمایوں خود آئی ایم ایس پشاور یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا لیکن اس یونیورسٹی میں اس کے کچھ کزنز پڑھتے تھے اس لیے وہ بھی فن فیئر سے لطف اندوز ہونے وہاں چلا آیا تھا۔ حنان، سعد، جنید اور راشد اس کے جگری یار تھے۔ ادھر ادھر لڑکیوں کو تاڑنے اور لائن مارنے میں مصروف تھے جبکہ اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا نہ یہ اس کا معیار تھا۔

''یار ہمایوں، آج تو بھی کوئی لڑکی پسند کرلے...... سیریس والی پسند۔'' حنان نے ٹھنڈی ٹھار سوفٹ ڈرنک کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے اس کے کندھے پر دھپ ماری تو وہ نخوت سے منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔

''وہ جو اتنی ساری میرے پیچھے ہیں، ان کا کیا؟'' حنان نے زوردار قہقہہ لگایا پھر بھویں اچکا کر لفنگے انداز میں بولا۔

''وہ ساری تو خود ایک دم فلرٹ ہیں، وقت گزاری کر رہی ہیں۔ میں تو سنجیدہ والی لڑکی کہہ رہا ہوں، ہماری بھابی بنا بھابی۔'' ہمایوں نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

''ان میلوں ٹھیلوں میں مٹکتی پھرتی، ماڈلز کو پیچھے چھوڑتی، فیشن سے لدی، میک اپ کی تہوں میں لپی لڑکیاں بھابیاں بنانے کے لائق نہیں ہوتیں۔ یہ سب صرف چند روز پہلو میں سجانے کے لیے اچھی ہیں بس......'' اس نے اپنی کولڈ ڈرنک ختم کر کے ٹن ہوا میں اچھالا تو جنید نے اس کی بات پر قدرے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔ ان سب میں وہ قدرے شریف تھا اور اس کا ایک عدد سنجیدہ قسم کا معاشقہ بھی چل رہا تھا۔ اس وقت وہ اسی کے انتظار میں تھا۔

''کبھی کبھی ان میلوں ٹھیلوں میں راستہ بھٹک کر خوف زدہ ہرنیاں بھی آ جاتی ہیں، ان میں ہی دیکھ لے۔'' اس کا اشارہ کالج کی لڑکیوں کی طرف تھا۔ ہمایوں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور لبوں میں دبائے استہزائیہ انداز میں ہنسا تو دھوئیں کا ایک ٹیڑھا میڑھا مرغولہ ہوا میں مدغم ہوگیا۔

''خوفزدہ ہرنیوں کو میلے میں آتے ہی جب راستہ مل جاتا ہے تو تتلیاں بننے میں وقت نہیں لگاتیں وہ بھی،

شریف وہ بھی نہیں ہوتیں، بس انہیں موقع نہیں ملا ہوتا۔''

''بات تو سولہ آنے درست ہے یار کی......'' راشد نے بیچ میں اپنا حصہ ڈالا۔ جنید ہنوز خاموش تھا۔ سعد کسی اسٹال پر پامسٹ بنی لڑکی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیے اس سے اپنا ہاتھ پڑھوانے اور خود اس کا چہرہ پڑھنے میں مصروف تھا۔

''کچھ بھی ہو میں نے تو آج تہیہ کرلیا ہے، ایک عدد سنجیدہ والا افیئر چلانا ہی ہے۔ انتظار میں ہوں کسی معصوم سے چہرے کے۔'' حنان قطعیت سے کہتا ادھر اُدھر متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ مختلف گرلز کالجز کی بسیں طالبات کو لیے آرہی تھیں اور خوفزدہ ہرنیاں ایک دوسرے کے پیچھے چھپتی چھپاتی پنڈال میں داخل ہوتی جا رہی تھیں۔

''وہ دیکھ حنان...... تیری خوفزدہ ہرنیاں......'' ہمایوں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تو حنان سچ مچ اس طرف متوجہ ہوگیا۔ جنید کی گرل فرینڈ بین آ گئی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف نکل گیا۔ راشد بھی حنان کے نقشِ پا پر چل دیا۔ ہمایوں ایک ستون سے ٹیک لگا کر فرصت سے کھڑا ہوگیا اور لاشعوری طور پرانہی لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں تمسخر تھا۔ خوف زدہ ہرنیوں کی آنکھوں میں جوش تھا اور دبا دبا اشتیاق بھی۔ تقریباً سبھی کی نظریں خوب صورت لڑکوں کے گرد طواف کر رہی تھیں۔

''سب ایک سی ہوتی ہیں......'' ہمایوں تلخی سے ہنس دیا۔ تنگ آ کر وہ پامسٹری کے اسٹال پر بیٹھے سعد کے پاس جانے کی غرض سے آگے بڑھا ہی تھا کہ اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ وہ جو کوئی بھی تھی، واقعی سب سے الگ تھی۔ وہ خوف زدہ ہرنی تھی نہ رنگین تتلی، نہ وہ حور پری تھی نہ اپسرا، پر کچھ تو بات تھی اس میں۔ ایک وقار، اعتماد اور انداز میں بے نیازی...... ویسی ہی... بے نیازی جیسی خود ہمایوں خان آفریدی کے وجود کا خاصا تھی۔ وہ بے اختیار مسمرائز ہوا۔ سانولی سلونی، پُروقار اور بے حد پُراعتمادسی وہ لڑکی ہمایوں خان آفریدی کے سارے عہد اور پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالنے کے لیے پنڈال میں داخل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

فیروزی کامدار لباس پہنے نئی نویلی دلہن کے روپ میں سجی ثمینہ اپنے شوہر جاوید خان کے ہمراہ اپنی خواب گاہ میں پُرتکلف ناشتے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ان کے خاندان کا کوئی مرد دیکھتا تو جاوید خان کو مرد ماننے سے انکار کر دیتا جو حجرے کے بجائے کمرے میں بیوی کے گھٹنے سے لگا ناشتا کر رہا تھا۔ مگر جاوید خان کے خاندان کے رواج اور تھے، وہاں بیٹوں کو حق حاصل تھا کہ وہ جیسے چاہیں بیوی کو رکھیں۔ ناشتا اختتامی مراحل میں تھا جب ملازمہ، ثمینہ کی ساس نیلوفر بیگم کا پیغام لائی۔ انہوں نے ضروری کام سے ثمینہ کو بلوایا تھا۔ وہ جلدی، جلدی چائے ختم کر کے سر پر کامدار دوپٹا جمائے باہر نکل گئی۔ جاوید خان مسکراتی نگاہوں سے دروازے کی سمت دیکھتا ناشتے کے آخری لقمے لے رہا تھا جب اس کا موبائل بجا۔ چچا سسر رحمت خان کا نام دیکھ کر وہ اچنبھے کا شکار ہوا۔ ایک دن پہلے ہی تو ان سب سے تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر یوں ان کا فون وہ بھی صبح سویرے۔ اسے تشویش نے آن گھیرا۔ اس نے کال ریسیو کر کے سلام کیا لیکن رحمت خان سلام دعا کے موڈ میں نہ تھا۔ اس کا انداز عجیب تر تھا۔

''جس لڑکی کو سر آنکھوں پر بٹھا رکھا ہے اس کے کردار کی اصلیت سے بھی واقف ہو یا بے خبری میں ہی مارے گئے تم؟'' جاوید خان کی کشادہ پیشانی پر بل نمودار ہوئے، اس نے نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں کاکا جی (چچا جی)؟''

''تمہاری بیوی کی......'' جاوید خان کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔ اس نے جتانے والے انداز میں ایک، ایک لفظ چبا، چبا کر ادا کیا۔

''میری بیوی...... مطلب...... آپ کی...... بھتیجی؟'' رحمت خان کو اس کی بات بری طرح چبھی۔

''کل شاہنواز خان سے ملے تھے ناں تم؟ میرا

بھانجا...... وہ ثمینہ کا بچپن کا منگیتر تھا، اس کے ساتھ اس کی شادی طے تھی جب یہ اپنے کسی یار کے ساتھ ہاسٹل سے فرار ہوگئی تھی اور صرف فرار ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ نکاح بھی کر لیا تھا۔ تین چار دن بھی گزار لیے تھے۔ تمہارے حصے میں تو برتی ہوئی عورت آئی ہے جاوید خان۔ بہت افسوس ہے مجھے تمہاری بے خبری پر۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ دہاڑا اور ناشتے کی ٹرالی کو زور سے ٹھوکر رسید کی۔ چائے چھلک گئی، برتن بج اٹھے اور شیشے کی ٹرالی چکنے فرش پر بری طرح پھسلتی ہوئی منقش بیڈ کی پائنتی سے جا ٹکرائی۔ رحمت خان نے خباثت سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"یہ بکواس نہیں سچائی ہے۔ میں ہی اسے اس لڑکے سے طلاق دلوا کر گھر لایا تھا۔ حشمت خان نے رشتہ طے کرتے ہوئے تمہیں بتایا نہیں یہ سب...... بچ بچ...... بڑی زیادتی کی......" جاوید خان کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہوگیا، اس کے ماتھے کی موٹی سی رگ پھڑکنے لگی۔ ضبط کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے اس نے ایک موہوم سی امید کا کنارہ تھامنا چاہا۔

"میں کیسے یقین کر لوں؟ کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟"

"ثبوت میرے پاس نہیں...... تمہارے ہی پاس ہے۔" وہ بری طرح چونکا، رحمت خان اسے تفصیل بتا رہا تھا، وہ چند منٹ خاموشی سے سنتا رہا پھر اس نے پوری قوت سے اپنا موبائل کھینچ کر دیوار پر دے مارا۔ وہ دس ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اسی پل ثمینہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے سنگین تاثرات دیکھ کر ٹھٹکی۔

"کیا ہوا خان جی؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹا اور اس کا سلیقے سے لپٹا کامدار دوپٹا کھینچ کر اتارا اور دور پھینک دیا۔ ثمینہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کا ہاتھ خوف سے سینے پر ٹھہر گیا۔ اسے کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"خا...... ن...... جی ی......" جاوید خان نے جواب دینے کے بجائے اس کے نم آلود لمبے بالوں سے کیچر کھینچ کر اتارا اور اسے بھی دور پھینک دیا۔ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا تو وہ کراہ کر رہ گئی۔

"کیا ہوا خان جی آپ......؟"

"خاموش......" وہ دہاڑا تو ثمینہ کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔ رحمت خان کی نشاندہی درست تھی، ثبوت ثمینہ کے سر کے بیچوں بیچ ٹانکوں کی صورت موجود تھا۔ ٹانکوں کے نشانات پر اس کی انگلی کا لمس محسوس کر کے ثمینہ منجمد ہوگئی۔ اسے احساس ہوا کہ شدید قسم کی گڑبڑ ہوگئی ہے۔

"تمہارے سر پر یہ ٹانکے کیسے آئے؟" اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے جیسا ہوگیا...... نچڑا ہوا اور سفید...... وہ جواب نہ دے پائی۔ جاوید نے جھٹکا دے کر اس کے بالوں کو چھوڑا تو وہ لڑکھڑا کر ڈریسنگ ٹیبل سے جا ٹکرائی۔ بھاری چنیوٹی لکڑی نے کر کے پرانے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا۔

"فرید کون تھا؟" اور بس...... ثمینہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی گئی۔ اس کی آنکھوں میں ہراس پھیل گیا۔ ایک بار پھر وہ جواب نہ دے پائی۔

"تو رحمت کاکا سچ کہہ رہا تھا......" وہ پھنکارا اور ثمینہ کی آنکھیں بے یقینی اور دکھ سے پھٹ پڑیں۔ رحمت خان، اس کا سگا چچا، اس کی سہیلی ماوئی کا باپ، ماوئی جو اس کی چھوٹی بہن شائستہ کی دودھ شریک بھی تھی۔ رحمت خان، وہ شخص جس سے اس کے بہت سے رشتے جڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کی بڑی بہن جمیلہ کا سسر بھی تھا۔ جمیلہ جو ماوئی کی بھابی تھی۔ رحمت خان وہ آخری شخص بھی نہ ہوتا جس پر وہ راز افشا کرنے کے معاملے میں شک بھی کرتی۔ اس نے شدت سے موت کی خواہش کی۔ لیکن انسان تو اپنی اگلی سانس پر بھی قادر نہیں تو مقدر پر بھلا کیسے ہاتھ رکھ دے۔ ہونی کو بھلا کیسے ٹال سکتے ہیں۔ اسے دوسری بار بھی طلاق کا دھبا لگوانے والا رحمت خان ہی تھا۔

(باقی آئندہ)

باہر بادل اس زور سے گرج رہے تھے کہ چند لمحوں کے لیے وہ بے خوف لڑکی خوف زدہ ہوئی تھی۔ بجلی کی چمک نے ایک لمحے کے لیے کھڑکی کے پار کا سارا منظر عیاں کر دیا تھا۔ اس نے ایک نظر سامنے برگد کے پیڑ پر ڈالی جو قدرے افسردہ دکھائی دے رہا تھا جس کے سائے تلے اس نے اپنا پورا بچپن بتا دیا تھا۔

شاید وہ اس کے من کا بھید پا گیا تھا اور اب اسے روک نہ سکنے کی وجہ سے ماتم زدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ فوراً کھڑکی سے ہی ہٹ گئی اور اس پُرسوز منظر سے نظریں چرائیں۔ وہ بیڈ پر آ کر براجمان ہوگئی تھی۔ اس سے ذرا ہی فاصلے پر اس کی چھوٹی بہن سو رہی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھنا شروع ہوگئی وہ اتنی پُرسکون نیند سو رہی تھی کہ

مُقدّم

شکیلہ نثار

پرسلہ کو بے اختیار اس پر رشک آیا تھا۔ باہر کا خراب موسم بھی اس کی نیند میں خلل ڈالنے میں ناکام تھا۔

''کیا وہ یہ چہرہ آج کے بعد کبھی دیکھ سکے گی؟''

اس سوچ نے اس کے اندر ہلچل سی مچادی، وہ بے اختیار اس پر جھکی اور اس کی پیشانی پر اپنی محبت کی مہر ثبت کی۔

دفعتاً سیل فون میں وائبریشن ہوئی۔ وہ فوراً چونکنا ہوگئی اور کال پک کرکے فون کان سے لگالیا۔

''پرسلہ تم فوراً پچھلے دروازے سے باہر آؤ، میں باہر کھڑا تمہارا انتظار کررہا ہوں......'' معین نے عجلت بھرے انداز میں اسے ہدایات جاری کیں۔

''ٹھیک ہے، میں بس دس منٹ میں آرہی ہوں۔'' اس نے گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا جس کی ٹک، ٹک کرتی سوئیاں دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔

''دس منٹ کیوں......؟ فوراً باہر آؤ۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی آجائے تم فوراً یہاں پہنچو......'' معین انتظار کی کوفت اور کچھ پکڑے جانے کے خوف سے جھنجلا کر قدرے برہمی سے بولا تھا۔

''ہم...... ٹھیک ہے میں آتی ہوں......'' وہ گہری سانس لے کر بولی اور کال ڈسکنیکٹ کرکے پہلے سے نکالی گئی بڑی سی کالی چادر کو اپنے گرد یوں لپیٹا کہ اس کا سارا وجود اس میں چھپ گیا۔ اس نے ایک پُرسوز الوداعی نظر اپنی معصوم بہن پر ڈالی جو ابھی تک نکل آنے والی قیامت سے بے خبر مزے سے سو رہی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آگئی۔ وہ پچھلے دروازے کی طرف جانے لگی لیکن اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ اس کے دل نے آخری بار والدین کو دیکھنے کی اس قدر شدت سے التجا کی کہ وہ اس التجا کو رد نہیں کرسکی اور اپنے دل کے کہنے پر لبیک کہتے ہوئے وہ راہداری کی طرف بڑھ گئی جس کے ایک کونے میں واقع کمرے میں اسے اس دنیا میں لانے والے دو ذی نفس آرام کررہے تھے جنہیں اب وہ بے آرام کرنے جارہی تھی۔ اس وقت ان کے کمرے میں جانا اس کے لیے خطرے کا باعث تھا اگر وہ اٹھ جاتے تو اس کی راہ میں بڑی مصیبت ہو... لیکن اس وقت وہ سارے خدشات پس پشت ڈا... کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ ماں کے سرہانے کھڑ... اور پھر وہ ایک ٹک انہیں دیکھنے لگی ہنا پلک جھپکا... ڈر تھا کہ اگر وہ پلک جھپکے گی تو وہ غائب ہوجا... کتنی محبت کرتی تھی۔ ماں اس سے ... خوشی کا ہی خیال کرلیتیں تو آج اسے انتہائی قدم نہ اٹھا... پڑتا۔ اس نے کس قدر دکھ اور تلخی سے سوچا۔

''معین میں کیا برائی ہے۔ اچھا بھلا ویل سیٹلڈ لڑکا ہے۔ پتا نہیں ابو کو اس میں کیا برائی نظر آئی کہ ... کی لاکھ منتوں کے باوجود نہیں مانے۔'' وہ کہتے تھے... معین کی ہر دوستی ٹھیک ہے لیکن وہ تو اس کے ساتھ ... سال پڑھتی رہی تھی اسے تو آج تک کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ اس کے ابو جب کسی صورت نہ مانے تو معین نے جو حل پیش کیا وہ چپ چاپ اس پر آمادہ ہوگئی۔ اس لیے کہ اس کے بغیر رہنے کا تصور ہی پرسلہ کے لیے سوہانِ روح تھا۔ اس کے پاس اب صرف پانچ منٹ تھے اس کے بعد شاید وہ کبھی اس گھر اور اس گھر کے مکینوں کو نہیں دیکھ پائے گی۔ وہ صرف ماں کو دیکھے جارہی تھی۔ پتا نہیں کیوں باپ کی طرف دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں ہورہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ ان کی طرف دیکھے گی تو وہ کمزور پڑ جائے گی۔

اور برا ہوا کہ اس نے دیکھ لیا تھا اپنے باپ کی طرف...... وہ یوں سو رہے تھے جیسے کبھی کوئی دکھ ان کے پاس سے بھی گزرا نہ ہو۔ بے اختیار دو آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک کر اس کی کالی چادر میں مدغم ہوگئے۔ اسے ان کا اپنے ساتھ انیس سال کا محبت بھرا ہر لمحہ یاد آیا۔ کیسے وہ اس کی ہر چوٹ پر بے قرار ہوجایا کرتے تھے۔ خواب وہ دیکھتی تھی اور وہ تعبیر بن جاتے تھے۔ ان کی صرف دو ہی بیٹیاں تھیں۔ انہوں نے کبھی بیٹے کی خواہش نہیں کی تھی۔ بیٹیوں کو ہی سب پر مقدم رکھا تھا۔ اس کی خواہش پر انہوں نے بہترین یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی کروا دیا تھا۔ پرسلہ سسکی تھی اور پھر اپنی سوچوں سے گھبرا کر فوراً کمرے سے نکل آئی۔

اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے جس لمحے وہ کمرے سے باہر نکلی ٹھیک اسی لمحے بجلی اس زور سے کڑکی تھی کہ اس کے منہ سے بے اختیار ''ابو'' نکلا تھا اور پھر اسے اپنا دل دو ٹکڑوں میں بٹتا ہوا محسوس ہوا۔ معین سے وہ اس قدر محبت کرتی تھی کہ اسے چھوڑنے کا تصور بھی کرتی تو مرنے والی ہوجاتی۔ اور دوسری طرف اس کا باپ تھا جو اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا جو اس کے چہرے پر آنے والی ہر مسکراہٹ کا سبب ہوتا تھا۔ پچھلے دروازے تک کا رستہ کچھ زیادہ لمبا ہوتا جارہا تھا۔ اس کا ہر قدم من، من بھر کا ہورہا تھا۔ کیا دو سال کا ساتھ انیس سال کے شفقت بھرے ساتھ پر بھاری ہونے جارہا تھا؟

اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا جو مضبوطی سے زمین پر جمے ہوئے تھے اور پھر ایک جھماکے سے ایک یاد روشن ہوئی۔ اسے اپنی ماں کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ جس دن اس نے اپنا پہلا قدم اٹھایا تھا بچپن میں تو کیسے اس کا باپ خوشی سے پاگل ہوگیا تھا۔ ہر گھر میں اس نے مٹھائی بانٹی تھی۔ اسے بار، بار کھڑا کرکے اپنے پاس بلاتے اور جب وہ اپنے ننھے، ننھے قدم ان کی طرف بڑھاتی تو وہ کیسے خوشی سے جھومنے لگتے تھے۔ یہ سب ماں نے اسے بار، بار بتایا تھا تبھی اسے لگتا تھا کہ شاید یہ اس کی اپنی یاد ہے۔ ایک پُرسوزی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی تھی۔ اس نے دوبارہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ کیا یہ پاؤں اس انسان کے ساتھ غداری کریں گے جس نے انیس سال پہلے پہلی بار زمین پر ٹکا کر چلنے کا حوصلہ دیا تھا۔

ہر گزرتا لمحہ اس پر بھاری گزر رہا تھا اور اس کے ارادے کو متزلزل کررہا تھا...... لیکن معین......؟ اس کا خیال آتے ہی اس نے فوراً رسٹ واچ کی طرف دیکھا دس منٹ سے اوپر کا ٹائم ہوگیا تھا۔ وہ باہر انتظار کررہا ہوگا۔ اس سوچ کے آتے ہی اس نے جلد از جلد اپنے رخسار کو چھپا کر خود کو نارمل کرنے کی سعی کی۔ اس نے آخری بار مڑ کر پورے گھر کو دیکھا اور پھر سامنے دیوار پر آویزاں اپنے باپ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے جیسے اپنی ساری ہمت کھودی۔

وہ کیسے ان کے سر کو جھکا سکتی تھی جن کے ساتھ ہونے سے تحفظ کا احساس پورے وجود میں سرایت کرجاتا۔ جنہیں دیکھ کر بے اختیار اللہ کا شکر ادا کرنے کو جی چاہے۔ وہ رو دی تھی لیکن وہ معین کو کیسے چھوڑے۔ یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے کسی کے ساتھ اس گھر سے رخصت ہونا ہی تھا تو پھر معین کیوں نہیں...... اس سوچ نے اس کے اندر کی خود غرض لڑکی کو ابھارا تھا۔ اس لیے وہ اب بنا اِدھر اُدھر دیکھے پچھلے دروازے سے نکل کر گلی میں آگئی اور اس گھر سے باہر آکر اسے ایسا لگا جیسے وہ نخلستان سے نکل کر ویران و بیاباں جگہ پر آگئی ہو...... اسے اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہوا۔

نہیں وہ اتنی بے حس و بے غیرت نہیں ہے جو رات کی تاریکی میں گھر سے بھاگ کر یہ سیاہ رات کی

غزل

تیز ہوا طوفان عروج پہ برسات تھی
میرے آنسوؤں سے بھیگی گہری کالی رات تھی

تیرے لفظوں نے مار ڈالا ہمیں تو راحتؔ
تیرے لیے فقط ایک قصہ ایک بات تھی

تیری اداکارانہ محبت پہ فدا ہے زمانہ
تیرے عشق نے بھلا دیا ہماری کیا اوقات تھی

یہ آنسو یہ درد یہ تنہائی اور یہ جدائی
کیسے چھوڑ دوں تیرے در سے ملی خیرات تھی

ہمیں تو جان سے ہے عزیز یہ رسوائی
آخر تیرے عشق میں ملی یہ سوغات تھی

شاعرہ: راحتؔ وفا۔ سیالکوٹ

کا لک اپنے باپ کے منہ پر مل جائے۔ تحفظ کا جو احساس اسے اس گھر کے دروازے کے اندر محسوس ہورہا تھا وہ جیسے ایک دم سے کہیں غائب ہوگیا تھا۔ اسے ان دیکھا خوف محسوس ہوا چند سیکنڈ لگے اسے فیصلہ کرنے میں اور فیصلہ ہوگیا تھا۔ اسے کچھ فاصلے پر معین کھڑا نظر آیا۔ گاڑی میں اس کا دوست بھی بیٹھا تھا جس نے ریسلہ کی طرف دیکھ کر معین کو خباثت سے آنکھ ماری تھی۔ ریسلہ کو عجیب سا محسوس ہوا۔ معین نے فوراً اس کا اشارہ سمجھا تھا اور اس طرف دیکھا جہاں ریسلہ بت بنی کھڑی تھی۔ وہ لپک کر اس کے پاس آیا۔

''کدھر رہ گئی تھیں تم؟ یہاں پاگلوں کی طرح کھڑے ہم تمہارا انتظار کررہے تھے۔'' وہ اس پر... حتی الامکان آواز آہستہ رکھ کر برہمی سے چلایا تھا۔ اس کے لہجے سے ریسلہ کو یک دم خوف محسوس ہوا۔

''ت......تم اسے کیوں ساتھ لے کر آئے ہو؟'' ریسلہ نے بمشکل اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے اس سے پوچھا اور ایک نظر کام میں بیٹھے اس کے دوست کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں سے ٹپکتی ہوس نے اسے اندر تک لرزا دیا تھا۔

''کیوں ساتھ لانے کا کیا مطلب ہے؟ دوست ہے میرا۔ اس کے فلیٹ میں ہی چند دن رہیں گے اور مشکل میں کوئی تو ساتھ ہونا چاہیے ناں......اور اب پلیز گاڑی میں بیٹھو......کوئی آنہ جائے اِدھر......'' معین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں لے کر جانا چاہا۔ وہ فوراً بدک کر پیچھے ہٹی۔ معین نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا جو اس وقت بدحواسی کا شکار تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں اب؟'' معین نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

''میں یہاں تمہارے ساتھ جانے کے لیے باہر نہیں آئی۔'' ریسلہ نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے اس سے کہا۔ معین کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

''تو پھر کس یہاں کیا جھک مارنے کے لیے بلایا تھا تم نے؟ پاگل ہوگئی ہو؟ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو میں سوری کرتا ہوں مگر اب چلو جلدی یہاں سے۔'' وہ بمشکل اپنا غصہ دباتے ہوئے بولا تھا۔ ریسلہ کو اس وقت اس ماحول اور ان سب باتوں سے وحشت ہورہی تھی۔ وہ بس اپنے گھر میں جا کر چھپ جانا چاہتی تھی۔

''دیکھو معین میں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی جو مجھے تم سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ میں ان سے بہت پیار کرتی ہوں۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں ایک ٹرانس کی کیفیت میں کہہ رہی تھی۔ معین اب کی بار اپنے اشتعال کو دبا نہیں پایا تھا۔

''میں پہلے سے ہی جانتا تھا کہ تم ایک بدکردار لڑکی ہو، جو لڑکی آج میرے ساتھ بھاگنے کو تیار ہے تو وہ کل کسی اور کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوگی۔ بتاؤ کون، کون ہے جسے تم نے میرے علاوہ بھی چکروں میں ڈال رکھا ہے۔'' معین حقارت سے پُر لہجے میں اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہا تھا۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔ کیا وہ اس لڑکے پر یقین کر کے گھر کی عزت کو ملیا میٹ کرنے جارہی تھی جو اسے بدکردار سمجھ رہا تھا۔

''دفع ہو جاؤ تم میری نظروں کے سامنے سے...... میں ہرگز تمہارے ساتھ بھاگنے نہیں آرہی تھی بلکہ تمہیں یہ بتانے کے لیے آئی تھی کہ مجھے تمہاری اس جھوٹی محبت سے زیادہ اپنے باپ کی محبت اور عزت عزیز ہے۔ پتا ہے جب میں اپنے گھر کی چار دیواری میں تھی تو ایک تحفظ کا احساس ہوا تھا مجھے اور اب جب تمہارے روبرو ہوں تو اسی احساس نے مجھے کچھ غلط کرنے سے بچالیا۔ میں اس ذات کی شکر گزار ہوں جس نے لمحوں میں میرا دل بدل دیا۔ مجھے میرے ابو سے زیادہ کچھ عزیز نہیں۔ تم نے ابھی، ابھی کھڑے، کھڑے ہی مجھے بدکردار کہہ دیا اور اگر تمہارے ساتھ چلی جاتی تو جانے کیا، کیا کہہ ڈالتے۔ اب مجھے تم سے شدید نفرت محسوس ہورہی ہے دل کررہا ہے تم پر تھوک دوں۔ یہی تمہاری اوقات ہے۔ مجھے بدکردار کہنے والے گھٹیا انسان تم خود کیا ہو۔'' ریسلہ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہی تھی معین تو جیسے غصے سے پاگل ہوگیا تھا۔ وہ اس کا گلا دبوچنے کے لیے دیوانہ وار آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک زوردار دھکے نے اسے زمیں بوس کردیا۔ ریسلہ بھی سی دیوار سے جا لگی تھی اور پھر انہیں اپنے سامنے دیکھ کر وہ منجمد ہوگئی تھی۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر اچانک ان کی آنکھ کھلی تھی۔ انہیں کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہورہی تھی۔ وہ پانی پینے کے لیے کچن کی طرف بڑھے جب انہیں وہ نظر آئی کالی چادر میں ملبوس وہ کوئی اور نہیں بلکہ ریسلہ ہی تھی جو پچھلے دروازے کی طرف رات کے اس پہر جارہی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس کے پیچھے چل دیے۔ کیا وہ ان کو دھوکا دینے جارہی تھی، کیا وہ رات کی سیاہی ان کے چہرے پر مل کر ہمیشہ کے لیے اس چہرے کو بدنما بنانے جارہی تھی۔ ایک لمحے کو وہ کانپ اٹھے تھے۔ انہوں نے بے اختیار اس لمحے اللہ کو پکارا تھا اور دل سے پکارا تھا۔ اگر انہیں اللہ نے ریسلہ کے لیے جنت کا دروازہ قرار دیا تھا تو اس اعزاز کے صدقے اس نادان کا دل بدل جائے اور اس دروازے کو عبور کرتے ہی وہ اس کے تحفظ کے احساس کو جان جائے۔ انہوں نے اس قدر شدت سے اپنے رب کو پکارا اور دعا کی تھی کہ انہیں خود یقین ہو چلا تھا کہ ان کی یہ پکار رائگاں نہیں جائے گی۔

وہ چاہتے تو اسے بازو سے پکڑ کر روک لیتے مگر انہوں نے فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا جہاں انصاف کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں۔ وہ معجزے کے انتظار میں گلی کی اوٹ میں ہو کر دیکھنے لگے کہ اس لمحے ان پر کیا آشکار ہونے جارہا ہے؟ کیا ان کی دعا رنگ لائے گی؟ کیا باپ کی محبت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے سرکش قدم کو جکڑ لے؟ معین کے بارے میں انہوں نے ساری تحقیقات کروائی تھیں، وہ ایک بگڑا ہوا امیر زادہ تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے معاملے میں تنگ نظر نہیں تھے مگر جس طرح کی معین کی عادات و حرکات تھیں اس نے انہیں کچھ اور سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ ڈرگز کے عادی شخص کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرسکتے تھے۔ معین نے ریسلہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور وہ بے اختیار زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔

کیا وہ اس گھر کو، انہیں اذیت بھری زندگی دے کر چلی جائے گی یہ سوچتے ہوئے دکھ کی ایک تیز لہر ان کے وجود میں سرایت کر گئی۔ اور پھر انہیں ریسلہ کی آواز سنائی دی تھی اور پھر اس کے الفاظ نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ بے اختیار سجدے میں گر گئے تھے اس ذات کے سامنے جس نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا جو دلوں کو سیکنڈ میں پھیر دیتا ہے کتنا کرم کیا تھا اللہ نے ان پر ان کی دعائیں رد نہیں ہوئی تھیں سن لی گئی تھیں وہ سرخرو ہوگئے تھے۔ ان کی پیشانی زمین پر ٹکی ہوئی تھی اور وہ حالت سجدہ میں تھے۔ زمین پر سجدہ جو زمین والوں کی آسمان والے سے محبت کا اعلیٰ مظاہرہ ہے۔ وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اٹھے تھے اور تب انہوں نے معین کو غصے میں ریسلہ کی طرف لپکتے دیکھا۔ وہ بھاگ کر اس کی طرف بڑھے اور معین کو پوری قوت سے دھکا دے کر نیچے گرایا تھا جو انہیں سامنے دیکھ کر حواس باختہ ہوا تھا۔

''یہاں سے فوراً نکل جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ تم میرے اثر رسوخ کو اچھی طرح جانتے ہو......'' وہ گرجدار آواز میں اس پر برس پڑے تھے۔ اور وہ دونوں خوف زدہ ہو کر دم دبا کر بھاگ گئے تھے۔ اب وہ ریسلہ کی طرف مڑے وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر بے اختیار ان کے شانے پر سر ٹکا کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی۔

''ابو مجھے معاف کردیں۔ میں اِدھر اسے بتانے آئی تھی کہ میرے لیے آپ سے بڑھ کر کچھ نہیں......'' وہ رونے کے درمیان کہہ رہی تھی۔ انہوں نے شفقت سے اس کا سر تھپتھپایا۔

''جانتا ہوں بیٹی...... مجھے فخر ہے تم پر کہ تم نے آج میرا سر جھکنے سے بچالیا۔'' وہ محبت سے کہتے ہوئے اسے خود سے لگائے گھر کی سمت چل دیے اور ریسلہ سوچ رہی تھی کہ جو لڑکی عزت کو محبت پر مقدم رکھتی ہے اللہ اسے کبھی رسوا نہیں ہونے دیتا۔ اس جہاں میں اور نہ ہی اگلے جہاں میں۔

☆☆☆

ہمارے بھی تو بچے ہیں، ہم نے کون سا یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔'' ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اب وہ بالوں کو جھٹکے، ہلکے برش کرتی اپنے دماغ میں پنپتے بدترین خدشات کا اظہار کر رہی تھی۔ جہاں فصیحہ اس کی بات پر ایک پل کو خاموش رہ گئی۔ وہیں ذیشان کے کہنے پر شمیلہ کو بلانے آتی آسیہ کے پاؤں جیسے دروازے پر ہی مردہ ہوئے تھے۔

''ویسے ایسا ہو بھی جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ کام کے لیے تین تین نوکر مل جائیں گے ہمیں وہ بھی بنا تنخواہ کے۔'' فصیحہ اب ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں نظر آتے شمیلہ کے عکس پر نظر جمائے بہت دور کی کوڑی لائی تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے بھابی! مگر تین، تین بوجھ بھی تو تمام عمر ڈھونے پڑیں گے۔ پھر آشان بھائی اور ذیشان تو ہمدردی میں اپنے بچوں کے منہ کا نوالا بھی ان ماں بیٹوں کو کھلا دیں گے جو مجھے بالکل منظور نہیں ہے۔'' شمیلہ اب ڈریسنگ کے سامنے رکھے چھوٹے سے اسٹول پر ٹکتے ہوئے ہاتھوں پر لوشن مل رہی تھی۔

''اوہو میں بھی کب ان جنگلیوں کو یہاں لانا چاہتی ہوں، میں نے تو بس ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ دیکھا نہیں تھا تم نے اس کے بچوں کو کیسے ہاتھوں سے جاہلوں کی طرح کھانا کھا رہے تھے۔ بھئی مانا کہ آسیہ شادی کے بعد گاؤں اپنی سسرال چلی گئی تھی۔ بچے بھی وہیں کے ماحول میں پلے بڑھے لیکن باتیں تو خوب بڑی، بڑی بناتی ہے بچوں کو کانٹے چمچ کا استعمال نہ سکھا سکی۔'' فصیحہ کے لہجے میں اب کے ان لوگوں کے لیے ازحد تضحیک تھی۔ آسیہ بوجھل دل لیے وہاں سے ہٹ گئی۔

''چھوڑیں بھابی! اس ڈھگر کو خود کون سا سلیقہ آتے تھے۔ اماں کے بعد ہم نے ہی سکھایا اسے سب کچھ۔ شادی کر کے جان چھڑائی بھی تو منحوس پھر بیوہ ہو گئی۔ کچھ لوگ ہوتے ہی اتنے بدقسمت ہیں کہ خوشیاں ان سے دور بھاگتی ہیں۔'' لوشن کی بوتل ڈریسنگ ٹیبل پر تقریباً پٹختے ہوئے شمیلہ نے دلخراش تجزیہ پیش کیا اور دوپٹا سنبھالتی کچن کی طرف چل دی۔ فصیحہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

''آسیہ! بلایا نہیں شمیلہ کو اسے کہو کہ چائے لائے۔ کھانے کے بعد جب تک میں چائے نہ پیوں مجھے تو لگتا ہے میرا ڈنر ہی ادھورا ہے۔'' وہ اپنے دھواں، دھواں ہوتے چہرے پر ہاتھ پھیرتی لاؤنج میں آ کے بیٹھی تو اسے دیکھتے ہی ذیشان نے مسکرا کے کہا۔

''جی بھائی! وہ کچن میں چائے ہی بنا رہی ہیں۔'' مختصر جواب دیتی اب وہ لان میں فارحہ اور ادریس کے ساتھ کھیلتے عمار اور شہروز کی طرف متوجہ تھی۔ غائب دماغی سے انہیں دیکھ رہی تھی جب آشان لاؤنج میں داخل ہوئے۔

''آسیہ بیٹا! اچھا ہوا آج تم خود آ گئیں۔ ورنہ ہم تمہاری طرف آنے والے تھے۔ دیکھو بیٹا علیم کے بعد اب تمہارا وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر دو بچوں کا ساتھ بھی تو ہے۔ کیسے تم بنا سہارے کے وہاں رہ سکتی ہو، میری مانو تو دونوں بچوں کو لے کر یہاں شفٹ ہو جاؤ۔ تم وہاں رہیں تو ہم دونوں بھائی امی ابا کو کیا منہ دکھائیں گے۔'' گمبھیر لہجے میں کہتے آشان واقعی روزِ قیامت ہونے والی جواب طلبی سے ڈرتے تھے۔

''نہیں بھائی! ایک فوجی کی بیوہ اتنی کمزور نہیں ہوتی کہ مصائب سے گھبرا کے خود کو وقت کی تند و تیز لہروں کے حوالے کر دے۔ ویسے بھی میں اماں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ انہوں نے بھی تو جوان بیٹا کھویا ہے۔ اب میں ان کا سہارا ہوں وہ میرا۔'' اس نے مستحکم انداز میں بات مکمل کی تبھی ٹی ٹرالی دھکیل کے اندر آتی شمیلہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے آسیہ، اب صبیحہ آنٹی نے اپنا بیٹا کھویا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ان سے ان کے پوتے بھی چھین لیے جائیں۔ ایسا کر کے یہ قیامت کے دن علیم کو کیا منہ دکھائے گی۔ وہ تو اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' کن انکھیوں سے آسیہ کو دیکھتی شمیلہ نے بظاہر سارے جہان کی ہمدردی لہجے میں سمو کے درحقیقت اسے ڈرایا تھا۔

''ارے شمیلہ ہم کون سا صبیحہ آنٹی کو ان کے

پوتوں سے ملنے سے منع کریں گے۔ مگر یہ وہاں تنہا رہے گی تو سوچو دنیا کتنی باتیں بنائے گی۔ تم بات صحیح طرح سنتی نہیں ہو اپنی قابلیت جھاڑنے لگ جاتی ہو۔'' چائے کے سپ لیتے ہوئے اب کے ذیشان نے ترش لہجے میں بیوی کو شٹ اپ کال دی تھی۔

''لو بھلا میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو آپے سے باہر ہو رہے ہیں سچ ہی تو بولا ہے۔ غضب خدا کا بھلے کا تو زمانہ ہی نہیں۔'' نخوت سے کہتی شمیلہ اب ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ مگر کان ان بہن بھائیوں کی طرف ہی لگے تھے۔

''شمیلہ بھابی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میرے ساتھ اماں ہیں، میرے بچے ہیں، میں تنہا کب ہوں۔ علیم اماں کے ایک ہی تو بیٹے تھے ان کے بعد میں اگر اماں کو چھوڑ دوں گی تو وہ کیا کریں گی۔ اماں کا ہمارے سوا ہے ہی کون۔'' اس نے مغموم آواز مگر گلوگیر لہجے میں بات مکمل کی۔ آج عدت کے ختم ہوتے ہی وہ یہاں یہ ہی تو کہنے آئی تھی کہ دونوں بھائی ان چاروں کو یہاں لے آئیں مگر کچھ دیر پہلے سنی گئی بھابیوں کی گفتگو جیسے اس کے ارادے پر مٹی ڈالنے کا سبب بنی اندر آتی فصیحہ نے اس کے منہ سے نکلے آخری کلمات سنے تھے۔ دل میں تسکین کی ایک لہر موجزن ہوئی پھر بھی دنیا دکھاوے کو گویا ہوئیں۔

''لو بھلا ان کا ہم نے ٹھیکا لے رکھا ہے۔ میں تو کہتی ہوں بچوں کو بھی چھوڑو دادی کے پاس اور تم یہاں آ جاؤ۔ ہم تمہاری شادی کہیں اور کروا دیں گے۔'' عجلت میں بات کا آغاز کرتی فصیحہ بہت بھونڈے انداز میں ہمدردی جتا گئی تھیں۔ ان کی بات پر شمیلہ کے سوا سب نے ناگواری سے پہلو بدلا تھا۔

''فصیحہ! تم سے ایسا مشورہ کس نے مانگا۔ آسیہ پہلے ہی دکھی ہے اوپر سے تم اوٹ پٹانگ مشورے دے کر اسے اور رنج پہنچا رہی ہو۔ تم میں تھوڑی سی انسانیت بھی باقی ہے یا نہیں۔'' کب سے خاموش بیٹھے آشان اب کے بھڑک کر بولے تھے۔

''ہاں، ہاں بھابی! خاموش رہیں آپ، یہاں بس یہ بہن بھائی ہی فصاحت اور بلاغت کا شاہکار ہیں۔ باقی سب تو جاہل اور بے حس ہیں۔ اونہہ...... یہاں بیٹھنا ہی فضول ہے۔'' فصیحہ بھابی کی جھگڑالو فطرت سے واقف شمیلہ جلتی پر تیل ڈالتی اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

''واہ آشان صاحب واہ یعنی ساری زندگی تمہارے خاندان کی خدمت کے بعد میرا اتنا بھی حق نہیں کہ گھر کے کسی معاملے میں اپنی رائے کا اظہار ہی کر سکوں۔ میں نے جو بھی کہا آسیہ کی بھلائی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہی کہا اور آپ ہیں کہ ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑ گئے۔'' طبلِ جنگ بج چکا تھا فصیحہ کسی بھی بات پر ناراض ہوتیں تو گھنٹوں اسی موضوع پر بلاتردد بول سکتی تھیں۔

''معاف کیجیے گا بھابی مگر یہ آپ کے گھر کا نہیں میری زندگی کا معاملہ ہے۔ اور میں اپنے مسئلے خود سلجھا سکتی ہوں۔ آپ میری وجہ سے آشان بھائی سے مت لڑیں۔ ذیشان بھائی ہو سکے تو مجھے گھر چھوڑ آئیں اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔'' درشتی سے کہتی آسیہ ذیشان کو اٹھنے کا کہتی اٹھ کے باہر کی طرف چل دی۔ فصیحہ حیران سی اس پُراعتماد قدم اٹھاتی مضبوط عورت کو دیکھ رہی تھیں جس نے کبھی ان کے سامنے ہوں ہاں سے زیادہ زبان نہیں کھولی تھی۔ کجا تلخ لہجے میں بات کرنا۔ وہ متعجب سی پلٹیں تو آشان وہاں سے جا چکے تھے۔

☆☆☆

وہ جب میٹرک میں تھی تب ہی امی ابا یکے بعد دیگرے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ وہ جو دنیا کی سیاستوں سے بے خبر ہیرا سے دل کی لڑکی تھی۔ بڑی بھابی ماں بھابھی کے مقولے پر آمنا صدقنا کہنے والی حقیقتاً بھابیوں کی انگلی پکڑ کے دنیا کی دوڑ میں شریک ہو گئی۔ وہ جو دیکھتی تھی بھابیوں کی آنکھ سے دیکھتی تھی۔ اس کی نظر میں اس کی بھابیاں دنیا میں سب سے اچھی تھیں۔ یہ ہی محبت یہ ہی عقیدت اس پر اس قدر حاوی ہوتی چلی گئی کہ اس کی اپنی ذات اپنی چوائس کہیں پس پشت چلی

گئی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اپنی پسند پر بھابیوں کی پسند کو مقدم جاننے لگی۔

"ارے یہ تم نے کیا پہن لیا ہے' بڑھکیلے لباس تو ویسے ہی لڑکیوں پر بہت برے لگتے ہیں۔ یقین جانو تمہارے بھائی نہ ڈانٹیں تو میں تو ہمیشہ ہلکے رنگ ہی پہنوں۔"

خاندان میں شادی کے موقع پر اسے ڈارک پنک کلر میں ملبوس دیکھ کے شمیلہ نے کچھ ایسے شیریں لہجے میں کہا کہ آسیہ کو اپنی تیاری بہت ہی بری لگنے لگی۔ وہ فوراً چینج کر کے آف وائٹ سوٹ پہن آئی جو اس کی گندمی رنگت کو کچھ اور سانولا ظاہر کرنے پر تلا تھا۔ شمیلہ کو کمینی سی خوشی نے گھیر لیا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ گندمی رنگت مگر پُرکشش نقوش کی مالک آسیہ سرخ و سفید گلابی گڑیا جیسی شمیلہ سے زیادہ اچھی لگے۔ پھر بھی وہ شادی میں لوگوں کے سامنے یہ کہنا نہ بھولی کہ آسیہ کو پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہیں۔

"یہ تو اماں تھیں جنہوں نے زبردستی مجھے کالج' یونیورسٹی میں پڑھایا ورنہ میں تو کبھی اتنا پڑھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ بھلا اتنا پڑھ کے بھی ہانڈی چولہا ہی کرنا ہے تو پھر فائدہ اتنی محنت کا۔ تمہارے پاس تو ابھی موقع ہے چھوڑو پڑھائی وڑھائی کی محنت بس زندگی کو انجوائے کرو کیا خبر کل کیا ہو۔" وہ جو پہلے ہی ایوریج اسٹوڈنٹ تھی اس نے مزید پڑھنے سے جو صاف انکار کیا تو بھائیوں کے ہزار سمجھانے پر بھی نہ مانی۔

ان ہی دنوں صبیحہ بیگم اپنے بیٹے علیم کے لیے اس کا رشتہ لے کر آئیں تو گویا دہلیز پکڑ کے بیٹھ گئیں۔ انہیں یہ سادہ سی لڑکی گویا اپنے علیم کے لیے موزوں ترین لگی تھی۔ چالیس سال کے قریب واجبی شکل صورت کا مالک علیم ان دنوں کو اپنی قابلِ نفرت نند کو دھکیلنے کے لیے اچھا کنواں ملا تھا۔

علیم عباس جو پہلی منگنی ٹوٹنے پر شادی جیسے مقدس رشتے سے ہی بدظن ہو گیا تھا۔ کئی سال کے مسلسل انکار کے بعد آج ماں کے جڑے ہاتھوں کے سامنے مجبور ہو گیا تھا۔

ان دنوں شمیلہ اور فصیحہ اسی شش و پنج میں تھیں کہ آسیہ کو اپنے سے دگنی عمر کے رشتے کے لیے منایا جائے تو کیسے۔ تب ہی شمیلہ نے یہ ذمے داری اپنے ذمے لے کر فصیحہ کو بے فکر رہنے کو کہا۔

"بھابی! کیا بتاؤں کہ میں فوجیوں سے کتنی مرعوب ہوں۔ وہی تو ہیں جن کی وجہ سے ہم سب بے خوف و خطر اس ملک میں رہ رہے ہیں۔ ورنہ دشمن تو ہمیں نیست و نابود کر دیں۔" انہیں آنکھ کا اشارہ کرتی شمیلہ نے بات کا آغاز کیا اور دھم سے لاؤنج میں ان کے مقابل رکھے صوفے پر براجمان ہو گئی۔

"ہاں تو اور کیا میں نے تو اپنی اماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ شادی کرنا تو صرف کسی فوجی سے۔ لیکن کیا خبر تھی کہ میرا نصیب اس گھر میں جڑا تھا۔" ننھے اویس کو کیلا کھلاتی فصیحہ نے آنکھ کا اشارہ سمجھتے ہی سرد آہ بھر کر ٹکڑا لگایا۔

"ارے ہم سے تو خوش نصیب ہماری یہ گڑیا نکلی۔ کیسے سجیلے جوان کا رشتہ آیا ہے کہ سارے خاندان کی لڑکیاں جل' جل کر مریں گی۔" شمیلہ نے قدرے بلند آواز میں جیسے بات کچن میں آٹا گوندھتی آسیہ تک پہنچائی۔ آسیہ کی شرم کے مارے کان کی لویں تک سرخ پڑ گئیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنی خوش قسمتی پر رشک آیا۔ مگر علیم عباس کی تصویر دیکھ کے وہ دنوں گم صم رہی انکار کی جرأت خود میں نہیں پاتی تھی۔ مگر خوش بھی نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کی اتری صورت پر بھائیوں کا دھیان جاتا انہیں یہ مسئلہ حل کرنا تھا۔

"دیکھو گڑیا! میں جانتی ہوں تم ہم سے ناراض ہو۔ مگر یقین جانو دنیا ہماری طرح صرف تمہاری خوبیاں نہیں دیکھتی وہ بس خامیوں پر نظر رکھتی ہے۔ اب ایک عام صورت میٹرک پاس لڑکی کا اس سے اچھا رشتہ کہاں سے آ سکتا ہے بھلا۔" دل گداز لہجے میں بات کرتی فصیحہ کی زبان ہمیشہ کی طرح بری پھسلی تھی۔ اس نے شاکی نظروں سے اپنی ماں جیسی بھابی کو دیکھا۔

"یہ سب ہم نہیں کہہ رہے رشتے کروانے والی خالہ کا یہ خیال ہے۔ ویسے بھی لڑکے کی واجبی شکل اور

بڑی عمر کون دیکھتا ہے۔ علیم کا اپنا گھر ہے وہ ایک باعزت نوکری کر رہا ہے کیا یہ کافی نہیں۔" رسان سے سمجھاتی شمیلہ کا لہجہ آخر میں سوالیہ ہوا تھا۔

"آپ پریشان مت ہوں بھابی! مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں میں خوش ہوں۔" قدرے بجھے لہجے میں کہتی آسیہ اپنے کمرے میں چلی گئی تو شمیلہ نے فاتحانہ نگاہیں فصیحہ پر جما کے یوں ہاتھ جھاڑے جیسے کہہ رہی ہو خس کم جہاں پاک۔

اگلے ہی ماہ اس کی شادی نہایت سادگی سے علیم عباس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ وہ علیم عباس جو رشتوں پر اعتبار ہی کھو چکا تھا دنوں میں آسیہ کی سادگی اور اس کی پُرخلوص فطرت کا اسیر ہو چلا تھا۔ آسیہ جو دل میں کئی واہمے لیے اس گھر میں آئی تھی جھکی نظر والے بلند کردار فرشتہ سیرت اور محبِ وطن علیم کی ہم سفری پر نازاں رہنے لگی۔ اماں تو جیتی ہی انہیں دیکھ کے تھیں۔ تب ہی اللہ نے انہیں کے بعد دیگرے دو بیٹوں سے نوازا۔ وہ گویا آسمان کی وسعتوں میں اڑنے لگی بھلا کوئی اس سا بھی خوش نصیب ہو گا۔ ان دنوں راوی چین ہی چین لکھتا تھا کہ اس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ سپاہی علیم عباس بارڈر پر ہونے والی بلا اشتعال فائرنگ کا شکار ہو کے شہید ہو گیا۔

وہ دن ان پر بہت بھاری تھے۔ علیم کے واجبات ملتے ہی اس کے ایک دوست نے ان کے گھر کی دہلیز پکڑ لی۔ اس کا ایک ہی موقف تھا کہ علیم نے اپنی زندگی میں بالائی منزل پر پورشن تعمیر کرنے کے لیے اس سے قرض کی مد میں کثیر رقم لی تھی۔ یہ بات تو سچ تھی کہ علیم اوپر پورشن بنانا چاہتے تھے۔ مگر اس مقصد کے لیے قرض لے چکے ہیں اس بات سے یہ لوگ بے خبر تھیں۔

جبکہ عاصم جو خود کو علیم کا دوست بتاتا تھا۔ درحقیقت ایک بدفطرت انسان تھا جو محض رقم اینٹھنے کے لیے بے بنیاد بات بڑے ہی وثوق سے کہہ کے اس پر ڈٹ بھی گیا تھا۔ صبیحہ بیگم نے واجبات کی مد میں ملی اچھی خاصی رقم عاصم کو تھما کے گویا اس سے جان چھڑائی تھی۔

ایک بار پھر وہ کمزور عورتیں تقریباً خالی ہاتھ تھیں۔ مگر پھر بھی ناامید نہیں تھیں کیونکہ جو پہلے کھو چکی تھیں اس سہارے کے آگے یہ دنیاوی نقصان کچھ معنی نہیں رکھتا تھا۔ پھر بھی یہ بات اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی کہ ہاتھ جھاڑ کے آگے بڑھ جایا جاتا۔ سوائے یہ مشکل فیصلہ کرنا پڑا وہ جو شادی کے بعد سر اٹھا کے ڈھیروں سامان کے ساتھ میکے جایا کرتی تھی کل پناہ کی درخواست پلو سے باندھے میکے گئی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ پلو کی گرہ کھول کے اپنی بے بسی کا خود تماشا بنواتی اللہ نے اسے سنبھال لیا۔ اپنے ہی رشتوں کے سامنے بے مول ہونے سے بچا لیا۔ ماضی کے آئینے سے وقت کی دھول اپنے آنسوؤں سے صاف کرتی اس وقت وہ صحن میں موجود تخت پر براجمان سوچوں میں غلطاں تھی۔

گو ذرا سی بات پہ برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا ۔۔ کچھ لوگ پہچانے گئے

یہ شعر یاد آتے ہی اس کے لبوں پر زخم خوردہ مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ پھر آنے والے وقت کی ہولناکی نے جیسے ماضی کی تمام تلخیوں کو نگل لیا۔ "اب کیا ہو گا؟" جیسا کٹھن سوال بڑے طمطراق سے اس کے ذہن و دل میں پریشان کن انداز میں آ ٹھہرا تھا۔ یہ اعصاب شکن سوال اس کے چٹخنے ہوئے ذہن کو جیسے مزید جھنجوڑ رہا تھا۔

علیم عباس وراثت میں صرف یہ گھر چھوڑ کے گیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں وہ بالکل خالی ہاتھ تھیں۔ یعنی اسے اسی گھر سے اپنا رزق اور بچوں کا مستقبل کشید کرنا تھا مگر کیسے؟ اس کا ذہن سوچ کے تانے بانے بنتا پھر مٹا دیتا۔ یکلخت ذہن کے پردے پر جو خیال اترا اسے عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کیے وہ اب مطمئن تھی۔

"آسیہ! اب کیا ہو گا جو جمع جتھا تھا وہ بھی اب قریب الختم ہے۔ باقی جو کچھ تھا وہ مردود عاصم لے گیا۔ اب کیا کریں گے ہم تو بڑے ہیں، حالات کو کسی طرح سہہ لیں گے۔ معصوم بچوں کو بھوک کے عفریت سے کیسے بچائیں گے۔" صبیحہ جو کب سے برآمدے میں کھڑی اسے سر جھٹکتے اور پھر مطمئن ہوتے دیکھ رہی تھیں

خاموش قدموں سے اس کے پاس آبیٹھیں اور گلوگیر لہجے میں بولیں۔
”کیوں پریشان ہوتی ہیں اماں! خدا جب ایک آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تو اس سے نکلنے کے ہزار راستے بھی دکھاتا ہے۔“ اٹھ کے بیٹھتی آسیہ نے مستحکم لہجے میں کہتے ہوئے جیسے انہیں افسردگی کے حصار سے نکالنا چاہا۔
”بے شک اللہ تو برحق مددگار ہے۔ مگر بعض دفعہ ہم کمزور انسانوں پر آزمائش ہی ایسی آجاتی ہے کہ فلک سے آنے والی مدد کے پختہ یقین پر بھی دل گھبرا اٹھتا ہے۔“ بے بسی سے متورم آنکھیں پونچھتی اب وہ اس کے پُرعزم چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔
”گھبرائیں مت اماں! خدا کا لاکھ، لاکھ شکر ادا کریں کہ ہمارا گھر اپنا ہے۔ کم سے کم سر کی چھت کے لیے ہمیں مارے مارے نہیں پھرنا پڑے گا۔ پھر اگر ہم تھوڑی سی ہمت اور سمجھداری سے کام لیں تو ہم اسی کی بدولت مصائب کے بھنور سے بھی نکل سکتے ہیں۔“ یکا یک وہ ایک پختہ عمر کی سمجھدار عورت میں ڈھل چکی تھی اور اپنی سن رسیدہ ساس کو تسلی بھی دے رہی تھی۔ اس کی بڑی، بڑی کٹورا سی آنکھوں میں امید کے سیکڑوں دیے جل اٹھے تھے۔ صبیحہ خاتون تحیر سے اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔
”تم کیا کہہ رہی ہو میں کچھ نہیں۔“ صبیحہ خاتون واقعی نہیں سمجھی تھیں مگر دل ہی دل میں دعا گو ضرور تھی کہ اللہ انہیں کوئی ایسا راستہ سجھا دے جو حقیقتاً ان کی سب پریشانیاں حل ہو جائیں۔
”مطلب یہ کہ اماں! یہ چار کمروں کا گھر ہمارے لیے رزقِ حلال کا وسیلہ بنے گا۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے گھر کو ہی بروئے کار لا کے ان ناموافق حالات کا مقابلہ کریں۔“ انہیں مختصراً بتاتی وہ ازحد مطمئن تھی۔
”آسیہ! تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تم کہہ کیا رہی ہو۔ بھلا کبھی کسی عورت نے مردوں کی طرح دکانیں بھی چلائی ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ ان کے لہجے میں تعجب تھا۔
”ہاں جب ہم بھوک سے مر جائیں گے تب لوگ کہیں گے انا للہ و انا الیہ راجعون۔“ اس کے ہونٹوں پر زہرخند ہنسی تھی۔
”وہ تو ٹھیک ہے مگر آج کیا کریں گے آج تو کھانا بھی برائے نام ہے اور سبزی کے نام پر پکانے کے لیے بھی کچھ نہیں۔“ صبیحہ کے جھریوں زدہ بوڑھے چہرے پر پریشانی کا جال بچھا تھا۔
”آٹا تو ہے ناں پھر شدید بھوک میں تو پانی سے بھی روٹی کھائیں تو تب بھی پیٹ کا جہنم سرد پڑ سکتا ہے۔ باقی فریج میں ہری مرچیں پڑی ہیں آپ ہری مرچوں اور دھنیے کی کتنی اچھی چٹنی بناتی ہیں۔ وہ بنالیں اس کے ساتھ روٹی بہت مزے کی لگتی ہے۔“ اس نے آنکھیں میچ کے جیسے چٹنی کا مزہ لیا تھا۔ صبیحہ بیگم نہال سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔ آسیہ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ان حالات میں انہیں تنہا چھوڑ کے جا چکی ہوتی۔ وہ خدا کا جتنا شکر ادا کرتیں کم تھا جو آسیہ جیسی نیک فطرت بہو انہیں ملی۔
”جیتی رہو میری بیٹی! اللہ تمہارے صبر کا نیک اجر تمہیں دے اور تمہارے ماں باپ کی قبریں ٹھنڈی رکھے جنہوں نے تمہیں اتنی اچھی تربیت دی۔“ صبیحہ اسے دعاؤں سے نوازتی کچن میں چلی گئیں تو وہ اٹھ کے چھت پر چلی آئی۔ پھر چھت پہ پڑی لکڑیوں کو اپنی سمجھ کے مطابق کاٹ کے کیلوں کی مدد سے ریک بناتے اسے دوپہر ہو گئی۔ کبھی کی جمع کر کے رکھی گئی پرانے دروازوں کی چکنی لکڑیاں آج کام آرہی تھیں۔
”ارے امی! آپ یہاں ہیں ہم آپ کو سارے گھر میں ڈھونڈ رہے ہیں۔“ وہ کام میں اس قدر منہمک تھی کہ اسے عمار کی آمد کی خبر ہی نہ ہوئی چونکی تو تب جب وہ اسے ہتھوڑی اور کیلوں سے نبرد آزما دیکھ کے وہیں جم گیا۔
”بس بیٹا! تھوڑا سا کام رہ گیا تم چلو نیچے کپڑے چینج کر کے منہ ہاتھ دھولو میں کھانا بناتی ہوں آپ کے لیے۔“ اسے پچکارتی وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

نہیں کھائی۔ نہیں کھائی ہم نے دال سے روٹی نہیں کھائی۔“ وہ ہاتھ دھو کے جیسے ہی کچن میں آئی کچن میں ہی لگی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کو بجاتا شہروز لہک، لہک کے گا رہا تھا۔ اسے دال بالکل پسند نہیں تھی پھر بھی آسیہ جب بھی دال بناتی اسے چپ چاپ کھانے کی تلقین کرتی۔ جس پر وہ ٹیبل بجا، بجا کے خوب بے سرے انداز میں راگ الاپتا کہ آسیہ اس کے کان پکڑ کے اسے سب نعمتوں پر شکر ادا کر کے کھانے کا کہتی تب وہ خاموش ہوتا۔ لیکن آج جانے کیوں اسے شہروز کے گانے پر غصہ نہیں آیا تھا۔ بلکہ ایک عجیب سی خودترسی تھی جو اس پر طاری ہو گئی تھی۔ بار، بار بہتی آنکھیں پونچھتی وہ چولہے پر رکھے توے کی طرف متوجہ تھی۔ عمار نے شہروز کو ٹہوکا مار کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
”عمار! جاؤ بیٹا دادی کو بلا لاؤ روٹی بن گئی ہے۔ وہ آجائیں تو مل کے کھانا کھاتے ہیں۔“ لہجے کو معتدل بناتے ہوئے اس نے عمار کو مخاطب کیا تھا۔ تب آنسوؤں سے لبالب بھری دھندلائی آنکھوں سے چوک ہوئی اور روٹی ڈالتے ہوئے اس کی کلائی گرم توے سے چھو گئی۔ روٹی توے پر ڈالتے ہی وہ سسکی بھر کے دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔
”بس مل گیا چین تمہیں شہروز! جلا دیا ناں اماں کا ہاتھ دیکھو کتنا رو رہی ہیں وہ۔“ عمار ایک ہی جست میں اس کے پاس آ کے اس کا ہاتھ پکڑے اس کے سرخ پڑتے بازوؤں پر پھونکیں مار رہا تھا۔ پھر یکلخت شہروز کو کینہ توز نظروں سے گھور کے لتاڑ گیا۔
”مجھے کچھ نہیں ہوا بچے جاؤ تم اماں کو بلاؤ کھانا کھالیں آ کے۔“ اس نے آنسوؤں کا گولا نگلتے متوحش عمار کو تسلی دی تو وہ کچن سے نکل گیا۔
اب وہ ان معصوم بچوں کو کیا بتاتی کہ رونا اپنی تکلیف پر نہیں بلکہ ان محرومیوں کی فصیل پر آرہا تھا جو اس کے لختِ جگر کے گرد اگنے والی تھی۔ عمار تو پھر بہت صبر والا تھا مگر شہروز چونکہ چھوٹا تھا اس لیے اپنی ضد پر سمجھوتا کرنا اس کے لیے مشکل ترین عمل تھا۔
”سوری امی! میری وجہ سے آپ کو چوٹ لگی۔“ وہ خود کو کمپوز کیے آخری روٹی توے سے اتار کے ہاٹ پاٹ میں رکھتی اب چولہا بند کر رہی تھی جب ننھے شہروز نے اس کی ٹانگوں سے لپٹ کے معافی مانگی۔ اس کا دل یکلخت پھر بھر آیا۔
”نہیں میری جان آپ کی کوئی غلطی نہیں، میں ہی اپنی سوچوں میں مگن تھی۔ آپ بیٹھو میں آپ کو کھانا کھلاؤں۔“ تب ہی اماں بھی کچن میں آگئیں۔ اس نے دو کٹوریوں میں دال نکالی اور عمار اور شہروز کے سامنے روٹی کے ساتھ رکھ دی۔ خود روٹی پر اماں کی بنائی ہوئی چٹنی رکھی۔ اماں کو بھی روٹی کے ساتھ چٹنی سرو کی۔ وہ ایک نوالا چٹنی کے ساتھ خود کھا رہی تھی جبکہ ایک نوالا دال میں بھگو کے شہروز کو کھلا رہی تھی۔
”اماں! آپ روٹی سالن کے ساتھ کیوں نہیں کھا رہیں۔ کیا گھر میں اور سالن نہیں ہے۔“ عمار نے جیسے اس کی چوری پکڑی تھی وہ گڑبڑا گئی۔ جبکہ صبیحہ بیگم کی بھی سٹی گم ہو گئی۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ ان مشکل حالات کی آنچ بھی وہ بچوں تک نہ پہنچنے دیں پھر بھی عمار جیسے ان کی کوشش پر پانی پھیرنے پر تلا تھا۔
”اللہ کا شکر ہے گھر میں سب کچھ ہے وہ تو اماں نے اپنے لیے چٹنی بنائی سوچا آج میں بھی ان کے ہاتھ کی بنی لذیذ چٹنی کے ساتھ کھانا کھا کے عیاشی کروں۔“ اس نے مسکرا کے جھوٹ بولا تو حساس سا عمار بظاہر خاموش ہو گیا مگر بہت کچھ تھا جو اس سے مخفی نہیں تھا۔

☆☆☆

دو دن میں ہی وہ قدآدم سائز کے دو ریک تیار کر چکی تھی تیسرے ہی دن وہ اماں کے ساتھ فیاض بھائی کے آفس چلی گئی۔ اماں کے سگے بھتیجے فیاض جہانگیر پراپرٹی ڈیلر تھے۔ اس دن اس کی بات سن کے اماں نے مکمل اتفاق کرتے ہوئے فیاض کا ہی سوچا تھا کہ اس سے بڑھ کر انہیں کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ کیسی آزمائش میں گھر گئی تھیں کہ علیم زندہ ہوتا تو وہ کبھی اپنا محنت سے

بنایا ہوا گھر یوں دوسروں کے حوالے نہ کرتا۔ وہ خود بھی تو زمانے کے نشیب و فراز سے گھبرا کے کبھی یہ قدم نہ اٹھاتیں مگر دائے رے قسمت کہ انسان کو کئی ناگوار فیصلے انس کے کرنے پڑتے ہیں۔ وہ بھی تقدیر کے اس فیصلے پر لبیک کہتی آسیہ کو لیے فیاض کے دفتر آگئیں۔

''ارے خالہ! آپ آیئے ناں بیٹھیے۔ کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔'' فیاض جو انہیں اور آسیہ کو دیکھ کے احتراماً اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا متعجب سا سوال کر گیا۔

''بس بیٹا! جب جوان بیٹا بڑھاپے میں بے سہارا چھوڑ جائے تو تقدیر یوں ہی در بدر پھراتی ہے۔'' رندھی ہوئی آواز میں کہتیں وہ بڑے سے شیشے کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ آسیہ نے افسردگی سے دیکھتے ہوئے ان کی تقلید کی۔ وہ سمجھ سکتی تھی علیم کی جدائی کا زخم کبھی بھرنے والا نہیں تھا۔

''ایسا مت کہیں خالہ! بے شک میں علیم بھائی کی جگہ نہیں لے سکتا مگر میں بھی تو آپ کا بیٹا ہوں۔ جو بھی بات ہو مجھے حکم کیا کریں میں حاضر ہوں۔'' فیاض کے لیے صبیحہ ان کی اپنی ماں کی طرح ہی محترم تھیں۔ سو اب بھی پُرتعظیم لہجے میں گویا ہوئے تو صبیحہ بیگم کشمکش و پیچ میں پڑ گئیں کہ بات کہاں سے شروع کریں۔

''حکم نہیں فیاض بھائی! درخواست لے کر آئے ہیں ایک۔ آپ تو جانتے ہیں کہ علیم کے جانے کے بعد ہمارا رزق کا کوئی سلسلہ نہیں۔ اس پر چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے سو ضرورتیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے گھر کو رینٹ پر دے دیں۔'' آسیہ نے صبیحہ کا ہاتھ ہلکے سے تسلی آمیز انداز میں دبا کے بات کی شروعات کی۔

''وہ تو ٹھیک ہے بھابی لیکن گھر رینٹ پر دے کر آپ لوگ رہیں گے کہاں؟'' سوالیہ نظریں ان پر جمائے فیاض کے لہجے میں تحیر سا تھا۔

''ہم اپنا سامان ڈرائنگ روم میں رکھ لیں گے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ڈرائنگ روم کا ایک دروازہ باہر کو بھی کھلتا ہے۔ ویسے بھی جب نصیب کی تاریکی حد سے سوا ہو جاتی ہے پھر آسمان سے روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور پھوٹتی ہے جو سارے اندھیارے نگل کے ایک نئی سحر کا موجب بنتی ہے۔ خدا نے اگر ہمیں یہ راستہ سجھایا ہے تو ضرور اس میں کچھ نہ کچھ بہتری پوشیدہ ہوگی۔'' آسیہ نے مستحکم لہجے میں کہا تو صبیحہ بھی سنبھل کر مسکرا دیں۔

''پھر بھی پورے گھر کا سامان ایک کمرے میں کیسے آئے گا۔'' فیاض اب بھی متامل تھا۔

''اللہ کوئی نہ کوئی حل نکال دے گا تم بس چند نیک لوگوں لوگوں کو ہمارا گھر دکھا دو۔ تم تو اپنے ہو مجھے یقین ہے تم کسی اچھے کو ہی ہمارا گھر دو گے۔ ورنہ تم تو جانتے ہو زمانہ کتنا برا ہے گھر میں گھس کے گھر پر قبضہ کر لیں تب ہم اکیلی عورتیں کیا کر سکتی ہیں۔'' صبیحہ نے خدشات سے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

''خالہ! آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ میرا سالا انوار وہی جو فوج میں ہے اس کی کچھ دن پہلے ہی یہاں پوسٹنگ ہوئی ہے۔ وہ فیملی کو یہاں رکھنے کے لیے گھر ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ ایسا گھر ہو جہاں اس کی فیملی آرام سے رہ سکے۔ باقی اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں یوں سمجھیں اس کو نہیں مجھے گھر دیا ہے آپ نے۔ میں شام میں ہی اسے بھیجتا ہوں اسے گھر پسند آگیا تو آج ہی وہ ایڈوانس اور کرایہ پکڑا دے گا آپ کو۔'' کچھ دیر سوچ بچار کے بعد فیاض بولا تو گویا ان کی ساری پریشانی لے اڑا۔

''بہت شکریہ فیاض بھائی! آپ نے ہمارا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔'' اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے آسیہ نے کہا فیاض ملائمت سے مسکرا دیا۔

''کوئی بات نہیں بھابی یہ تو میرا فرض تھا۔'' خندہ پیشانی سے کہتے ہوئے فیاض اٹھ کھڑا ہوا۔

''جیتے رہو بیٹا! اللہ تمہارے لیے مزید کامیابیوں کے راستے کھولے۔'' صبیحہ بیگم بھی فرطِ انبساط سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے دعائیں دیتی آسیہ کے ساتھ گھر آگئیں۔

اسی دن انوار صدیقی آیا اسے گھر بہت پسند آیا تھا۔ آسیہ نے گھر کو سجایا بھی تو بہت عمدہ انداز میں ہوا تھا۔

چار کمروں کشادہ صحن برآمدے کچن باتھ پر مشتمل یہ گھر آسیہ کے جہیز کے سامان سے اٹا پڑا تھا۔ دونوں بھائیوں نے محبت میں اور بھابیوں نے دنیاداری کی خاطر اسے دل کھول کر جہیز دیا تھا۔ جس کی چمک دمک آج کئی سالوں کے بعد بھی ماند نہیں پڑی تھی۔ وجہ آسیہ کی حساس فطرت تھی۔ وہ چیزوں کو نفاست اور سلیقے سے استعمال کرنے والی عمدہ سیرت والی عورت تھی۔ جو چیزیں خراب ہوئیں بھی وہ ساتھ، ساتھ ٹھیک کرواتی رہی۔

''خالہ! مجھے گھر بہت پسند آیا ہے میں کل ہی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ یہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔ یہ آپ ایڈوانس رکھیں۔'' ستائشی نگاہوں سے گھر کا جائزہ لیتے انوار نے جیب سے چالیس ہزار کی رقم نکال کے ان کی طرف بڑھائی تو جیسے ان کی آنکھوں میں تشکر کی نمی سمٹ آئی۔ آج ان کے گھر میں راشن کے نام پر ایک دانہ نہیں تھا۔

''بھائی! اگر آپ کچھ دن انتظار کر لیں تو ہم اپنے سامان کا کچھ بندوبست کر لیں۔ آپ تو جانتے ہیں فوری اتنے سامان کو کہیں شفٹ کرنا بھی آسان نہیں ہے۔'' آسیہ نے قدرے ہکلائے لہجے میں کہتے ہوئے کچھ دن کی مہلت مانگی۔

''آپا! اگر آپ کو برا نہ لگے تو سامان یوں ہی رہنے دیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم مکان چھوڑتے وقت آپ کا سامان ایسا ہی لوٹا دیں گے۔ فوجی بندے اور کسی بنجارے میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ اب آئے دن تو اِدھر اُدھر پوسٹنگ ہوتی رہتی ہے۔ اب کوئی سامان سمیت تو ہجرت نہیں کر سکتا ناں لیکن نوکر کیا اور نخرہ کیا ہمیں سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔'' باتونی سے انوار نے جھٹ رشتہ گانٹھ کے اپنی مجبوری بیان کر دی۔

''ارے بیٹا اس سے بہتر کیا ہوگا سامان اِدھر وُدھر بھی تو رلنا ہی ہے۔ تم لوگ استعمال کر لو گے تو کیا مضائقہ ہے کیوں آسیہ۔'' صبیحہ کے دل سے گویا ایک اور پریشانی کا بوجھ سرکا تھا۔ آسیہ بھی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔

''یہ رکھیے دس ہزار روپے۔ اب میں ہر ماہ آپ کو بیس کے بجائے تیس ہزار کرایہ دیا کروں گا۔ مجھے فرنیشڈ گھر مل گیا اس سے بہتر اور کیا ہوگا۔ اب آتے ہی آپ کی بھابی مجھے مارکیٹ میں تو نہیں پھرائے گی ناں سجا سجایا گھر مل جائے گا اسے۔'' قدرے شگفتہ لہجے میں کہہ کے وہ پیسے انہیں تھماتا گھر سے نکل چکا تھا۔

جانے کتنے ماہ کے بعد وہ لوگ ہنس رہے تھے، بول رہے تھے۔ آسیہ نے بریانی بنائی تھی جو انہوں نے باتوں کے دوران کھائی۔ پھر چیدہ، چیدہ سامان ڈرائنگ روم میں منتقل کرتے اور ڈرائنگ روم میں لگے بھاری صوفے اندر ایک کمرے میں سیٹ کرتے انہیں رات آدھی سے زیادہ بیت گئی۔ آسیہ نے کچن سے بہت مختصر سامان اٹھایا تھا۔ باقی ضروری سامان کو تالا لگا کے اس نے سب کمروں کے دروازے لاک کیے تھے۔ اس رات بچے تو ڈرائنگ روم میں بچھے کارپٹ پر تکیے رکھے سو گئے مگر آسیہ اخراجات کا تخمینہ لگانے اور پیسوں کے حصے بخرے کرنے میں جتی رہی۔ بجلی، پانی اور گیس کے ڈیڑھ دو ماہ کے بل اور دونوں بچوں کی فیس اور سالانہ فنڈ کی رقم الگ کرتے ہی اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ کیونکہ ایک بڑی رقم ان دو کاموں میں ہی کھپنے والی تھی۔ باقی ضروریاتِ زندگی کے ہزار اخراجات تھے جو منہ پھاڑے ان کی سفید پوشی کے بھرم کو نگلنے کو تیار تھا۔

بلاشبہ اس نے ٹھیک سوچا تھا۔ زندگی گزارنے کا اتنا وسیلہ اس مہنگائی کے زمانے میں ناکافی تھا۔ اسے کچھ اور بھی کرنا تھا اور کیا کرنا تھا وہ یہ سوچ چکی تھی۔ سو مطمئن ہوتے ہوئے قالین پر ہی تکیہ رکھے لیٹ گئی اس کا تھکا ہوا متحرک ذہن اگلا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔

☆☆☆

''لوگوں پر آزمائشیں بھی آتی ہیں مگر کوئی بھی یوں اپنے پچھلوں کے سر پر خاک نہیں ڈالتا جیسے اس نے ڈالی ہے۔'' شمیلہ نے ذیشان کے سامنے کھانے کی ٹرے پٹختے ہوئے نخوت سے کہا۔

''کس کی بات کر رہی ہو اور تمہیں تمیز نہیں کہ کسی کے سامنے کھانا کیسے رکھتے ہیں۔ غصہ دلانے والی

حرکتیں خود کرتی ہو پھر کہتی ہو لڑائی میں شروع کرتا ہوں۔" ذیشان جو ابھی آفس سے تھکا ہوا آیا، صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھا تھا شمیلہ کی ہرزہ سرائی پر کیا غور کرتا اس کی تڑے پتخنے والی حرکت پہ بھنا کے رہ گیا۔

"آہ ساری تہذیب، تمیز، شرافت، لیاقت تو تمہاری بہن میں ہے جو ذرا سی آزمائش پر تم لوگوں کی عزت ڈبونے چلی ہے۔ میں تو ہوں ہی بدتمیز، جھگڑالو۔" بیڈ کی چادر جھٹک جھٹک کر بچھاتی شمیلہ نے اب کے گویا انگارے چبائے جس پر غائب دماغی سے اسے دیکھتے ذیشان کو پھر طیش آیا۔

"ایک تو میں اسی لیے لنچ پر گھر نہیں آتا۔ گھر آؤ تو تمہارے قصیدے شروع ہو جاتے ہیں۔ اب پتا نہیں کس کا غصہ ہے جو آسیہ کو بھی رگید رہی ہو ساتھ۔ ایسا کرو یہ سب چھوڑو اور اطمینان سے یہاں بیٹھ کے مجھے اصل مدعا بتاؤ۔ میں آفس سے تھک کے آتا ہوں مجھ میں پہیلیاں بوجھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔" غضبناک انداز میں بات شروع کرتا آخر وہ اپنے لہجے کو حلیم کر گیا۔ جانتا تھا کہ جب تک وہ تھیلے میں سے بلی نکال نہیں لے گی یونہی بات بے بات انگارے برساتی رہے گی۔

"بات کیا ہونی ہے آج انیلا آنٹی آئی تھیں۔ ارے وہی آسیہ کی پڑوسن۔ میں تو ان کی باتیں سن کے گویا ساکت رہ گئی۔ آج کل کی لڑکیوں میں تو صبر نام کو نہیں رہا۔" شمیلہ چادر وہیں پٹخ کے اس کے پاس صوفے پر بیٹھتی اب جلبلاتے ہوئے گویا ہوئی۔ ذیشان کراہ کے رہ گیا۔

"تمہیں میں نے کتنی بار کہا ہے کہ انیلا آنٹی جو اپنی بہو کی برائیاں تم سے کرتی ہیں وہ میرے سامنے مت دہرایا کرو۔ مجھے کیا پرائے گھر کی سیاست سے اپنے بکھیڑے کم ہیں کیا۔" ذیشان جو بھنڈی گوشت اور تازہ گول پھلکے جیسی روٹی کے بڑے، بڑے نوالے لے رہا تھا اب کے خوب تلملا کے اسے سرزنش کر بیٹھا۔ شمیلہ کے ہونٹوں پہ طنزیہ مسکراہٹ آ ٹھہری۔

"یہ کسی کے غیر گھر کی سیاست نہیں آپ کی اپنی بہن کی خودمختاری کے قصے ہیں جو سارا محلہ کانوں کو ہاتھ لگا کے پڑھ رہا ہے۔ جب انسان خود کسی کو بات کرنے کا موقع دے تو پھر بات بات کب رہتی ہے جنگل کی آگ بن جاتی ہے۔" شمیلہ نے عادتاً بات کو بڑھا چڑھا کر دانستہ اپنی مرضی کا پہناوا پہنا کر بیان کیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو محبت اور انسانیت میں دوستی نبھائیں نہ نبھائیں۔ ان چاہے رشتوں کے بغض میں دشمنی آخری سانس تک نبھاتے ہیں پھر کہاں کی انسانیت کیسی محبت۔

"اب تم اصل مسئلہ بھی بتاؤ گی کہ یونہی فلسفہ بگھار کے میرا کھانا حرام کرتی رہو گی۔" ذیشان نے پانی کے دو گھونٹ پیتے ہوئے قہر بار نظروں سے شمیلہ کو دیکھا۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ آسیہ نے اپنا گھر رینٹ پر دے دیا۔ خود ڈرائنگ روم میں شفٹ ہو کے سارا گھر اپنے قیمتی سامان سمیت ایک انجان فیملی کو دے دیا۔ انیلا آنٹی یہ پوچھنے آئی تھیں کہ آپ دونوں بھائیوں کی محبت اور غیرت کہاں مر گئی ہے کہ آسیہ کو گزر بسر کے لیے گھر رینٹ پر دینا پڑا۔" اب کے دانستہ مبالغہ آرائی کی انتہا کرتے ہوئے شمیلہ نے ذیشان کو کچھ اور بھڑکانا چاہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے آشان بھائی نے اس سے اس دن کتنا اصرار کیا تھا کہ یہاں شفٹ ہو جائے۔ خود میں نے کئی بار اسے یہاں آنے کے لیے قائل کرنا چاہا مگر اس سے انکار ہی سنا۔ جھوٹ کہتی ہیں انیلا آنٹی ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ پہلے ہم سے مشورہ ضرور کرتی۔" ذیشان کے حلق میں گویا نوالا اٹکا تھا دو گھونٹ پانی پی کے وہ اب کمزور لہجے میں آسیہ کا دفاع کر رہا تھا۔

"سورج کے آگے ہتھیلی رکھ لینے سے دن رات میں نہیں بدل جاتا ذیشان صاحب۔ آنکھیں کھولیں اور دیکھیں کہ آپ کی بہن تو آپ کو اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کو اطلاع ہی دے دے۔ اور آپ ہیں کہ اس کی ہمدردی میں اب بھی مرے جا رہے ہیں۔" خاموش بیٹھے شکار پر طائرانہ نظر ڈالتی وہ اب بیڈ کی بکھری چادر کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

وہ ذیشان کو آسیہ سے اتنا بدظن کر دینا چاہتی تھی کہ آسیہ اس گھر کی طرف رخ کرنا چھوڑ دے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ ان کی نیت کی ناملامت کبھی کسی پہ نہ کھلے۔ اس کے برعکس وہ ہی آسیہ کی سب سے بڑی ہمدرد کہلائی جائے۔

"بھئی ہم نے تو اسے بیٹیوں کی طرح پالا۔ اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھا۔ اب اس کے بچوں کو بھی اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے ہیں مگر وہ کبھی ہماری نہ بن سکی۔" افسردگی سے کہتی وہ ذیشان کو شرمندہ کرنا چاہتی تھی نتیجہ اس کے حسب منشا نکلا تھا۔

"میں کل ہی جا کے آسیہ سے پوچھوں گا کہ وہ اس طرح کی حرکتیں کیوں کر رہی ہے۔" ذیشان بے دلی سے کھانا مکمل کر چکا تھا اب مغموم آواز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے آپ کہاں چلے، بیٹھیں میں نے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ فارحہ کا ایڈمشن کسی اچھے اسکول میں کب کروائیں گے آپ۔ میں نے کہہ دیا اب اس پھٹیچر اسکول میں میری فارحہ نہیں پڑھے گی چاہے کچھ ہو جائے۔" شمیلہ کے لہجے میں جھلکتا تنفر ذیشان کے اس عہدے کا مرہون منت تھا جس پر ترقی کے بعد اسے رشوت کے کئی مواقع ملے اور ان ہی گولڈن چانسز کو اچھو کرتے ذیشان نے اپنے گھر کے پورشن کی حالت بدل کے رکھ دی تھی۔

"میں تمہیں کتنی بار بتاؤں کہ فارحہ وہاں سیٹ ہے اچھے نمبر لیتی ہے۔ اب ہم بغیر کسی وجہ کے اسے وہاں سے ہٹاتے ہیں تو اسے مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔" ذیشان نے ناچار بیٹھتے ہوئے اس کی بات برے دل اور ناراض چہرے کے ساتھ سن کے اکتائے لہجے میں جواب دیا اور ریموٹ اٹھا کے ٹی وی آن کیا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ آشان بھائی، اویس کو اچھے اسکول میں داخل نہیں کروا سکتے۔ اس لیے مجبوراً ہمیں بھی اپنی فارحہ کو اسی پھٹیچر اسکول میں ہی پڑھانا پڑے گا کہ ان کا دل نہ دکھے۔ یہ ہی وجہ ہے ناں۔" تنک کے کہتی شمیلہ اب کمر پر ہاتھ رکھے لڑاکا عورتوں کی طرح شروع ہو چکی تھی۔

"تم یہ ہی سمجھ لو۔ اگر اسکول چینج کرنا ہے تو فیس تم خود ادا کرو گی۔ اور اگر میری بیٹی کی پڑھائی میں کوئی فرق آیا تو حساب بھی تم دو گی سمجھیں تم۔" کرخت لہجے میں کہہ کے ریموٹ پٹختا ذیشان کمرے سے اٹھ چلا گیا۔ اس جیسے کائیاں شخص کو شمیلہ اپنی انگلیوں پر نچانے کا بس وہم پال سکتی تھی۔ درحقیقت وہ صرف اپنے پر اعتبار کرنے والا خود پرست شخص تھا۔ وہ جو بھی کرتا تھا صرف اور صرف اپنا فائدہ سوچ کے کرتا تھا۔ پھر شام تک شمیلہ کا غصہ سوا نیزے پر چڑھا رہا۔ بلاوجہ برتن پٹختے اور فارحہ کو ڈانٹتے رات ہوئی۔

☆☆☆

کل ہی آسیہ نے عمار اور شہروز کے ساتھ مل کے دونوں ریک بیٹھک کی دیواروں میں کیلوں کی مدد سے پیوست کیے تھے۔ ان ہی کے ساتھ رکشے پر جا کے باقی ماندہ بیس ہزار کا پرچون کا چیدہ چیدہ سامان لے آئی۔ وہی سیٹ کرتے انہیں رات ہو گئی۔ لیکن پورے دن کی محنت کے بعد ان کی بیٹھک اب ایک دکان میں بدل چکی تھی جس میں ضروریات زندگی کا سارا سامان محدود مقدار میں سجا تھا۔ وہ بینر کا خام کپڑا ابھی خرید کے لائی تھی۔ اس رات اس نے سفید بڑے سے کپڑے پر خوش خطی میں سرخ اور سیاہ پینٹ سے علیم جنرل اسٹور لکھا تھا۔ اس کی لکھائی شروع سے بہت اچھی تھی۔ خوش خطی کی اس نے اسکول میں موجود ٹیچر سے باقاعدہ تربیت بھی لی تھی۔ مگر وہ اس کے کام آئے گی اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔

اگلا دن بہت مصروف تھا۔ وہ پہلی فرصت میں ہی گھر سے نکلی تھی۔ بچوں کی فیس ادا کر کے سارے بل جمع کروا کے تھکی ماندی واپس آئی تو صبیحہ بیگم کا اترا چہرہ دیکھ کے پریشان ہو گئی۔

"آج آشان اور ذیشان آئے تھے بہت ناراض ہو رہے تھے۔ وہ گھر رینٹ پر دینے کی بازپرس کرنے آئے تھے، یہ ریک اور ان میں سجی چیزیں دیکھ کے اور آگ بگولہ ہو گئے۔ میں جانتی ہوں ان دونوں کا ایسا

مزاج نہیں پتا نہیں شمیلہ نے کس بے ڈھنگے انداز میں
بات ان تک پہنچائی کہ وہ یہاں آ کے یوں سب لحاظ
بالائے طاق رکھ کے بے نقط سنا کے گئے ہیں۔" رندھی
ہوئی آواز میں بتاتی صبیحہ افسردگی سے سر جھکا گئیں۔

"آپ پریشان مت ہوں اماں! کچھ اپنے
برے وقت میں دنیا بن بیٹھتے ہیں۔ سایہ دیتے ہیں نہ
سائے میں برداشت کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہم دنیا کا
سہارا کیوں لیں جو ایک بار سہارا دے کے ہزار بار
جتاتی ہے۔ ہم اس رب کا سہارا کیوں نہ لیں جو ہزار
بار سہارا دے کر ایک بار بھی نہیں جتاتا۔" نپے تلے
انداز میں کہتی آسیہ پُرسکون تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہیں اپنے بھائیوں کی بات
مان لینی چاہیے تھی۔ دنیا داری کو ہی سہی وہ تمہیں اور
بچوں کو رکھنے کے لیے تیار ہیں پھر تم انکار کیوں کر رہی
ہو۔ بعض دفعہ خونی رشتوں میں جائز حجت بھی اپنوں
کے دل مکدر کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔" اس کے
کاندھے پر تسلی آمیز انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے وہ
اسے خلوصِ نیت سے سمجھا گئی تھیں۔

"ہاں میں آپ کو اس عمر میں تنہا چھوڑ کے چلی
جاتی۔ اور تو اور آپ کے عزیز از جان پوتوں کو بھی آپ
سے الگ کرنے کی مرتکب ہو جاتی۔ تب کیا علیم روزِ
قیامت مجھ سے اس کریہہ عمل کی جواب دہی نہ
کرتے۔" ان سے نظریں چرائے وہ یاسیت بھرے
لہجے میں وضاحت دے رہی تھی۔ کیا بتاتی کہ وہ خود کو
اور اپنے بچوں کو بھابیوں کے ناروا سلوک کی بھینٹ
نہیں چڑھا سکتی۔ کیا کہتی کہ اس نے شہد آگیں جھوٹے
لبوں پر جن لوگوں کو احترام کے اونچے رتبے پر بٹھایا
تھا۔ ان کے بت ان ہی کی خود غرضی کے ہاتھوں پاش،
پاش ہو کے اس کی روح میں پیوست ہو چکے ہیں۔ اب
اس کی زخم خوردہ روح پر اعتبار کا کوئی بھی پھاہا کارگر
ثابت نہ ہو گا۔

"جیتی رہو بیٹی یہ تمہارا مجھ پر احسان رہے گا۔
اب تم کبھی بھی گھبرانا مت۔ یوں تو مجھ بڑھیا کا سہارا
اس کڑی آزمائش میں ناکافی ہے۔ پھر بھی تسلی اور دعا
تو دے سکتی ہوں ناں۔" فرطِ انبساط سے اس کے ہاتھ
چومتی صبیحہ نے بھیگے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دی۔

"آپ کی دعائیں ہی کافی ہیں۔ دعا دنیا کی
سب سے بڑی طاقت ہے دعا سے نصیب بدل جاتے
ہیں۔ اچھا یہ بتائیں عمار اور شہروز نہیں آئے ابھی
اسکول سے۔" اس کے استفہامیہ انداز پر صبیحہ بیگم نے
نفی میں سر ہلا دیا۔ کل سے وہ باقاعدہ دکان شروع
کرنے والی تھی سو آج اس نے عمار اور شہروز کی پسندیدہ
ڈشز بنائی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ریک میں موجود
چیزوں پر گرد کی تہ تھی۔ اس نے کپڑے سے گرد صاف
کی اور ملحقہ واش روم میں گھس گئی۔ فریش ہو کے نکلی تو
کھانا ڈونگے میں نکالنے لگی۔ پھر عمار اور شہروز کے
آتے ہی اس نے کارپٹ پر ہی دسترخوان بچھا دیا۔
بچوں کے بیٹھتے ہی اس نے دال اور روٹی دسترخوان پر
چن دی۔ وہ گہری نظروں سے چپ چاپ دال کی
کٹوری میں نوالہ بھگو کے کھاتے شہروز کو دیکھ رہی تھیں۔
یکلخت امڈ آنے والے آنسوؤں کو واپس دھکیلتی آسیہ
نے سامنے پڑے نمک کے ڈبے کو بجانا شروع کیا۔

"اماں جانی! میں نے دال سے روٹی نہیں
کھانی۔ نہیں کھانی۔ نہیں کھانی۔ میں نے دال سے
روٹی نہیں کھانی۔" بالکل شہروز کی طرح لہک، لہک کے
گانا گاتی وہ صبیحہ بیگم سے مخاطب تھی۔ صبیحہ بیگم شرارت
سے مسکرا دیں جبکہ عمار کا چہرہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔

"نہیں اماں جانی! اب میں دال کے ساتھ بھی
روٹی کھا لیتا ہوں۔ مجھے سمجھ آ گئی ہے کہ شدید بھوک لگی
ہو تو روٹی پانی کے ساتھ بھی کھائیں تب بھی پیٹ بھر
جاتا ہے۔" کھلکھلا کے ہنستے ہوئے شہروز نے دانستہ
غیر سنجیدہ انداز میں کہا تھا۔ پھر بھی آسیہ کے دل کو عجیب
دھکا سا لگا تھا۔ مصائب کی بجلی اس کے پھولوں کے ننھے
ذہنوں کی معصومیت جھلسا گئی تھی وہ کیسے اداس نہ ہوتی۔

"لیکن آج تو میں نے اپنے بیٹوں کی پسند کی
ڈشز بنائی ہیں۔ یہ دال مت کھاؤ اس کی میں تمہیں صبح
اسکول لنچ کے لیے دال والی روٹیاں بنا دوں گی۔" اس
نے دونوں کے سامنے سے دال اٹھا کے کونے میں

رکھے فریج میں رکھ دی اور بریانی کی ٹرے اور قورمے کا
ڈونگا نکالتے ہوئے گویا انہیں سرپرائز دیا۔ دونوں بچے
بغیر کسی جوش و خروش کے سنجیدگی سے سامنے رکھے اپنے
پسندیدہ ترین پکوان کھانے لگے۔

"اتنے دنوں کے بعد دونوں کی پسند کا کھانا بنا
ہے تم لوگ خوش نہیں ہو۔ کھانا اچھا نہیں بنا کیا؟" کافی
دیر سے دونوں کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کے خاموش بیٹھی صبیحہ
منہ میں نوالا ڈال کے حیرت سے استفسار کر گئیں۔

"ہم بہت خوش ہیں دادی! مگر ہم تب زیادہ
خوش ہوئے تھے جب آج ماما ہماری فیس دینے اسکول
آئی تھیں۔ ورنہ آج اشعر کی طرح ہمیں بھی کلاس سے
باہر نکال دیا جاتا۔ آج سمجھ میں آیا دنیا ہماری کھائی ہوئی
دال نہیں دیکھتی دنیا تو بس سامنے کا رہن سہن دیکھتی ہے
پیسہ دیکھتی ہے۔" عمار افسردہ لہجے میں بتاتا چلا گیا۔
صبیحہ کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

"وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا عمار! اچھے دن
ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ ان شاء اللہ برے دن بھی گزر
جائیں گے۔ بس اللہ ہمیں اس آزمائش میں کامیاب
کرے۔ تم یہ لو ناں یہ قورمہ تمہاری پسند کا بنایا ہے میں
نے۔" قورمے کا سالن اس کی پلیٹ میں نکالتے
ہوئے آسیہ نے دانستہ لہجہ سرسری رکھا۔ وہ نہیں چاہتی
تھی کہ عمار زیادہ دیر دکھ کے اس فیز میں رہے۔

"ماما! میں سب کھاؤں گا پہلے مجھے یہ بتائیں کہ
دادی کی بنائی ہوئی دھنیے پودینے کی چٹنی کہاں ہے؟"
سنجیدہ لہجے میں پوچھتا وہ خود اٹھ کے فریج کی طرف
بڑھ گیا۔

"اتنا کچھ تو ہے تم نے اب چٹنی کیا کرنی ہے۔"
صبیحہ بیگم نے اچنبھے سے آسیہ کی طرف دیکھ کے عمار سے
استفسار کیا تھا۔

"دادی! میرے ٹیچر کہتے ہیں کہ اس چیز کو سکھ
میں ہمیشہ ساتھ رکھنا چاہیے جو دکھ میں آپ کے کام آئی
ہو۔ پھر یہ چٹنی تو لمبے عرصے سے ہمیں بھوک کے عذاب
سے نجات دلاتی رہی ہے۔" رسانیت سے جواب دیتا
عمار اب چٹنی بریانی کے اوپر پھیلا رہا تھا۔ آسیہ کو لگا وہ

غزل

وقت کے دھارے سے ٹکرانا مشکل لگتا ہے
ریگِ رواں پر پاؤں جمانا مشکل لگتا ہے

منجدھاروں سے ناؤ بچانا مشکل لگتا ہے
طوفانوں میں ساحل پانا مشکل لگتا ہے

پہلے ہی دل ٹوٹ چکا ہے آنکھ میں آنسو آئے تھے
اب دل میں چاہت کو بسانا مشکل لگتا ہے

وقت کا طوفاں شاید ہم کو ساحل پر لے جائے
لیکن اس پل جان بچانا مشکل لگتا ہے

اپنی کہانی اپنی زبانی خود سے کہتے رہتے ہیں
دکھ اپنے غیروں کو سنانا مشکل لگتا ہے

دیکھو آس نہ ٹوٹے یمنیٰ یہ تو سب ہی کہتے ہیں!
لیکن آس پہ جیتے جانا مشکل لگتا ہے

کلام: یمنیٰ احمد، کراچی

پسند: حمیرا اقبال، کورنگی

ہار گئی۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ بچوں کو وقت کے
بے رحم تھپیڑوں سے بے خبر نہیں رکھ پائی تھی۔ کیا نارسائی اتنا
بڑا عذاب ہے کہ اس میں گزارے چند دن تمام حیات
پر ثبت ہو کے رہ جائیں۔ وہ کیسے بھول گئی کہ وقت کی
کٹھنائیاں شہروز جیسے کھلنڈرے بچے کو سنجیدہ کر گئی
ہیں۔ تو عمار جیسے حساس لڑکے کے ذہن پر کیسے نہ
حالات کی ان بے رحم کھرونچوں کا اثر ہوتا۔

"میں شرمندہ ہوں میرے بچو! میں تمہیں تمہارا
باپ بن کے زندگی کے خاردار راستوں سے نہیں بچا
پائی۔ مجھے معاف کر دینا میں بہت کمزور ہوں۔"
زار و قطار بہتے آنسوؤں سمیت وہ کھانا چھوڑے ہاتھ
جوڑ کے اپنی بے بسی کا اظہار کر گئی۔

"ایسا مت کہیں ماما! آپ ہمارے لیے بابا کی

طرح ہی حالات سے لڑ رہی ہیں۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہیے میرے بے تکا بولنے پر آپ کی دل آزاری ہوئی۔" اس کے رونے پر دونوں بچے متوحش انداز میں اس سے لپٹ کر اسے تسلی دینے لگے۔

"ماما! مت روئیں ورنہ مجھے بھی رونا آجائے گا۔ بھائی آپ کو بھی بس بنا سوچے بولنے کی بڑی عادت ہے ویسے تو مجھے کہتے ہیں۔" اس کے آنسو صاف کرکے اسے پانی پلاتا شہروز فٹ سے عمار کو موردِ الزام ٹھہرا گیا۔ آسیہ اب خاموش تھی۔ صبیحہ نے بھی دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

چونکہ کل اس نے دکان شروع کرنی تھی۔ سو اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا بینر دکان کے باہر والی دیوار پر لگانا ازحد ضروری تھا سو اس نے عمار کو بینر کا کپڑا پکڑا کے خود سنبھل کے سیڑھی پر قدم رکھا۔ سردیوں کے دن تھے شام بہت جلد رات کا چولا پہن لیتی تھی۔ ابھی ملگجے اندھیرے میں احتیاط سے بینر کو کیلوں سے دیوار میں گاڑتے وہ اتری ہی تھی کہ پڑوس کے حامد کو منہ لٹکائے گزرتے دیکھا۔ بے دلی سے سائیکل گھسیٹتا حامد اس کی ایک آواز پر رک گیا۔ اونچی اٹھان والے بڑے بیٹے عمار کو کچھ دور واقع دکان پر سیڑھی واپس کرنے بھیجا اور حامد کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کیا ہوا حامد! منہ کیوں لٹکایا ہوا ہے اور اس وقت شام میں کہاں سے آرہے ہو؟" رسمی علیک سلیک کے بعد قدرے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"کیا بتاؤں خالہ! ابھی تھکا ہوا اکیڈمی سے آیا تھا کہ آپی نے بریانی لینے دوڑا دیا۔ آپ تو جانتی ہیں یہاں سے بریانی کی دکان کتنی دور پڑتی ہے۔ اتنی دور گیا بریانی پھر بھی نہیں ملی اب گھر جاؤں گا تو آپی کوئی نئی فرمائش کرکے مجھے پھر گھر سے نکال دیں گی۔" منہ بسورکے کہتے حامد نے گویا شدت سے احتجاج کیا تھا۔

"اور اگر تمہارا مسئلہ کہیں جائے بنا حل ہوجائے تو۔" آسیہ نے مسکرا کے کہا تو وہ بے طرح خوش ہوگیا۔

"تب تو معجزہ ہی ہوجائے گا۔ سکون سے گھر جا کے اطمینان سے سارے دن کی تھکن اتاروں گا۔" سست الوجود سے حامد نے زمانے بھر کی تھکن چہرے پر طاری کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرادی۔

"تو پھر آؤ تمہیں بریانی دیتی ہوں۔" اس نے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرکے فریج میں سے بچی ہوئی بریانی پلیٹ میں منتقل کی اور اس کی طرف بڑھادی۔

"خالہ! اس کے اوپر بھی ایک پلیٹ ڈھک دیں۔ اصل میں جب سے چچا کا انتقال ہوا ہے ان کی بیٹی زارا ندیدوں کی طرح ہر چیز پر حسرت بھری نگاہ ڈالتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس ایک وجہ سے آپی میرے لتے لے ڈالیں۔" سنجیدگی سے کہتے حامد کی بات پر آسیہ ششدر رہ گئی۔ حامد کے چچا الیاس احمد کا ایک ماہ پہلے ہی روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوا تھا۔ یکلخت آسیہ کا دل ترس و ہمدردی سے بھر گیا۔

"بری بات حامد بیٹا! ایسا نہیں کہتے اب نادان بچی کو کیا معلوم کہ آفات کے کون سے پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑے ہیں بچی ہی تو ہے۔" صبیحہ بیگم نے بھی تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے دادی! مگر آپا کو لگتا ہے کہ ان کے کھانے کو نظر لگ گئی تو یہ ہوجائے گا، وہ ہوجائے گا۔" کھلنڈرے سے حامد نے توجیح پیش کی تو صبیحہ بیگم خاموش ہوگئیں۔

"بہت شکریہ خالہ! آپ نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کردیا۔ ورنہ پتا نہیں اب آپا مجھے کہاں دوڑاتیں۔ یہ رکھیں پیسے اور میرا مشورہ تو یہ ہی ہے کہ آپ بریانی بھی لگالیں اور کوئی لے نہ لے ہم تو اکثر لیں گے۔ آپا کے جلق سے تو گھر کے آلو دال نکلتے ہی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی نہیں پسند۔" اس کی مٹھی میں ایک سو اور ایک پچاس کا نوٹ تھماتا حامد اب اسے مفت مشورے سے بھی نواز رہا تھا۔

"یہ کیا حامد! میں نے تم سے بریانی کی قیمت کب مانگی ہے؟" اچنبھے سے اپنی مٹھی میں دبے نوٹ دیکھتی وہ حامد سے استفسار کرگئی۔ وہ تو اکثر جب بھی

کچھ اچھا بناتی تھی محلے میں ضرور بھیجتی تھی۔

"خالہ! اگر میں باہر سے بریانی لیتا تب بھی تو پیسے لگتے آپ کو دے دیے تو کیا ہوا۔ ویسے بھی آپ نے بھی تو بریانی پیسوں سے ہی بنائی ہوگی۔ آپ کے حالات ہم سے مخفی نہیں سب جانتے ہوئے آپ سے کوئی چیز مفت لیتے ہم اچھے لگتے ہیں۔" حامد کی نرم لہجے میں دی گئی تاویل پر بھی وہ متذبذب تھی کہ صبیحہ کے ہاں میں ہلتے سر کو دیکھ کے مطمئن ہوگئی۔

"اماں! میں یہ ذرا زارا کی ماں کو دے آؤں۔ بےبسی اور بےبسی کے اس عالم میں ہم ان کے لیے زیادہ کچھ تو نہیں کرسکتے مگر اتنا تو کرسکتے ہیں ناں۔" حامد کے نکلتے ہی وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھی اور بقیہ بچی بریانی اور تھوڑا سا قورمے کا سالن نکال کے گلی میں ہی موجود حامد کے گھر کی طرف چل دی۔ چونکہ حامد کی فیملی اوپر کے پورشن میں رہتی تھی سو اس کا زارا کو کھانے کی ٹرے تھمانا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ آسیہ کے دل میں اطمینان کی ایک لہر موجزن ہوئی تھی۔ خدا نے اس کے لیے آسانی کا ایک اور در کھولا تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس آسانی میں اللہ کی مخلوق کو بھول جاتی۔ گھور اندھیرے میں گھر کی طرف اٹھتے اس کے قدموں میں بلا کا اعتماد تھا۔

"بے شک جب دل و دماغ اور روح نیکی کے زم زم سے معطر ہوجائیں تو انسان یونہی ہلکا پھلکا ہوجاتا ہے جیسے روئی کا پھاہا ہو۔ سب غم یوں مہکنے لگتے ہیں جیسے وہ غم نہیں بلکہ خوشی کا ردِ پہلا احساس ہوں۔

☆☆☆

"آشان! کبھی تو اس منحوس اخبار کو رکھ بھی دیا کریں۔ صبح ایک، ایک خبر حفظ کرکے آفس جاتے ہیں۔ شام میں آکے پھر وہی اخبار..... میں پوچھتی ہوں پہلے سے پڑھی ہوئی خبریں بور نہیں کرتیں آپ کو۔" نصیحہ سبزی کی ٹوکری لیے ملگجی سی رخصت ہوتی دھوپ میں بچھے تخت پر ہی آبیٹھیں۔ پاس ہی کرسی ڈالے بیٹھے صبح کے باسی اخبار میں مستغرق آشان، نصیحہ کی گوہر افشانی پر ناگواری سے پہلو بدل گئے۔

"ہاں بولو کیا بات ہے میرے کان الحمدللہ ساتھ ہی ہیں اور اتفاق سے میں کانوں سے ہی سنتا ہوں۔ تم کبھی تو سنوں گا ناں بے وجہ ہی لٹھ اٹھا کے میرے اخبار کے پیچھے پڑ جاتی ہو۔" پھرتی سے اچک کر اخبار جھپٹنے کی صبیحہ کی کوشش ناکام بناتے ہوئے بیک کے بولے تو نصیحہ کو نئے سرے سے تاؤ چڑھا۔

"سارا فساد اس اخبار کا ہی تو ہے۔ جب بھی کوئی ضروری بات کرنی ہو منہ کے آگے اخبار تانے یوں ہو جاتے ہیں جیسے گھر میں ہی نہیں ہوں۔ میں پوچھتی ہوں یہ گھر اس کی ذمے داریاں بھی آپ کی ہیں یا نہیں۔ روز قیامت فرشتے فرائض کے بارے میں جواب دہی کریں گے تو اخبار پڑھ کے سنا دینا۔" نصیحہ جو اخبار چھیننے میں ناکامی پر جی بھر کے جھنائی ہوئی تھیں طیش کے عالم میں بولتی چلی گئیں۔ غیر سنجیدگی سے سنتے آشان ان کی آخری بات پر بھڑک اٹھے۔

"استغفراللہ بندہ بات کرنے سے پہلے کچھ سوچ ہی لے۔ بولو کیا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے مجھے اتنے طعنے دیے جارہے ہیں۔" ہار ماننے والے انداز میں اخبار اور چشمہ سامنے تخت پر رکھتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ موسم بدل گیا ہے کچھ شاپنگ کرلوں۔ رافعہ آپا کے بیٹے کی بھی تو شادی ہے اگلے ماہ وہاں کیا پرانے کپڑے پہن کر جاؤں گی۔ ویسے بھی اگلے ہفتے شارقہ کا دیور امریکا جارہا ہے۔ سوچتی ہوں اس کے ہاتھ شارقہ کے لیے کچھ سوٹ بھجوادوں۔ سوچتی ہوں جب سے شادی ہوئی ہے اماں باوا بھول ہی گئے ہیں۔" انہیں ہتھیار ڈالتا دیکھ کے وہ جھٹ مدعے کی بات پر آگئی تھیں کہ مبادا آشان پھر اپنے سامنے اخبار تان کے دنیا و مافیہا سے بےخبر نہ ہوجائیں۔

"لو میں نے کہا پتا نہیں کون سی خاص بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شارقہ کا تو بس بہانہ ہے۔ اصل میں تو تمہیں بھانجے کی شادی پر سج دھج کے جانے کے لیے اس عمر میں شاپنگ کا شوق چرایا ہے۔" زیرِ لب مسکرا کے

انہوں نے دانستہ بیوی کو چھیڑا تھا۔ شارقہ کا دیور کل ہی تو انہیں ملا تھا باتوں، باتوں میں یہ بھی بتا گیا کہ اس کا امریکا جانے کا پروگرام کسی وجہ سے التوا کا شکار ہو گیا۔

''کیوں میری عمر کو کیا ہو گیا۔ غضب خدا کا ساری زندگی آپ کا گھر سنبھالا۔ آپ کی بہن کا قرض نبھایا آپ کے بچوں کو پڑھایا لکھایا ان کی تربیت کی۔ اس کا یہ صلہ دے رہے ہیں کہ ذرا سی شاپنگ کی خواہش پر عمر کے طعنے دینے لگے۔ یہ عمر میں نے گھاس کھود کے نہیں گنوائی آپ کے بے فیض خاندان کی خدمت میں گزاری۔'' زہر خند ہوئیں ..... وہ سامنے رکھی مٹر کی ٹوکری کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''تم تو یونہی دل پر لے جاتی ہو میں نے تو مذاق میں کہا تھا۔'' دل ہی دل میں خوب حظ اٹھاتے آشان مختصر وضاحت دے کر سامنے پڑے اخبار کی طرف دوبارہ متوجہ ہوئے تھے۔

''اچھا یاد آیا شمیلہ کیا کہتی پھرتی ہے۔ مطلب آپ تو اس دن آسیہ کے گھر گئے تھے ناں کیا کہا اس نے؟'' یک لخت کچھ یاد آنے پر لہجہ بدلتے ہوئے انہوں نے پوچھا تو آشان کے چہرے پر سایہ سا آ کے گزرا۔

''شمیلہ کی تو عادت ہے بات کو بڑھا چڑھا کے بتانے کی۔ ویسے بھی اس کا اپنا گھر ہے وہ رینٹ پر دے یا بیچ دے ہمیں اس سے کیا۔'' نظر چراتے ہوئے رسان سے کہتے آشان نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

''پھر بھی اسے آپ کی یہاں شفٹ ہونے والی بات کو رد کر کے خود مختاری سے گھر رینٹ پر نہیں دینا چاہیے تھا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اپنے بھائیوں کے ہوتے آسیہ اس طرح کی حرکتیں کر رہی ہے۔ اور تو اور ذیشان صاحب کو دیکھو چار پیسے کیا آ گئے اپنی فارحہ کو اچھے اسکول میں داخل کروانے سے پہلے آپ سے مشورہ تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔'' فصیحہ نے دانستہ بات کو یہ رخ دیا تھا مقصد آشان صاحب پر ان کے خاندان کی نظر میں ان کی حیثیت واضح کرنا تھا۔

''تم شاپنگ کے لیے کہہ رہی تھیں بتاؤ کتنے پیسے چاہئیں۔'' نظر چراتے ہوئے آشان نے دانستہ بیوی کو اس موضوع سے ہٹانا چاہا۔

''آپ مانیں نہ مانیں آسیہ کی یہ حرکت معاشرے میں آپ کی عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دے گی۔ اب آپ دونوں تو آفس چلے جاتے ہیں پیچھے محلے والوں کی فضول قیاس آرائیوں کا جواب تو مجھے اور شمیلہ کو ہی دینا پڑے گا ناں۔'' بات ذہن کی ہولو یونہی سمیٹ دی جائے پھر مزہ کیا۔ فصیحہ نے بھی پرے پرندے کو مرضی کی گرہیں لگائی تھیں۔

''میرے پاس یہ ہی دس ہزار ہیں۔ اس میں جو خریداری ہوتی ہے کر لو۔ میں ذرا کاشف صاحب کی طرف چکر لگا آؤں کافی دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' والٹ تخت پر رکھ کے چشمہ اٹھاتے آشان دانستہ بات سمیٹتے گھر سے نکلتے چلے گئے۔ فصیحہ نے باہر نکلتے شوہر پر گہری نظر ڈال کے دل ہی دل میں حظ اٹھایا۔ انہوں نے جلدی ہاتھ چلانے شروع کیے کہ اویس اکیڈمی سے آنے والا تھا۔ اور وہ آتے ہی کھانے کے لیے شور مچا دیتا۔

رخصت ہوتی ملگجی سی زرد دھوپ یخ بستہ شام کے سرمئی آنچل میں محو استراحت ہوئی تھی۔ فصیحہ اٹھ کے کچن میں آ گئیں۔ وہ جب بیاہ کر اس گھر میں آئی تھیں تب آسیہ پندرہ، سولہ سال کی چھوٹی سی بچی تھی۔ جانے کیوں مگر اسے آسیہ سے خدا واسطے کا بیر تھا اس کا ہر کام اسے ہزار غلطیوں سے مزین نظر آتا۔ آسیہ کی غلطیاں درست کرتے اسے ڈھکے چھپے لفظوں میں ڈی گریڈ کرنے کی فصیحہ کی عادت کی وجہ سے آسیہ میں اعتماد کا فقدان ہوتا چلا گیا۔ کچھ یہی حال شمیلہ کا بھی تھا دونوں ہم نیت تھیں سو دونوں کی خوب چھنتی تھی۔ خدا نے انہیں شارقہ کے کئی سال بعد اویس کی صورت اولاد نرینہ سے نوازا تھا۔ جبکہ شمیلہ کے آنگن میں بھی آٹھ سال بعد فارحہ کسی پری کی صورت اتری تھی۔ اللہ نے آسیہ کو بھی دو بیٹوں سے نوازا مگر جلد ہی بیوگی کا داغ اس کی سب خوشیاں کھا گیا۔ ادھر ذیشان کی ترقی ایسی پوسٹ پر ہو گئی جہاں کمائی کو کئی درجہ دگنا کے بڑھانے کے بہت چانسز تھے۔ پھر قسمت سے ملنے والے موقعوں کو وہ کیسے گنوا سکتا تھا۔ یوں وہ پیسہ گھر میں آنے لگا جسے شر اور فتنہ ٹھہرایا گیا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ گھر میں اتفاق اور محبت باقی رہتی۔ سو بہت جھگڑے اور تلخیوں کے بعد ذیشان اپنے حصے کو فروخت کر کے اسی محلے میں ایک شاندار کوٹھی لے کر الگ ہو گیا۔ یوں سب اپنے، اپنے مدار میں گھومتے ہوئے اپنے فانی سفر میں آگے سے آگے بڑھتے گئے۔

☆☆☆

اس نے بہت شکستہ دل اور کم حوصلے کے ساتھ یہ دکان شروع کی تھی۔ پہلے دن ہی کئی لوگوں نے پورے وثوق سے کہہ دیا کہ اس نے محض اپنے پیسے ضائع کیے ہیں بھلا گلی محلوں میں بھی دکانیں چلتی ہیں۔ مگر گزرتے وقت نے یہ ثابت کیا کہ جب کوئی راہ خدا سمجھتا ہے اور انسان خدا کو ہی مددگار سمجھ کے شروعات کرتا ہے تو خدا اس میں برکت ضرور دیتا ہے۔ کچھ مخصوص منفی سوچ کے حامل لوگوں کے برعکس وہ لوگ جو ذرا ذرا سی چیزوں کے لیے کئی گلیاں دور مین روڈ تک جاتے تھے انہیں گلی کے نکڑ پر موجود یہ علیم جنرل اسٹور کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں لگا تھا۔ بے شک رزق دینے والی ذات خدا کی ہے مگر انسان کو ہی اللہ نے انسان کا مددگار بھی بنا کے بھیجا ہے۔ سو مصائب کی اس گھڑی میں ان کی ہمت اور حوصلے کی داد دیتے ہوئے کئی خاندانوں نے مہینے کا سودا ان سے ہی لینا شروع کر دیا۔ یوں اللہ کے فضل سے ان کا گھر بخوبی چلنے لگا۔ اس نے شام میں بریانی بھی لگانا شروع کر دی۔ یہ وہ کام تھا جو واقعی دنوں میں آمدن دینے لگا تھا۔

''واہ صبیحہ تم نے تو بڑا خوب صورت نمونہ بنایا ہے اس سویٹر کا..... کس کے لیے بنا رہی ہو؟'' رخشندہ بیگم جو چائے کی پتی لینے آئی تھیں وہیں کرسی پر سویٹر بنتی صبیحہ کو دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

''ارے شہروز کے لیے بنا رہی ہوں۔''

''بہن میرے پوتے کے لیے بھی بنا دو گی میں تمہیں محنتانہ دوں گی۔''

''ارے پیسوں کی کوئی بات نہیں، میں تو ویسے بھی بنا دوں گی۔''

وہ ابھی باتیں کر رہی تھیں کہ صنوبر آ گئی۔ ''اُف دادی! آپ یہاں بیٹھی ہیں اُدھر چائے کا پانی پک پک کے پاگل ہو گیا ہے۔'' اور اس نے رخشندہ کو یہاں دیکھ کے گویا ماتھا ہی پیٹ لیا اسے یونیورسٹی سے دیر ہو رہی تھی۔ ویسے بھی وہ رخشندہ کی باتونی عادت سے خوب واقف تھی۔

''اے لو آ گئی تھانیدارنی پہلے گھر سے پتی چینی لانے کے لیے نکال دیا اب آ گئیں لٹھ اٹھا کر بھئی کہیں جائے انسان تو دیر تو لگ ہی جاتی ہے۔ پر نہیں انہیں تو بس ہتھیلی پر سرسوں جمانی ہے۔'' رخشندہ نے مصنوعی ناراضی سے پوتی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ جبکہ کان سے مکھی اڑاتی صنوبر کی نظریں ایک جگہ پر ساکت ہوئی تھیں۔

''اللہ کتنی خوب صورت پینٹنگ ہے یہ کہاں سے لی آپ نے آسیہ چچی! قسم سے مجھے تو شروع سے ایسے شاہکار بہت متاثر کرتے ہیں۔'' صنوبر اب سامنے ہی ریک میں رکھی پینٹنگ کی طرف متوجہ تھی جس پر بہت خوب صورتی سے سرخ اور سیاہ پینٹ سے آیت الکرسی لکھی گئی تھی۔ یہ شوق اسے بچپن سے تھا جب بھی اس کا دل مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا وہ کوئی نہ کوئی آیت خوشخطی میں لکھتی۔ یہ پینٹنگ اس نے رات کو ہی تیار کی تھی۔ اسے بڑے ہی چاؤ سے شادی کے تحفے میں ملے بڑے سے فریم میں سیٹ بھی خود ہی کیا۔ شادی پر ملے تحائف میں سے کافی چیزیں تھیں جو آج تک ویسی کی ویسی پڑی تھیں۔

''کہیں سے نہیں لی لاڈو خود بنائی ہے۔ تمہیں پسند ہے تو تم رکھ لو۔'' محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتی آسیہ نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو صنوبر بے طرح خوش ہو گئی۔

''میں یہ لے کر جا رہی ہوں، پیسے مظفر کے ہاتھ بھجواتی ہوں۔'' دوسرے ہی پل وہ اٹھلاتی ہوئی

پینٹنگ تھمائے یہ جا وہ جا۔ کچھ ہی دیر میں مظفر ہزار کے دو نوٹ تھما گیا۔ جنہیں مٹھی میں بھرے وہ پُرسوچ انداز میں بیٹھی تھیں۔

''کیا ہوا آسیہ! پیسے کم ہیں کیا؟'' شام کے کھانے کے لیے پیاز کاٹتی وہ اس گم صُم بے سنجیدہ چہرے پر نظر جما کے مستفسر ہوئیں۔

''نہیں اماں! میں سوچ رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہماری سب مشکلات بنا کہے ہی جان لیتا ہے۔ اِدھر ذہن کسی مشکل کا سرا تلاش کرتا رب سے کہہ بھی نہیں پاتا کہ رب اس مشکل کو آسانی میں بدل کے انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔'' جذب سے کہتی آسیہ کی آنکھوں کے کنارے تشکر کے گہرے احساس سے بھیگ گئے تھے۔

''تم ٹھیک کہتی ہو کل اسکول ٹرپ کا بتاتے دونوں بچوں کے مایوسی میں ڈوبے چہرے میرے لیے بھی ناقابلِ برداشت تھے۔ دیکھو رب نے سبب بنا ہی دیا ناں۔'' دبیز دھند کی چادر میں لپٹے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے صبیحہ خاتون کا دل رب کی عنایات پر پھر سے بھر آیا تھا۔ مگر وہ آسیہ کو تسلی دیتی رہیں۔

وقت ان پر بہت جلد مہربان ہوا تھا۔ جلد انہوں نے اوپر پورشن بنالیا تھا۔ جہاں شفٹ ہوتے ہی عمار اور شہروز نے دکان کی ذمے داری بانٹ لی۔ شہروز کی کالج ٹائمنگ صبح کی تھیں جبکہ عمار شام کی کلاسز لیتا تھا۔ اب بھی وہ بریانی بناتی، علیم بریانی پوائنٹ اب دور، دور تک شہرت حاصل کر چکا تھا۔ گویا اللہ خود ان کا مددگار بن گیا تھا۔ جب اللہ مددگار بن جائے تو غیب سے رزق کے دروازے وا ہوتے ہیں۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا سو آشان گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے ایک نیا مشغلہ اپنا لیا تھا ایک لائبریری کی ممبر شپ حاصل کر لی تھی۔ اب روز نت نئی کتب لا کے ان کے مطالعے میں مستغرق رہتے۔ فصیحہ نے ناشتے کے بعد کام والی سے گھر کی تفصیلی صفائی کروائی۔ اور کچن سمیت کر دھلے کپڑوں کا ڈھیر اٹھاتی کمرے میں چلی آئیں تو آشان توقع کے عین مطابق اب بھی کتاب میں منہمک بیٹھے تھے۔ آج موسم بے انتہا خنکی لیے ہوئے تھا۔

''ارے صاحب! بہت بہت مبارک ہو آپ کو آپ کی ترقی ہوگئی۔'' قدرے جلا کے انہوں نے بات کا آغاز کیا جس پر چشمے کے اوپر سے انہیں گھور کے دیکھا۔

''اچھا اور یہ انقلاب کب آیا۔ میری ترقی ہوئی اور مجھے ہی خبر نہیں کمال ہے۔'' بیگم کے طنز کو چھوڑ کر سمجھتے ہوئے وہ محتاط لہجے میں بولے کہ گھر کا ماحول بالکل خراب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

''بھئی اس موئے اخبار سے کتابوں پر آگئے ہوئی ناں ترقی باقی دنیا جائے بھاڑ میں۔ گھر میں کیا چل رہا ہے کچھ خبر بھی ہے آپ کو؟'' ماتھے پر تفکر کے بل سجائے وہ اویس کی تہہ شدہ قمیص کو پٹخ کر اب سر تھام کے بیٹھ گئی تھیں۔

''اب گھر میں ایسا کیا طوفان آگیا کہ میں اپنے دو پل کے مشغلے کو ترک کر کے تمہاری طرح سر تھام کے بیٹھ جاؤں۔'' ان کے غصیلے تیور دیکھ کر آشان نے اب کے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

''طوفان ہی سمجھیں آپ کے لاڈلے نے اب ایک نئی ضد پکڑ لی ہے کہتا ہے شادی کروں گا تو صرف فارحہ سے۔ اور اِدھر تمہاری بھابی کے مزاج نہیں ملتے۔ سوچتی ہوں بات کر کے کہیں گنوا ہی نہ دوں رہی سہی عزت۔'' فصیحہ آج کل اویس کی حرکتوں سے حقیقتاً بہت پریشان تھی۔

''چہ خوب پہلے ہی اس نکھٹو کی آوارہ گردیاں ہمارے حلق تک آئی ہوئی تھیں۔ اس پر یہ نئی فرمائش اس سے کہو پہلے اپنے آوارہ دوستوں سے جان چھڑا کے کوئی نوکری ڈھونڈے پھر ہم سے کوئی فرمائش کرے۔ بڑا آیا فارحہ سے شادی کرنے والا۔'' فصیحہ کی بات سن کے ان کا اطمینان رخصت ہوا تھا۔ غضبناک لہجے میں کہتے وہ بیگم کو ہی بے نقط سنا گئے تھے۔

''مجھ پر کیوں غصہ کر رہے ہیں میں تو خود بہت پریشان ہوں اسی لیے تو آپ سے بات کی کہ سمجھائیں اسے۔'' فصیحہ قدرے خائف ہو کر کہتے ہوئے پھر سے کپڑوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''ہے کہاں وہ ناہنجار، بڑی دیکھ لیں اس کی دکتیں آج تو میں اس کی وہ ٹھکائی کروں گا کہ دماغ ٹھکانے آجائیں گے جناب کے۔'' انہوں نے بک سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے گرج کے کہا اتفاق سے اسی وقت اویس کی شامتِ اعمال اسے گھر لے آئی۔

''صاحبزادے! ذرا یہاں تو آیئے کون سی جاگیر کی سیر کو نکلے تھے کہ ناشتے کے بعد اب دیدار کروا رہے ہیں۔ اور یہ ماں کیا کہہ رہی ہے تمہاری کہ تم فارحہ سے شادی کی رٹ لگا کے بیٹھے ہو۔ اپنا منہ دیکھا ہے تم نے شیشے میں، کالج تم نے چھوڑ دیا ہے جاب تمہیں نہیں ملتی۔ تم اس گمان میں ہو کہ ذیشان اپنی نازوں پلی بیٹی تم جیسے نکھٹو کو دے دے گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔'' غیظ ڈھاتے لہجے میں آشان نے گویا اسے اس کی اوقات یاد دلائی تھی۔

''تو اس میں بھی غلطی آپ کی ہے۔ کتنی بار کہا ہے کہ شارقہ آپی سے کہیں کہ مجھے امریکا بلوالیں۔ مگر آپ ہیں کہ ہر بار مجھے ہی میری ہزار خامیاں گنوا کے خاموش کروا دیتے ہیں۔ ایک بار بات تو کریں آپا سے ہوسکتا ہے وہ مجھے بلوا ہی لیں۔ وہاں جا کے میں جاب کروں گا پھر ہمارے دن بھی پھر جائیں گے۔'' بیڈ کی پائنتی کی طرف بیٹھا اویس سارا قصور ان پر ڈالتے ہوئے اب لجی انداز میں کہہ رہا تھا۔

''تم بھی کمال ہی کرتے ہو بھئی، یعنی تم نے یہاں بہت کامیابی کے جھنڈے گاڑ لیے ہیں جو امریکا والے جاب پلیٹ میں سجا کے تمہارے انتظار میں کھڑے ہوں گے۔ تم پہلے کوئی اچھی ڈگری تو حاصل کرو۔ وہاں جا کے بہن کے گھر مفت کی روٹیاں توڑتے شرم نہیں آئے گی تجھے۔'' مارے غیظ کے آشان کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔

''نرمی سے بات کریں سمجھ جائے گا۔ جوان

اولاد پر یوں سختی نہیں کرتے۔'' فصیحہ نے اٹھ کے پانی کا گلاس انہیں دیا اور ساتھ ہی تنبیہ کی۔ جس پر سامنے بیٹھا اویس اور شیر ہوا۔

''آپ کے ہر وقت کے طعنوں کی وجہ سے ہی میں گھر نہیں آتا۔ ساری دنیا کو اپنی اولاد میں صرف خوبیاں نظر آتی ہیں ایک دنیا سے نرالے آپ ہیں کہ سارے عیب مجھ میں ہی ڈھونڈتے ہیں۔'' تلخ لہجے میں کہتا وہ اٹھ کے جانے لگا جب باپ کی سرد لہجے میں پکار پر ٹھٹک کے رک گیا۔ اور سوالیہ نظریں ان پر جمادیں۔

''فارحہ کا خیال دل سے نکال دو اگر نہیں نکال سکتے تو اس کے قابل بن کے دکھاؤ کہ میں بھی فخر سے اپنے بھائی سے تمہاری بات کر سکوں۔ دیکھو ہم تمہارے دشمن نہیں مگر تم خود سوچو تم نے زندگی کو مذاق سمجھ رکھا ہے۔ یہ زندگی آسان نہیں ہے بیٹا۔'' نپے تلے قدم اٹھا کے اس کی طرف بڑھتے آشان اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے نرمی سے سمجھانے لگے۔

''اب نہیں ملتی نوکری تو یہ بیچارہ کیا کرے کوشش تو کرتا ہے ناں۔ چل اویس وعدہ کر جب تک نوکری نہیں ملتی فارحہ کا نام نہیں لے گا تو۔'' آشان صاحب کو دھیما پڑتے دیکھ کے فصیحہ بیٹے کی بھرپور حمایت کی غرض سے میدان میں کودی تھیں۔

''اور تب تک اگر شمیلہ چچی نے فارحہ کا رشتہ کہیں اور طے کر دیا تو... بس آپ لوگ جو بھی کہیں آپ کو ان لوگوں سے ابھی بات کرنی ہی ہوگی۔ ورنہ میں خود جا کے ان سے بات کرلوں گا۔'' قطعیت سے کہتا اویس لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے نکلتا چلا گیا۔

''دیکھا اسے کہتے ہیں کتے کی پونچھ اسے جتنی مرضی سمجھا لو وہ نہیں سدھرنے والا۔'' غضبناک لہجے میں کہتے آشان نے اپنی جگہ پر واپس بیٹھتے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

''اگر اس کی یہی ضد ہے تو اس کی بات مان لینے میں کیا حرج ہے۔ سیانے کہتے ہیں ایک کہے اور دوسرا مان لے تو سمجھیں دونوں سمجھداری کا ثبوت دے رہے

ہیں۔" نصیحہ نے کپڑوں کو وارڈروب میں ٹھکانے لگاتے ہوئے شوہر کو ناصحانہ انداز میں سمجھانا چاہا۔

"اپنے آوارہ اور نکھٹو بیٹے کے لیے فارحہ کا رشتہ لے جا کے تم اگر ذیشان اور شمیلہ کے ہاتھوں ذلیل ہونا چاہتی ہو تو شوق سے جاؤ۔ میں تو وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔ ویسے بھی وہ لوگ شاید فارحہ کے لیے عمار کو سوچے بیٹھے ہیں۔" آشان نے ذیشان سے ہوئی چند دن پہلے کی سرسری باتوں کے پیشِ نظر بات واضح کی اور گھر سے نکل گئے۔ نصیحہ دم بخود سی وہیں کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

وقت پر لگا کے اڑا تھا اس کا گھر اس کے پیار کرنے والے بھائی سب انہیں واپس مل چکا تھا یہ اس کے صبر کا انعام ہی تو تھا کہ گزرتے وقت نے کامیابی کے پھول چھاجوں چھاج برسائے تھے۔ عمار اب ایک کامیاب وکیل تھا جبکہ شہروز باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فوج میں گیا تھا۔ عمر کے اس حصے میں آسیہ جب اپنے مضبوط قد کاٹھی کے کامیاب وجیہہ خدوخال کے بیٹوں کو دیکھتی تو پھولے نہ سماتی۔ پھر برا وقت اور اس برے وقت میں ساتھ نبھانے والی شفیق اماں کو یاد کر کے روتی تو عمار اور شہروز اس کی ڈھارس بن جاتے۔ اسے کئی بار لگا کہ عمار کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پاتا۔ کئی بار اس نے سوچا وہ خود سے پوچھ کے اپنے بیٹے کو اس الجھن سے نکال لے پھر اپنا وہم جان کے خاموش ہو جاتی۔ لیکن کوئی بات تو تھی جو عمار کو یوں الجھائے ہوئے تھی۔ اب بھی وہ اس کے کمرے میں آئیں تو وہ تک سک سے تیار ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔

"کالج جا رہے ہو بیٹا! کب تک آ جاؤ گے واپس۔ اصل میں آج شہروز بھی واپس جا رہا ہے تو میں نے سوچا کہ رات کے کھانے پر کچھ اہتمام کر لوں پھر نہ جانے کب یوں مل بیٹھنا نصیب ہو۔" لحاف کی تہہ لگاتے ہوئے آسیہ نے آزردگی سے کہا۔

"میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا امی! آج کالج کا آخری دن ہے تو سب فرینڈز نے پارٹی رکھ لی ورنہ اب تو آپ کا بیٹا وکالت کی ڈگری لے کے باقاعدہ وکیل بن چکا ہے۔" برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کے وہ سرعت سے مڑا اور ان کے کاندھوں کے گرد بازو حمائل کر کے انہیں تسلی دی۔

"ہاں میرے رب نے بڑا کرم کیا ہم پر۔ ایک بھی وقت تھا جب میں بے یقین تھی کہ اگلے وقت کا کھانا بھی تم لوگوں کو کھلا پاؤں گی یا نہیں۔ شکر ہے میرے رب نے مجھے سرخرو کیا۔ آج اماں اور علیم بھی ہوتے تو تم دونوں کو دیکھ کے کتنے خوش ہوتے۔ بس اب تو ایک ہی خواہش ہے کہ تمہارے سر پر سہرا سجا دیکھوں۔" افسردگی سے کہتی آسیہ نے آئینے میں نظر آنے والے اپنے سرو قد بیٹے کے عکس کو دیکھ کے بلائیں لیں۔

"آہم لگتا ہے کوئی بڑی ہی اہم بات ہو رہی ہے۔ لگ تو یہ بھی رہا ہے کہ کسی دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں کیوں بھائی۔" شہروز ہنسی دباتا اندر آیا اور اپنے مخصوص چلبلے انداز میں عمار کو چھیڑنے لگا۔

"بس آ گئے تم اپنی بے تکی ہانکنے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" عمار نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اسے ٹالنا چاہا۔

"ویسے ماما جانی! سوچ آپ بالکل ٹھیک رہی ہیں کتنا سونا سونا ہے ناں ہمارا گھر۔ آپ کی دونوں بہویں آ جائیں گی تو کتنی رونق ہو جائے گی ناں گھر میں۔" شہروز نے دانستہ بات کو اپنی مرضی کا رنگ دیا خیال یہ ہی تھا کہ عمار ابھی قہقہہ لگا کے ہنس دے گا اور ان کی نوک جھونک آسیہ کی اداسی لے اڑے گی۔

"نہیں دونوں نہیں ابھی مجھے صرف عمار کی دلہن لانی ہے۔ تم ابھی اپنی ٹریننگ پر توجہ دو۔" آسیہ نے خوشی سے نہال ہوتے ہوئے شہروز کو مصنوعی خفگی سے گھورا۔

"بھائی امی تو آج ہی آپ کو سہرا پہنانے کا سوچ رہی ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ بھی اس بارے میں اپنے نیک خیالات کا اظہار کر دیں۔ ایسا نہ ہو اماں آپ کے لیے جلدی میں کوئی بھٹکن پسند کر لیں۔" شہروز نے چہرے پر مکمل سنجیدگی طاری کرتے ہوئے مفت مشورے سے نواز کے گویا اشارتاً کچھ کہا تھا۔

"لو میں اپنے ہیرے جیسے بیٹے کے لیے کوئی بھٹکن کیوں پسند کروں گی۔ کچھ بھی بولتے ہو تم۔" شہروز کے کان مروڑتے ہوئے آسیہ نے مسکرا کے کہا۔

"گاڈ! مجھے دیر ہو رہی، اس معاملے پر واپس آ کے غور کریں گے۔ اور ہاں اماں آج کھانے میں دال بنائیے گا۔ آج اس بدتمیز کو گھر سے نکال کے کل ہم ماں بیٹا دعوت اڑائیں گے۔" اس کا اشارہ مکمل طور پر نظر انداز کر کے عمار نے لاڈ سے آسیہ سے کہا تو شہروز بھنا گیا۔

"ایک میں ہوں کہ آپ کی ہمدردی میں دبلا ہو رہا ہوں اور آپ ہیں کہ مجھے بدتمیز قرار دینے پر تلے ہیں۔ سچ کہتے ہیں بھلائی کا زمانہ نہیں۔" شہروز منہ پھلا کے دھم دھم پیر پٹختا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عمار نے ماں سے دعا لی اور کالج چلا آیا۔

دھند میں لپٹی کہر آلود دوپہر نے سڑکوں پر کچھ ویرانی پھیلا رکھی تھی۔ کچھ دور تک ہی پھیلا منظر دھند میں کچھ یوں لپٹا تھا کہ بصارتوں میں صحیح سے سما ہی نہیں رہا تھا۔ وہ جب لا کالج پہنچا۔ کالج کا وسیع و عریض لان جیسے سفید دھویں کے اسرار میں مدغم تھا۔ اندر سب اس کے منتظر تھے۔ اس دن کی پارٹی بہت اچھی رہی مگر وہ ریمل سے آنکھیں چراتا رہا۔ ریمل اشفاق وہ لڑکی جس نے اس کے پتھر سے دل پر اپنے خلوص کی گہری ضرب لگائی تھی۔ مگر وہ بے بس تھا دل سے ریمل کے خلوص کی قدر کرنے کے باوجود وہ اسے امید کا کوئی جگنو نہیں تھما سکتا تھا۔ اندر ہنگامہ ابھی سرد نہیں پڑا تھا کہ عمار باہر آ کے لان کی طرف اترنے والی سیڑھیوں پر آ بیٹھا۔ کچھ دیر میں شہروز اسے لینے آنے والا تھا۔

"آج ہمارا کالج میں آخری دن ہے پھر پتا نہیں کب بات ہو۔ ہو گی بھی یا نہیں۔ یہ کارڈ اور پھول تمہیں میری یاد دلائیں گے۔" پھولوں کا بوکے اور کارڈ اسے تھما کے ریمل وہیں سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی۔ خنکی اوڑھے چلتی سرد ہوا نے خزاں رسیدہ زرد پتے ان پر اچھالے تھے۔

"ہم اچھے دوست ہیں ریمل اس ناتے فون پر تو رابطہ رہے گا ہمارا۔" عمار نے نظر چراتے ہوئے سرسری انداز میں کہا تو ریمل کو لگا وہ پیلے خشک پتوں کے مانند بے مول ہے۔ دبیز خاموشی ان کے درمیان سرد مہری کی بکل مار کے گھس آئی تھی۔

"ریمل بعض دفعہ ہم خلوص دل سے جو بھی مانگتے ہیں وہ ہمارے نصیب میں نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہمارے خلوص میں کمی ہے۔ بلکہ خدا نے ہمیں اس سے بھی بہترین کے لیے چن رکھا ہوتا ہے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو ہم صرف اچھے دوستوں کی طرح آئندہ بھی ملتے رہیں گے خدا حافظ۔" وہ جا چکی تھی۔ وہ بھی باہر کی طرف بڑھ گیا۔

"بھائی! آپ کو لگتا ہے کہ آپ فارحہ کے لیے امی کو منا پائیں گے۔ بالفرض امی مان بھی گئیں تو کیا مامی مان جائیں گی۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی شہروز نے جھلا کے پوچھا۔

"امی کو میں منا لوں گا۔ مامی کو فارحہ منا لے گی۔" عمار نے سنجیدہ لہجے میں کہہ کے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اب اس کی ساری توجہ ونڈ اسکرین پر مرکوز تھی۔

"یعنی سب کچھ پہلے سے سوچے بیٹھے ہیں آپ۔ مگر ایک بات شاید آپ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔" کھڑکی سے دوڑتی بھاگتی گاڑیوں پر نظر جمائے اب وہ انتہا کی حد تک سنجیدہ تھا۔

"کون سی بات؟" عمار نے اب کے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔

"آپ سب کو اپنے حق میں کر لیں گے۔ فارحہ سے شادی بھی کر لیں گے مگر کیا اس کی نیچر بدل پائیں گے۔ ساری زندگی ممانی نے امی کی زندگی اجیرن کیے رکھی۔ کیا ثبوت ہے کہ فارحہ ممانی کی شہ پر امی سے ان کا بیٹا نہیں چھینے گی۔" شہروز نے اپنے ذہن میں پلنے والا بدترین خدشہ بیان کیا۔ اسے فارحہ سے کوئی پرخاش نہیں تھی مگر وہ آنے والے حالات سے ڈرتا تھا۔

"تم اتنے نچی کیوں ہو رہے ہو۔ میں ہوں ناں میں سنبھال لوں گا سب اور تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں

فارحہ کے کہنے پر تم لوگوں کو چھوڑ سکتا ہوں۔ ناممکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔‘‘ عمار نے پُرعزم انداز میں کہتے ہوئے گویا اس کے سب خدشات کو بے بنیاد ثابت کیا۔

’’اللہ کرے آپ جو سوچ رہے ہیں سب ویسا ہی ہو۔‘‘ شہروز نے ہار مانتے ہوئے خلوصِ نیت سے دعا دی۔ پھر وہ شام بھرپور انداز میں گزار کے دوسرے دن علی الصباح ان کی دعاؤں کے سائے میں شہروز ٹریننگ پر چلا گیا۔

زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر چل نکلی تھی۔ ابھی عمار کو خود کو ثابت کرنے کے لیے لمبی جدوجہد کرنی تھی۔ محنت اس کے خون میں شامل تھی۔ جلد ہی اس کی محنت کو ساتویں آسمان سے سند پزیرائی بخشی جانے لگی۔ وہ انصاف کا علم بردار تھا کیسے ناکامی اس کے پیچھے بھاگتی۔ وہ غریبوں کا فی سبیل اللہ مددگار بن جاتا جبکہ صاحبِ ثروت لوگوں سے منہ مانگی فیس لیتا۔ اسے اپنی ماں کی قربانیوں کا دل سے احساس تھا۔ اکثر جب تنہائی میں بیٹھ کے سوچتا تو اسے شہروز کے خدشات جائز لگتے۔ فارحہ نے انیس بیس کے فرق سے ممانی جیسی ہی فطرت پائی تھی۔

☆☆☆

ایک کیس کو سلجھاتے اسے رات کے دو بج رہے تھے لیکن جب وہ رائٹنگ ٹیبل سے اٹھا تو کئی دلائل ایسے ذہن میں اکٹھے کر چکا تھا جو یقیناً سفاک مجرم کے چہرے پر پڑا شرافت کا ریشمی مکھوٹا نوچ پھینکنے والے تھے۔ مجرم فیروز ملک نے بڑے ہی دھڑلے سے اس کی موکلہ تسنیم جو کہ بیوہ تھیں ان کے گھر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس بات کا گواہ پورا محلہ تھا مگر اب فیروز کے خلاف گواہی دینے کو ایک بھی شخص تیار نہیں تھا۔ اس نے صرف ایک لمحے کو تسنیم کے یتیم بچوں کی جگہ خود کو رکھا تھا۔ اگلے ہی پل فیصلہ از خود ہو گیا۔ وہ تسنیم کا کیس بنا کسی معاوضے کے لڑ رہا تھا۔ مخالف پارٹی کے پاس یہ گواہی دینے کے لیے پورا محلہ تھا کہ تسنیم جس مکان کی دعویدار ہے وہ فیروز ملک کی ملکیت ہے۔ جبکہ عمار علیم کے پاس خدا کے سوا نہ کوئی مددگار تھا نہ ہی کوئی زور۔

رات کی خنکی عروج پر تھی۔ دور دور تک پھیلے سناٹے میں عجیب وحشت زدہ ویرانی تھی۔ گویا رات میں جیسے سارے زمانے کی سیاہیاں گھل گئی تھیں۔ اپنے لیے کافی بنا کے ٹیرس پر چلا آیا۔ پھر جانے کیا سمائی کہ فارحہ کو کال ملا بیٹھا جو ریسیو نہیں کی گئی۔ اس نے مسکرا کے موبائل جیب میں ڈالا اور جیسے ہی پلٹنے لگا ٹھٹک کے رک گیا۔ پھر سرعت سے زمین پر بیٹھا۔ ایک شخص ڈارک براؤن گرم چادر میں لپٹا ان کے گھر کے سامنے رکا تھا۔ اس کا ہر انداز مشکوک تھا اس سے پہلے کہ عمار کچھ سمجھ پاتا اس شخص نے چادر میں سے گن نکال کے ہوائی فائر کیا۔ عمار بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیاں اتر کے لاؤنج میں آیا سامنے ہی حسب توقع آسیہ متوحش سی ننگے پاؤں کمرے سے نکلی تھیں۔

’’ارے اماں آپ کیوں اٹھ گئیں کچھ بھی نہیں ہوا۔ آج شادی ہے اگلی گلی میں کسی کی اس لیے خوشی میں فائرنگ کر رہے ہیں۔‘‘ خود کو مکمل طور پر کمپوز کرتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ اس سے پہلے کہ آسیہ اس کی بات کو سچ مان کے مطمئن ہوتیں زوردار آواز سے ان کے گھر کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تھا۔

’’کیوں ماں سے جھوٹ بولتے ہو عمار! شادی کی خوشی میں کوئی ہمارے گھر کے شیشے کیوں توڑے گا۔ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے۔‘‘ اسے گھیر کے آسیہ نے کچھ اس انداز میں پوچھا کہ اسے ساری کتھا من وعن بتاتے ہی بنی۔

’’اتنے دن سے وہ لوگ تمہیں دھمکیاں دے رہے ہیں اور تم مجھے آج بتا رہے ہو۔ تم تو مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاتے تھے پھر اب کیوں؟‘‘ آسیہ کی ڈبڈبائی آنکھوں میں عمار کا عکس دھندلا رہا تھا۔

’’اس لیے نہیں بتایا کہ کہیں آپ خوفزدہ ہو کے مجھے حق کے راستے سے ہٹانے کی کوشش نہ کریں۔ میرے پاس خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں اس لیے وہ مجھے ڈرا کے یہ کیس چھوڑ دینے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ جانتے نہیں کہ سارا زمانہ ایک طرف خدائے واحد کی مدد ایک طرف۔ جب وہ میرے ساتھ ہے تو میں گیدڑ بھبکیوں سے کیوں گھبراؤں۔ ویسے بھی اماں وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جب تک اللہ نہ چاہے۔ اور یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کہ موت برحق ہے ایک دن ضرور آئے گی پھر گھبرانا کیسا۔‘‘ مضبوط لہجے میں کہتا اب وہ ان کے کاندھے پر دونوں ہاتھ جمائے انہیں سمجھا رہا تھا۔

’’تمہیں کیوں لگا عمار کہ میں تمہیں حق کے راستے سے ہٹاؤں گی۔ مجھے اپنے بیٹوں پہ فخر ہے۔ حق اور سچ کی راہ میں اپنے ماں باپ کا نام روشن کرتے ہوئے تم لوگ اگر حیاتِ جاوداں بھی پالو گے تب بھی اپنی ماں کو صبر کی اعلیٰ مثال ہی پاؤ گے۔‘‘ خوشی سے تمتماتے چہرے سے عمار کو اپنے ساتھ کا یقین دلاتی آسیہ کا سر فخر سے بلند تھا۔

’’بہت شکریہ امی دیکھیے گا میں ان ظالموں کو ان کے منطقی انجام تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔‘‘ چٹان جیسے حوصلے سے روشن ہوتی آنکھیں ماں پر مرکوز کیے اب وہ اپنے عہد کی تجدید کر رہا تھا۔ تقدیر نے مسکرا کے اس ناقابلِ شکست شخص کو دیکھا تھا۔ آسمان سے کُن کی صدا بلند ہو چکی تھیں اب کائنات فیکون کے اسباب میں منہمک تھی۔

باہر مکمل خاموشی تھی۔ شاید دلوں میں دہشت پھیلانے پر معمور شیطان اپنا ہنر آزما کے جا چکا تھا۔ دفعتاً کائنات پر تہجد کی اذان کا پُرفسوں لمحہ ٹھہر گیا۔ دونوں ماں بیٹوں نے تہجد کی نماز ادا کی۔ دلوں کے بھید جاننے والے رب نے سمندر سا سکون ان کے دلوں میں اتارا تھا۔

☆☆☆

’’تمہیں کچھ پتا چلا کل فصیحہ بھابی آئی تھیں۔‘‘ اسے دال چاول کی پلیٹ تھماتے ہوئے شمیلہ نے رازداری سے بتایا اور گروسری کے بیگ کھول کے خریدی گئی اشیاء کی گنتی کرنے لگیں۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی تو بازار سے آئی تھیں۔

’’امی! پھر وہ ہی سادے دال چاول آپ کو پتا بھی ہے کہ میں دال چاول فرائی مرچوں کے بنا نہیں کھاتی پھر بھی آپ یہ سادے دال چاول میرے

سامنے رکھ دیتی ہیں آئے روز۔‘‘ نخوت سے کہتی فارحہ پلیٹ سمیت پیر پٹختی کچن میں جا گھسی۔

’’اے بی بی! تو بڑی کسی نواب کی اولاد ہے جو سادے دال چاول تمہارے حلق سے نہیں اترتے۔ گئے وہ عیش کے دن جب تیرا باپ جیبیں بھر کے پیسے لاتا تھا۔ اللہ سمجھے اس آفیسر کو جس نے انکوائری کے بعد ذیشان صاحب کو جاب سے ٹرمینیٹ کروا دیا۔ اب فیکٹری کی پرائیویٹ نوکری میں یہ دال دلیا بھی چل جائے تو بڑی بات ہے۔‘‘ سامان کچن میں لا کے رکھتے ہوئے انہوں نے ایک چھلکتی ہوئی نظر دھلی ہوئی مرچوں میں مسالا بھرتی فارحہ پر ڈال کے کہا۔

’’چلو کسی نواب کی نہ سہی آپ کی تو اکلوتی بیٹی تو ہوں ناں۔ میری پسند ناپسند کا خیال رکھ لیا کریں۔ اب اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہوئے ہمارے حالات کہ چھوٹی چھوٹی عیاشیوں سے بھی جائیں۔‘‘ فارحہ نے مرچوں کو کھولتے تیل کے سپرد کرتے ہوئے اکتا کر کہا۔

’’کتنی بار کہا ہے کہ یونیورسٹی سے آکے پہلے یونیفارم بدل لیا کرو اب مجھ میں پہلے جیسی ہمت نہیں رہی۔ نہ تم بچی رہی ہو کہ روز تمہارا یونیفارم دھوؤں۔‘‘ اسے آئل والے چکنے ہاتھ سفید یونیفارم سے رگڑتے دیکھ کے گویا شمیلہ جھلس کر رہ گئی۔

’’کس نے کہا آپ سے کہ آپ دھوئیں میں خود دھو لوں گی۔ آپ یہ بتائیں کہ فصیحہ آنٹی کیسے یہاں کا راستہ بھول گئیں۔‘‘ مرچوں کو پلٹتے ہوئے ماں کو موضوع سے ہٹانے کی خاطر اس نے سوال کیا۔ جس پر کیبنٹ صاف کرتے شمیلہ کے ہاتھ ایک پل کو رکے۔

’’وہ اویس کے لیے تمہارے رشتے کی بات کرنے آئی تھیں۔‘‘ مختصر الفاظ میں بم پھوڑتی اب وہ مسالے ڈبوں میں بھر رہی تھیں۔ فارحہ تو جیسے یہ سن کے اچھل ہی پڑی۔

’’اس تربوز کی یہ جرأت کہ فارحہ ذیشان کا ہاتھ مانگے۔ اس سرکس کے بندر نے اپنی شکل شیشے میں نہیں دیکھی۔ آئے تو کسی کل یونیورسٹی ایسی درگت بناؤں گی

اس کی کہ یاد کرے گا۔ ویسے تو میسج کر کر کے دماغ خراب کر دیتا ہے یہ نہیں بتا سکتا تھا۔" فارحہ نے چولہا بند کر کے فرائی مرچیں اپنی پلیٹ میں منتقل کیں اور حقارت سے کہتی چلی گئی۔

"کیا مطلب وہ تمہاری یونیورسٹی آتا ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ گھر جا کے ایسے لتے لیتی اس کے کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔" اپنے کام سے فارغ ہوتی شمیلہ نے طیش کے عالم میں کہا تو فارحہ نظر چراتی کمرے میں آ گئی۔

"اویس تمہیں تنگ کرتا ہے تم نے بتایا نہیں مجھے۔" شمیلہ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے اسے عمیق نگاہوں سے دیکھتیں اب جوابدہی کر رہی تھی۔ فارحہ زبان کے پھسلنے پر جی بھر کر پچھتائی۔

"اس کی کیا جرأت کہ وہ مجھے تنگ کرے منہ نہ توڑ دوں میں اس کا۔ ویسے بھی کوئی شکایت والی بات ہی نہیں تھی میں کیا بتاتی آپ کو۔ بس کبھی کبھی وہ مجھے یونیورسٹی سے پک کرنے آ جاتا ہے۔ میں بھی سوچتی ہوں چلو پبلک ٹرانسپورٹ میں دھکے کھانے سے بچ گئی۔ آپ تو جانتی ہیں بابا مجھے لینے نہیں آ سکتے پھر کیا مضائقہ ہے اگر مفت کے ملازم سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔" رغبت سے اپنی پلیٹ ختم کر کے اب وہ انگلیاں چاٹتے ہوئے بے پروائی سے بولی۔

"آئندہ تم اس کے ساتھ واپس نہیں آؤ گی۔ تم اپنی تائی کی فطرت سے واقف نہیں ہو۔ اپنے سارے جہان کے نکمے بیٹے کو تمہارے پلے باندھنے کی پوری کوشش کرے گی وہ۔ اس کی جگہ آسیہ کا عمار ہوتا تو میں ایک لمحہ بھی نہ لگاتی سوچنے میں۔" شمیلہ نے اب کے انسے ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے قطعیت سے فیصلہ سنایا۔

"فکر کیوں کرتی ہیں اماں! عمار صاحب بھی میری مٹھی میں ہیں۔ بہت جلد پھپھو کو بھیجیں گے رشتے کے سلسلے میں۔" فارحہ نے اب کے کچھ لجاتے ہوئے انہیں دل کی بات بتائی۔

"واہ میری بیٹی تو بڑی سمجھدار ہے۔ میری بچی اس لفنگے اویس کی باتوں میں آ کے زندگی برباد کرنے تل جائے گی تو۔ دیکھ فارحہ ایک پڑھا لکھا کامیاب لڑکا ہی خوشیوں بھری زندگی دے سکتا ہے تمہیں۔" وہ بیلے قدرے خوش ہوتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ساتھ رکھی ٹوکری سے پالک کے پتے چننے لگیں۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں! آسیہ پھپھو کہیں انکار نہ کر دیں بس یہی ڈر ہے۔" فارحہ اپنے خدشات کا اظہار کرتی خالی پلیٹ لے کے کچن میں چل دی۔

"آسیہ انکار نہیں کرے گی۔ جو لوگ رشتوں کی آبیاری اپنے خون سے کرتے ہیں وہ رشتوں کو کھونے سے بہت ڈرتے ہیں۔ یہاں تو بات بھی اس کے عزیز از جان بیٹے کی ہے۔ تم بس کوشش کرنا کہ تم اور عمار شادی کے بعد الگ ہو جاؤ۔ کیونکہ ان ماں بیٹے کے درمیان جتنے فاصلے ہوں گے تمہاری زندگی اتنی ہی سکھ سے گزرے گی۔" شمیلہ نے اپنا گہرا تجزیہ بیان کیا اور آخر میں نصیحت کرنا بھی نہ بھولی۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا، عمار جیسا فرمانبردار بیٹا کبھی اچھا شوہر ثابت نہیں ہو سکتا۔ نئے نقش بنانے کے لیے پرانے نقوش کھرچ کے مٹانے ہی پڑتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں عمار کو آسیہ پھپھو سے چھین کے اپنے اشاروں پر نچا لوں گی۔" تکبر کے گہرے احساس میں ڈوبی فارحہ گویا لمبی پلاننگ کیے بیٹھی تھی۔

"واہ بھئی، میری بیٹی تو مجھ سے بھی چار ہاتھ آگے نکلی۔ شروع میں ذیشان اپنی بہن پر بڑی جان دیتے تھے۔ میں نے بھی نہایت سمجھداری سے اسے اپنی گرہستی پہ پر نہیں مارنے دیا۔ کچھ وقت نے بھی ساتھ دیا اور میں ذیشان کو پوری طرح آسیہ سے برگشتہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔" فخریہ بتاتے ہوئے وہ اب کچن کا رخ کر چکی تھیں۔ فارحہ نے اطمینان سے نیم دراز ہو کے کانوں میں ہینڈ فری ٹھونسے اور گانے سننے لگی۔

☆☆☆

آج انہیں اسٹور سے آنے میں بہت دیر ہو گئی۔ ان کی جگہ ڈیوٹی پر آنے والے ڈیوڈ نے فون کر کے آج آنے سے معذرت کر لی تھی سو انہیں ڈبل ڈیوٹی کے لیے رکنا پڑا۔ اب انہیں تیسری شفٹ کے مائیکل کا انتظار تھا۔ ایاز چونکہ شارقہ کو پک کرتا ہوا گھر جاتا تھا سو مجبوراً اسے بھی یہاں ہی رکنا پڑا۔ وہ امریکا کے ایک اسٹور میں سیلز گرل کی جاب کرتی تھی جبکہ ایاز ایک ہوٹل میں ویٹر کی جاب کرتا تھا۔ وہ دونوں مل کے کماتے تھے پھر اپارٹمنٹ کا رینٹ اور ماریہ کی فیس ادا کرنے کے بعد ان کے پاس بمشکل اتنے ڈالر بچتے تھے کہ وہ سارا مہینہ آسانی سے دو وقت کی روٹی کھا سکیں۔ چونکہ ایاز اکلوتا تھا اور اب ماں باپ کے بعد اسے پاکستان پیسے نہیں بھیجنے ہوتے تھے سو کئی سال بچت کے بعد انہوں نے ایک گاڑی لی تھی اور ایک فلیٹ بک کروایا تھا۔ گھر کے خرچ کے بعد جو پیسے بچتے وہ اپارٹمنٹ کی اقساط کی مد میں خرچ ہو جاتے۔ وہ لوگ گاڑی لے کے خوب تنگ ہوئے تھے۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ ان دونوں میں سے جسے بھی ڈبل شفٹ لگانے کا کہا جاتا وہ بخوشی کر لیتا۔ بہرحال انہیں گاڑی جیسی سہولت کی اشد ضرورت تھی۔

خدا، خدا کر کے مائیکل آیا تو دونوں اپنے اپارٹمنٹ آ گئے۔ ماریہ کھانا کھا کے سو چکی تھی۔ وہ ویسے بھی امریکا کی ہنگامہ خیز زندگی کی عادی تھی۔ ایاز نے احتیاطاً اسے فون بھی کر دیا تھا سو ماریہ کھانا کھا کے سو چکی تھی۔

"آج تو تھکن سے گویا ہڈیاں تک ٹوٹ رہی ہیں۔ تم کافی بناؤ تب تک میں فریش ہو آؤں۔" اپارٹمنٹ کا دروازہ ڈپلیکیٹ چابی سے کھول کے اندر آتے ہی شارقہ نے فرمائش جھاڑی تو ایاز مسکرا دیا۔ شارقہ کی آواز سے ہی نقاہت ٹپک رہی تھی۔

"سوچ لو اس وقت کافی پی لی تو نیند بھاگ جائے گی۔ پھر مت کہنا ایاز نے بدمزہ کافی پلا کے نیند اڑا دی۔" ایاز نے کافی بنانے کی مشقت سے جان چھڑانے کی خاطر ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

شب غم تمام شد

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کچھ پیاری عادات

1۔ چلتے وقت نگاہ نیچی رکھتے۔
2۔ سلام میں ہمیشہ پہلے کرتے۔
3۔ مہمان نوازی خود کرتے۔
4۔ نفل نماز چھپ کر پڑھتے۔
5۔ فرض عبادت سب کے سامنے کرتے۔
6۔ بیمار کی مزاج پرسی کرتے۔
7۔ جب کھڑے ہوتے غصہ آتا تو لیٹ جاتے۔
8۔ مسواک کرتے۔
9۔ عشاء سے پہلے کبھی نہ سوتے۔
10۔ کبھی کھل کر نہ ہنستے، صرف مسکراتے۔

از: ناہید نعیم، ملتان

کربلا

ہے مٹی کربلا کی گواہ! شہدائے اسلام کی
حق کے لیے خانوادۂ رسول کے اِک، اِک بچے نے جان دی

بھوکے پیاسے جیالے میدانِ جنگ میں اترے
نظامِ الٰہی کی حفاظت کے لیے قربانی دی

علی اصغرؓ نے اپنے پنگھوڑے میں جان دی
امام حسینؓ نے زخموں کی تاب نہ لا کر دی

شمر بدبخت نے حسینؓ کا سرتن سے جدا کیا
یزید نے قیامت تک کے لیے ملامت لی

فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے بیٹوں نے جو کارنامہ کیا
رہتی دنیا تک داستانِ لہو رقم کی

شجاعت، صداقت اور امامت دنیا سے ختم نہ ہو
اس لیے انصاف کے لیے جسم کے آخری قطرے تک لڑائی کی

دریائے فرات کے کنارے یہ سبق دے گئے دنیا کو
ایمان نے باطل کے سامنے کسی صورت نہ جھکنے کو ترجیح دی

کاوش: صبا احمد

''نہیں کہتی بابا اب تم بہانے مت بناؤ اور جلدی سے کافی بناؤ۔'' شارقہ بشاشت سے کہتے ہوئے ایاز کو کچن میں دھکیلتی خود روم میں آ گئی۔ ایاز زیرِ لب بڑبڑاتا کافی بنا کے جب روم میں پہنچا تو شارقہ نہ صرف فریش ہو چکی تھی بلکہ فون پر بار، بار آنے والی کال ناگواری سے کاٹ بھی رہی تھی۔

''کیا ہوا کس کی کال ہے جو بار، بار کاٹ رہی ہو۔'' ہیٹنگ آن کر کے اپنا کپ اٹھاتے ایاز نے استفسار کیا تو شارقہ کے چہرے پہ نئے سرے سے ناگواری پھیل گئی۔

''کچھ نہیں امی کال کر رہی ہیں بار،بار۔'' ایک بار پھر بجتی بیل کو اگنور کر کے اس نے موبائل ہی آف کر دیا۔

''تم شاید دنیا کی پہلی عورت ہو جو اپنی سگی ماں کی کال پر ناگواری کا اظہار کر رہی ہو۔ ورنہ عورتیں تو میکے کی طرف سے آئی ہوا کا بھی بہت خوش دلی سے استقبال کرتی ہیں۔'' صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے اس نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں ایاز! لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ امریکا میں رہنے والے بڑے امیر ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہاں کی پُرمشقت زندگی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' افسردگی سے کہتے ہوئے اس نے بھاپ اڑاتا کافی کا کپ اٹھایا۔

''یہ بھی اللہ کی خاص عنایت ہے کہ وہ اپنے بندوں کا بھرم قائم رکھتا ہے ہم کیا ہماری بساط کیا۔ اب وہ بات بتاؤ جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔'' ایاز نے سچے دل سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اسے کریدا۔

''کئی دن سے امی ہر کال پر اصرار کر رہی ہیں کہ میں اویس کو بلوا لوں۔ بھلا یہاں آ کے وہ کیا کرے گا۔ یہاں ہماری دو وقت کی روٹی جانے کیسے پوری ہوتی ہے اس تیسرے کی ذمے داری کیسے لے لوں میں۔'' شارقہ نے مختصر سی کتھا سنا کے اپنی توجہ کافی کی طرف مرکوز کر لی۔ چند لمحے بوجھل سی خاموشی کی نذر ہوئے۔

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے بلا لو تم اسے۔ رہ گئی بات ذمے داری کی تو یہاں جاب کرے اور اپنا ذمے داری خود اٹھائے۔'' ایاز نے اپنے تئیں معاملے کا معقول حل پیش کیا۔

''آپ نہیں سمجھتے وہ بہت لاابالی فطرت کا لڑکا ہے۔ اس کے لیے کہیں بھی ٹک کے جاب کرنا ایک مشکل امر ہے۔ وہ پاکستان میں جاب نہیں کرتا یہاں آ کے کیا کرے گا۔'' شارقہ نے ڈھکے چھپے انداز میں ایاز کو اویس کے بارے میں بتایا۔

''پاکستان میں اور یہاں میں بڑا فرق ہے شارقہ! پاکستان میں اسے انکل آنٹی کی مکمل سپورٹ حاصل ہے۔ وہ کچھ نہ بھی کرے تب بھی اسے کھانے کو اچھا کھانا پہننے کو اچھا لباس ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کام میں دل نہیں لگاتا۔ جبکہ یہاں کا یہ اصول ہے کہ کھانا جان توڑ محنت کے بعد ہی ملتا ہے۔ میں اسے بلوانے کی اور اس کی جاب کی کوشش کرتا ہوں۔'' ایاز نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا جس پر شارقہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔ وہ ایاز کو کیسے سمجھاتی کہ اویس جیسا کام سے جی چرانے والا شخص الٹا ان پر ذمے داری کا بوجھ ثابت ہوگا۔

''آپ سوچ لیں یہ نہ ہو کہ بعد میں آپ کو پچھتانا پڑے۔'' شارقہ نے ایاز کو باز رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔

''میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کے ہی کیا ہے۔ اگر اویس یہاں آ جائے گا تو اپارٹمنٹ کا آدھا رینٹ وہ دے دیا کرے گا۔ اس کے علاوہ ماریہ کو اسکول لانے لے جانے کے ساتھ، ساتھ باہر کے کئی کام بھی سنبھال لے گا۔ تم کرو بات آنٹی سے۔'' ایاز نے اپنے فیصلے کے سب روشن پہلو اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے فسیحہ سے بات کرنے کو کہا۔

''یہ سب تو تب ہوگا ناں جب وہ اپنی ذمے داریاں سمجھے گا اور کہیں ٹک کے جاب کرے گا۔ جبکہ مجھے تو ڈر ہے اس جیسا نازک مزاج یہاں سیٹ بھی نہیں ہو پائے گا۔ الٹا آپ کا پیسہ برباد ہوگا۔'' شارقہ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی کنپٹیاں سہلائیں۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو وہ اپنی ذمے داریاں بھی سمجھے گا اور ٹک کے جاب بھی کرے گا۔ کیونکہ میں اسے آتے ہی باور کروا دوں گا کہ یہاں سر پر چھت اور پیٹ بھرنے کی عیاشی وہ ہی افورڈ کرتا ہے جو محنت سے کماتا ہے۔ پھر دیکھنا اس کے اچھے بھی کمائیں گے۔'' ایاز کے سخت لہجے نے اس کی خوب تسلی کروا دی کہ بہرحال وہ بھی چاہتی تھی کہ اویس زندگی کو سنجیدہ لے۔

''کل کو اس کی شادی ہوگی اس کی بیوی کو ہم کہاں رکھیں گے؟'' اس ایک اور حل طلب سوال ایاز کی طرف اچھالا۔

''یہیں ہمارے ساتھ رہے گی اور کہاں رہے گی۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ اس کی شادی ہو جائے تمہیں ہی سہولت ہوگی ویسے بھی چھٹی کے ایک دن میں تمہیں کتنے کام تنہا نمٹانے پڑتے ہیں۔ اویس کی بیوی آ جائے گی تو گھر کی ذمے داریاں کم ہو جائیں گی تمہاری۔'' ایاز نے کہا تو شارقہ مکمل طور پر قائل ہوتے ہوئے مسکرا دی۔

''واہ جناب آپ تو بڑی دور کی کوڑی لائے، میں کل ہی اماں سے بات کرتی ہوں۔ اویس تو سن کے اچھل ہی پڑے گا وہ تو شروع سے یہاں آنا چاہتا تھا میں ہی ہمیشہ ٹالتی رہی۔'' شارقہ نے مطمئن ہوتے ہوئے سرشار لہجے میں کہا تو اویس بھی مسکرا دیا۔

پھر چھ ماہ بعد اویس ان کے گھر میں تھا۔ ایاز اپنے ریسٹورینٹ میں اس کے لیے کلینر کی جاب ارینج کر چکے تھے۔ اویس کے والہانہ استقبال کے دوسرے ہی دن ایاز نے اسے باور کروا دیا تھا کہ وہ اگر جاب چھوڑ کے آئے گا تو اسے اپارٹمنٹ میں گھسنے نہیں دیا جائے گا۔ جس پہ اویس نے اوپری دل سے ہی سہی مگر دل لگا کے جاب کرنے کی حامی بھر لی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ آنے والے ماہ و سال اس سے کوئی اچھا سلوک روا نہیں رکھنے والے تھے۔ وہ فی الحال امریکا آ جانے پر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ماں باپ کی محبت بھری چھاؤں میں زندگی گزارنے والے جب زندگی کی کڑی دھوپ کا سامنا کرتے ہیں تو جھلس جاتے ہیں۔

☆☆☆

وہ ٹک سک سے تیار اماں کو دوست کی طرف جانے کا بتاتا گھر سے نکلا تھا۔ اسے جھوٹ بول کے آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر کیا کرتا انہیں اور دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابھی رات ہی کی تو بات تھی اس نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اس لیے رشتے والی آنٹی کو زحمت نہ دی جائے۔ جانے کیوں مگر آسیہ نے آگے سے ایک بھی لفظ کہے سنے بنا خاموشی اختیار کر لی تھی۔ عمار جو برملا فارحہ کو اپنی پسند کے روپ میں متعارف کروانا چاہتا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی چپ سادھ گیا۔ بے چینی تھی یا شرمندگی مگر اسے ایک پل چین نہیں تھا۔ تب ہی اضطراب حد سے سوا ہوا تو وہ فارحہ سے ملنے کی نیت سے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ تسنیم بی بی کے کیس میں الجھ کر ان دنوں وہ اردگرد سے بیگانہ ہوا پڑا تھا کئی دن سے فارحہ سے بھی بات نہیں ہو پائی تھی۔ سو سرپرائز دینے کے چکر میں وہ فارحہ کو فون پر اپنے آنے کی اطلاع بھی نہ دی۔

وہ جب فارحہ کے گھر پہنچا راستے میں ہی ذیشان ماموں مل گئے جو عصر کی نماز کے لیے نکل رہے تھے۔ اسے دیکھ کے بڑے تپاک سے ملے اور اسے اندر جانے کا کہہ کے خود مسجد کی طرف چل دیے۔ وہ مسکراتا ہوا کھلے دروازے سے بنا دستک دیے اندر داخل ہو گیا۔ لاؤنج کی طرف بڑھتے اس کے قدم اپنے نام کا ذکر آنے پر ٹھٹک کر رک گئے۔

''بھلا عمار جیسے عام سے وکیل سے شادی کر کے مجھے ملنا بھی کیا تھا۔ تمام زندگی سمجھوتے اور غربت میں کاٹنے سے بہتر تھا کہ میں راستہ ہی بدل لیتی۔'' فارحہ نے خوشی سے کھنکتے ہوئے لہجے میں کہہ کر اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں بجی چلاسی انگوٹھی کو کوئی ہزار ویں بار نہارا تھا۔

''تو اور کیا وقت رہتے صحیح فیصلہ کرنے والے لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کنگلے عمار سے شادی

کر کے تم اس کی ماں کی جوتیاں ہی سیدھی کرتی رہتیں تمام عمر۔" نخوت سے کہتی شمیلہ نے گویا فارحہ کو حوصلے کی تھپکی دی تھی۔ عمار کا ذہن اب بھی معاملے کا سرا نہیں کھوج پایا تھا کہ شمیلہ کے اگلے ہی جملے نے سب راز اس بھونڈے انداز میں افشاں کر دیے کہ عمار کو دیوار کا سہارا لینا پڑا۔

"پھر کس کو پتا تھا سارے جہان کا نکما اور نکھٹو اویس امریکا چلا جائے گا۔ یہ تو تیری خوش قسمتی ہے کہ وہ عقل کا اندھا جاتے ہوئے تجھ سے منگنی کر گیا۔" شمیلہ نے مٹر کے دانے نکالتے ہوئے کہا تو فارحہ تنک کر گویا ہوئی۔

"خوش قسمت تو وہ ہے جسے مجھ جیسی پڑھی لکھی لڑکی مل رہی ہے ورنہ وہ خود کیا ہے گیارھویں فیل نکما اور نکھٹو۔ ویسے اماں وہ کہہ رہا تھا وہ جلد ہی مجھے بھی امریکا بلوالے گا۔ اُف اماں میں امریکا جیسے ملک میں رہوں گی تم نہیں جانتی یہ میرا کتنا بڑا خواب تھا۔" فارحہ اب لہجہ بدلے انہیں اپنے اولین خواب کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔

"خوش رہے میری بیٹی کبھی کسی حاسد کی نظر نہ لگے تجھے۔ مگر اب ایک بات کا خاص خیال رکھنا عمار سے کبھی رابطہ نہ کرنا۔ جان چھڑا اس ٹٹ پونجیے سے ساری عمر جوتیاں چٹخا کے بھی وہ تمہیں امریکا کی عیش و عشرت والی زندگی نہیں دے سکتا۔" فارحہ کے متبسم چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے ماں نے اس کی بلائیں لے ڈالیں پھر سنجیدہ لہجے میں نصیحت کرنا بھی نہ بھولیں۔

"ارے میرا تو اس سے کئی دن سے کوئی رابطہ ہی نہیں۔ اور نہ ہی اب میں اس سے کوئی رابطہ رکھنا چاہتی ہوں۔" انگوٹھی کو انگلی میں گھماتی وہ قطعیت سے بولی تو عمار لڑکھڑاتے قدموں سے واپس ہولیا۔ جبکہ شمیلہ کہہ رہی تھیں۔

"اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ اویس نے فون کر کے کسی بھی قسم کا جہیز بنانے سے انکار کر دیا ہے۔ نصیحہ بھابی کو بھی بڑی جلدی ہے اگلے ہفتے نکاح کی تاریخ مانگ رہی ہیں کاغذات وغیرہ بنوانے ہیں [illegible] وجہ سے۔ ہم نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ [illegible] ویسے ہم خوش۔" شمیلہ مٹر کی ٹوکری اٹھائے [illegible] ہوئیں تو فارحہ نے بھی گنگناتے ہوئے [illegible] جہاں سے آتے ذیشان اب عمار کے بارے میں [illegible] کر رہے تھے۔ جس پر لاعلمی کا اظہار کرتی ان دونوں ماں بیٹی نے سکھ کی سانس لے کر یوں ہاتھ جھاڑے جیسے کہہ رہی ہوں خس کم جہاں پاک۔

یوں ہفتے بعد ہی فون پر نکاح ہوا اور کچھ ہی مہینوں میں فارحہ دو جوڑوں میں رخصت ہو کر اپنے خوابوں کی سرزمین پر اتری۔ اس کے آتے ہی [illegible] شارقہ گھر کی ذمے داریاں اس پر لاد کے بے فکر ہو گئی۔ جانے اس کی آمد منحوس ثابت ہوئی تھی کہ اویس کا اپنی فطرت کے عین مطابق اس نوکری سے دل بھر گیا تھا۔ شادی کے محض ایک ہفتے بعد ہی اویس نے معمولی جھگڑے پر جاب کو لات مار دی تھی۔ اس رات ایاز نے ان دونوں کو اپارٹمنٹ سے باہر نکال دیا تھا۔ ہڈیوں کے گودے تک کو جماتی سخت ٹھنڈی ہوا اور آسمان سے برستی برف گویا ان کے صبر کا امتحان لینے کے لیے کافی تھی۔

"ویسے میں نے پہلے تم جیسا ڈھیٹ انسان نہیں دیکھا۔ میرے آتے ہی جاب چھوڑ دی آفرین ہے تمہارے لالچی اور خود غرض بہن بہنوئی پر بھی کہ جب تک تم پیسے کماتے رہے تو یہ ہمارے لاڈ اٹھاتے رہے۔ آج ذرا سی مشکل کیا آئی نکال باہر کھڑا کیا۔" دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر گرم کرنے کی ناکام کوشش کرتی فارحہ اطمینان سے اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کے گانے کی دھن پر سیٹی بجاتے اویس کو دیکھ کے شعلہ بار لہجے میں کہا۔

"ہاں ایاز بھائی کچھ الٹی کھوپڑی کے بندے ہیں مگر دل کے بہت اچھے ہیں۔ تم نئی ہو ناں یہاں اس لیے ٹھنڈ زیادہ محسوس کر رہی ہو ورنہ اتنی ٹھنڈ نہیں ہے۔ میرے ساتھ تو ایسا یہ چوتھی بار ہو رہا ہے۔ آج تو شکر

ہے کہ کھانا کھا کے باہر پہنچا ورنہ اکثر ٹھنڈ کے ساتھ بھوک بھی برداشت کرنا پڑتی تھی مجھے۔ لیکن تم فکر مت کرو دیکھنا میں صبح ایاز بھائی کو منا لوں گا۔" اپنی ازلی بے پروائی سے اسے تسلی دیتا وہ پھر سے سیٹی بجانے لگا تو فارحہ کے تلووں سے لگی اور سر پر بجھی۔

"تم نے یہاں مجھے ذلیل کروانے کے لیے بلوایا ہے گھٹیا آدمی۔ میری ہی قسمت پھوٹی تھی کہ تم جیسے نکھٹو اور ہڈ حرام سے پالا پڑ گیا میرا۔" فارحہ نے گویا ماتھا پیٹ کر اپنی قسمت کو کوسا۔

"میں ناکام اور نالائق ہی سہی مگر تمہاری طرح شاطر اور لالچی اور بن پیندے کا لوٹا نہیں کہ جہاں زیادہ فائدہ نظر آیا اُدھر لڑھک گیا۔ تم خود کو دیکھو تم کیا ہو خود سے گھن نہ آنے لگے تو کہنا۔" کمال اطمینان سے اس کی ذات کے بخیے ادھیڑتا اب وہ اٹھ کے ٹہل رہا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو بدذات انسان تمہیں آئینہ دکھایا ہے تو بپھر کے مجھ پر ہی کیچڑ اچھالنے لگے۔ اچھا کرتے ہیں ایاز بھائی تمہارے ساتھ تم اسی قابل ہو کہ کما کے بھی انہیں دو اور پھر ان کی دھتکار بھی سہو۔" غم و غصے کی شدت سے پاگل ہوتی فارحہ اب ہذیانی انداز میں جو منہ میں آیا بکتی چلی گئی۔

"ایک آئینہ میرے پاس بھی ہے جس میں تمہاری اوقات واضح کر کے سمجھا سکتا ہوں میں مگر کہتے ہیں ناں کہ سمجھدار کو اشارہ کافی۔" اویس کے لہجے میں کیا کچھ نہیں تھا فارحہ نے گھبرا کے رخ پھیرا۔ اویس طنزیہ مسکرا دیا اس جیسا کائیاں شخص قسمت کے گرداب میں ضرور پھنسا تھا مگر فارحہ جیسے کمزور حریف کو پچھاڑنے کی ہمت اب بھی رکھتا تھا۔

پھر صبح کی پہلی کرن ساتھ ہی ایاز کے باہر نکلنے پر اویس، ایاز کے پاؤں پکڑے سڑک پہ ہی بیٹھ گیا۔ فارحہ ششدر سی پُرتعیش زندگی کے جھوٹے دعوے کے ساتھ امریکا بلانے والے اپنے مجازی خدا کو دیکھ رہی تھی۔ جو اب ایاز کے جوتوں پر سر رکھے دل لگا کے نوکری کرنے کے وعدے کر رہا تھا کہ بہرحال ساری رات سڑک پر فریز ہونے کے بعد اس کے کس بل نکل چکے تھے۔ اویس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اس کا پاسپورٹ ایاز کے پاس تھا جیب میں اس کے پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ جبکہ فارحہ جان گئی تھی کہ اب اس کی زندگی کٹھنائیوں سے بھری ہوئی گزرنے والی ہے۔

☆☆☆

خوشی نام کی چڑیا جیسے اس کے من آنگن سے روٹھ گئی تھی۔ اس دن فارحہ کے گھر سے آنے کے بعد گویا وہ ایک احساسات سے عاری مشین بن گیا تھا۔ کام کام کام اور صرف کام اس کا مقصد حیات بن گیا تھا۔ اس کی اس قدر سنجیدگی پر افسردہ ہوتی آسیا اکثر خود احتسابی میں مبتلا ہو جاتیں اور خود کو بیٹے کی مجرم گرداننے لگ جاتیں۔ عمار نے کیا غلط کیا تھا اپنی پسند سے شادی ہی کرنا چاہتا تھا انہیں اپنا دل بڑا کرنا چاہیے تھا۔ اکثر ان کا دل چاہتا وہ عمار سے کھل کر بات کریں اور اسے بتائیں کہ اس کی خوشی میں راضی ہے۔ مگر نہ جانے کیوں عمار نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ علی الصباح نکل جاتا اور رات گئے واپسی ہوتی۔

یہ عمار کی انتھک محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ اس نے نہ صرف تسنیم کو اس کی زمین واپس دلوائی تھی بلکہ نامزد ملزموں کو سزا بھی دلوائی تھی۔ اتنے دن سے وہ تسنیم کے حق میں گواہی دینے کے لیے ہی تو کچھ باضمیر لوگوں کو قائل کر رہا تھا۔ لیکن قائل وہ علی احمد کے سوا کسی کو نہیں کر پایا۔ علی احمد جو بیرون ملک مقیم اپنے اکلوتے بیٹے کی واپسی کے دن گنتے ہوئے اپنی زندگی کاٹ رہا تھا وہ ملک فیروز کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ لیکن اس بات کو چنداں راز نہیں رکھا گیا۔ جس کے نتیجے میں فیروز کے غنڈوں نے غریب علی احمد کے گھر میں دھاوا بولا تھا مگر تاک میں بیٹھی پولیس کے شکنجے میں آ گئے۔ پھر عمار کے دوست ایس پی فاران علی کے حکم پر پولیس کے تھرڈ ڈگری ٹارچر پر طوطے کی طرح فیروز کے سب کارنامے اور سب خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں اگل دیا۔

شومئی قسمت کہ فیروز جلد گرفتار بھی ہوگیا۔ پھر پورے محلے نے فیروز کے خلاف گواہی دی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو خود فیروز کے ظلم کے ڈسے ہوئے تھے مگر مصلحتاً خاموش تھے۔ یوں کیس کا پانسا پلٹا تھا اور عمار یہ کیس جیت گیا۔ یہ ایک انقلاب تھا ان کے علاقے کو ایک جابر غنڈے سے نجات ملی تھی۔ اچھائی کو برائی پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ ہر اخبار ہر نیوز چینل پہ پولیس کی اتنی بڑی اچیومنٹ اور تسنیم کے کیس کے ساتھ ساتھ ایڈووکیٹ عمار علیم کی فہم و فراست کا بھی چرچا تھا۔ مگر عمار کا دل گویا اداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن تھا۔ اسے فارحہ کا اسے ریجیکٹ کر دینا برا نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ اسے یہ گلٹ ہی کھائے جاتا تھا کہ اس جیسا سمجھدار شخص فارحہ جیسی خود غرض لڑکی کو پسند ہی کیوں کر بیٹھا کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ انسان کی عادت تو بدلی جا سکتی ہے مگر فطرت نہیں۔ اب بھی اسی شرمندگی میں غلطاں وہ ٹیرس پر عالمِ اضطراب میں ٹہل رہا تھا جب آسیہ بیگم بھاپ اڑاتی کافی لیے اس کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ وہ سر جھٹکتا ہوا وہیں پڑی کین کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

"پریشانیاں یا شکایتیں جب حد سے بڑھ کے نظامِ زندگی پر اثر انداز ہونے لگیں تو انہیں بانٹ لینا چاہیے عمار علیم! کیا تم اب اپنی ماں سے اپنی پریشانی کی وجہ بانٹنا بھی نہیں چاہتے۔" کافی کا مگ اسے تھما تیں وہ اب خنک ہوا سے الجھتے اس کے گھنے بال سنوار رہی تھیں۔

"جس کی آپ جیسی مہربان ماں ہو پریشانی کی کیا جرأت کہ اس کے قریب بھی پھٹکے۔ رہ گئی بات شکایت کی تو شکایت تو آپ کو مجھ سے ہوگی جس پر میں شرمندہ ہوں۔ آپ نے مجھے پالا پڑھایا ایک قابل انسان بنایا آپ کو پورا حق ہے کہ آپ جہاں چاہیں میری شادی کریں۔ میں نادان تھا بھٹک گیا تھا کیا میری مہربان ماں مجھے معاف کر سکتی ہے۔" عمار نے صدقِ دل سے آسیہ کے ہاتھ تھام کر ندامت کا اظہار کیا تو آنسو پلکوں کی باڑ پھلانگتے آسیہ کے ہاتھ پہ آگرے۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو عمار! میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ میں نے تمہارے لیے جو کیا میرا فرض تھا کوئی احسان نہیں جس کے بدلے میں تم سے زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کا اختیار چھین لوں۔" گلوگیر لہجے میں صدقِ دل سے کہتی آسیہ اس کے سامنے والی چیئر پر آبیٹھیں۔ عمار کے دل سے گویا اک بہت بڑا بوجھ اترا تھا۔

"ماں کا کوئی احسان بھی اولاد اپنے کسی عمل سے چکا نہیں سکتی اماں۔ آپ کو ہر فیصلہ کرنے کا اختیار ہے بغیر کسی توجیح پھر کسی حجت کے۔" عمار نے صدقِ دل سے کہہ کر کافی کا سپ لیا۔

"اچھا بابا میں اپنی خوشی سے اس لڑکی کو بہو بنانا چاہتی ہوں جسے تم پسند کرتے ہو۔ اب شرافت سے اس کا نام اگل دو ورنہ کل شہروز آکے خود اگلوا لے گا تم سے۔" آسیہ نے شرارت سے اسے دیکھتے ہوئے تبسم لہجے میں سوال کیا تو اب کی بار عمار بھی کھل کے مسکرا دیا۔

"اس کا نام ریمل اشفاق ہے۔ لا کالج میں میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ لیکن آپ کو نہ پسند آئی تو کوئی بات نہیں۔ پھر جو آپ کہیں گی وہ ہی ہوگا۔" مستحکم لہجے میں کہتا وہ اٹھنے لگا تو آسیہ نے پیچھے سے آواز دی۔

"پھر کب لے کر جا رہے ہو مجھے ریمل کے گھر۔"
آسیہ بھی اس کے ساتھ اٹھ کے کچن کی طرف آئیں۔
"جب آپ کہیں۔ ابھی یہ بتائیں کہ کیا بنایا ہے۔" وہ ان کے پیچھے کچن میں آیا تھا۔

"دال روٹی۔" زیرِ لب مسکراتے ہوئے آسیہ نے مختصر اً بتایا جانتی تھی کہ ناپسند ہونے پر بھی عمار کبھی کسی کھانے پر ناگواری کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

"اماں جانی! میں نے دال کے ساتھ روٹی نہیں کھانی۔" ایک مدت کے بعد اس نے پُرشرارت انداز میں برسوں پرانا گانا گایا تو آسیہ کے لبوں پر دلفریب ہنسی بکھر گئی۔ آسیہ نے مسکراتے ہوئے انڈا آلو قتلے کا سالن اور تازہ روٹیاں ٹیبل پر چن دیں۔ تو عمار ان کی طرف دیکھ کے کھل کر مسکرا دیا۔ ساری کلفتیں دھل گئی تھیں اب خوشیاں ہی خوشیاں ان کی منتظر تھیں۔

❁❁❁

اختر شجاعت

حقوق العباد......حکمِ الٰہی

تمام تر حمد وثنا اللہ رب العزت کے لیے جو ہمارا مالک، خالق اور رازق ہے۔ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو یکتا ولاشریک ہے۔ اسی کے لیے حمد و ستائش ہے وہی زندگی اور موت دینے والا ہے اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اور ہر چیز پر اسے قدرت حاصل ہے۔ اے اللہ! تو کرم و بخشش کرنے والا اور ہر عیب سے پاک ہے تو جود و سخا کرنے والا اور بزرگ و برتر ہے...... اے وہ ذات...... جو حاجت طلبی کی آخری منزل ہے اور اے وہ ذات جس سے مرادیں پوری ہوتی ہیں تو بے شک بڑے فضل والا اور قدیم احسان کرنے والا ہے اور اپنے لطف و کرم سے بہت بخشنے والا ہے۔ بے شک تو بزرگی اور اعزاز والا ہے۔

اے اللہ! تو حضرت محمدؐ پر اور ان کی آلؑ پر اور ان کے اصحابؓ پر رحمت نازل فرما...... جس طرح تو نے ان کے وسیلے سے ہماری رہنمائی فرمائی۔ ان کے ذریعے ہمیں گمراہی کے بھنور سے نکالا...... آمین۔

اللہ تعالیٰ نے ہم پر بہت کرم فرمایا۔ کہ ہمیں اپنے پیارے حبیبؐ کا امتی بنایا۔ آج ہمارا موضوع "حقوق العبادؒ" ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کائنات میں بھیجا اور اسے کامیاب زندگی گزارنے کے طریقے بتائے تاکہ انسان دونوں جہانوں (دنیا و آخرت) میں کامیابی حاصل کرے...... اور یہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے احکامات کی اطاعت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

حقوق دو طرح کے ہیں جو ہم پر عائد ہوتے تھے۔

ا۔حقوق اللہ...... ۲۔حقوق العباد......

آج ہم بات کریں گے حقوق العباد کی۔

انسان ایک معاشرتی حیوان (social animal) ہے۔ اس دنیا میں وہ اپنے وجود، بقا، نشوونما، تحفظ اور ترقی کے لیے دوسرے انسانوں کا محتاج ہے۔ ہر فرد کو دوسرے فرد یا افراد کے مفادات کے حصول کے لیے جو کچھ دینا ہے اور جو ذمے داری ادا کرنی ہے اسے اس کا فرض (duty) کہتے ہیں اور جو اس نے دوسروں سے لینا ہے یا جس کی وہ دوسروں سے توقع رکھتا ہے جس پر اس کی ضرورتوں کا انحصار ہے اسے اس کا حق (right) کہتے ہیں۔ حقوق و فرائض کی اسی اساس (base) پر خاندانی، عائلی اور اجتماعی زندگی کی عمارت قائم ہے۔ اور ان ہی حقوق و فرائض کی درست اور دیانت دارانہ ادائیگی پر کامیابی کا انحصار ہے۔

اسلام میں انسان کے حقوق و فرائض کا دائرہ بہت وسیع ہے جو افراد کے حوالے سے والدین، زوجین، خاندان، ہمسایہ، معاشرہ تک پھیلے ہوئے ہیں، اسلام میں حقوق العباد کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور اسی لیے ہر فرد کے حقوق کو بہت واضح کیا ہے اور حقوق سے بڑھ کر فرائض پر زور دیا ہے کیونکہ ہر فرد اپنے فرائض کو ذمے داری سے ادا کرے تو یہی چیز دوسروں کے حقوق کی ضامن ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے محبت اور خلوص رکھتا انسان کو اللہ کے قریب کر دیتا ہے۔ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کا ارشاد مبارک ہے کہ ''بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔''

حقوقِ والدین: حقوق العباد میں سب سے زیادہ اہمیت والدین کی ہے پھر عزیز و اقارب، ہمسائے، اساتذہ، غربا، مساکین، نادار وغیرہ آتے ہیں۔

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کا ابتدائی تعلق جن ہستیوں سے قائم ہوتا ہے وہ اس کے والدین ہیں۔ جو اولاد کی پرورش کی خاطر اپنا آرام و آسائش سب ترک کردیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب نے ماں، باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے کی تاکید کی ہے۔ ان کی اطاعت، ان کی فرمانبرداری اور ان کی خبر گیری کی تعلیم دی ہے۔ قرآن کریم حقوق کی ترتیب میں والدین کے حقوق اللہ تعالیٰ کے حقوق کے فوراً بعد بیان کرتا ہے...... ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اور ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہ کروگے اور والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کروگے۔'' (سورۂ بقرہ)

''اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ نیکی کرو......'' (سورۂ نسا)

سورۂ لقمان میں اللہ تعالیٰ نے جہاں ...... اپنے بندے پر ادائے شکر کو واجب قرار دیا ہے اس کے ساتھ ماں، باپ کا شکر ادا کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔

''تو میرا اور اپنے ماں، باپ کا شکر ادا کر......''

حدیث میں باپ کی رضامندی کو اللہ کی رضامندی اور باپ کی ناراضی کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی قرار دیا ہے۔

ایک شخص نے آکر سوال کیا...... ماں، باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا...... ''وہ تیرے لیے جنت بھی ہیں اور دوزخ بھی......'' یعنی ان کی خدمت کرکے انسان جنت بھی حاصل کرسکتا ہے اور ان کی نافرمانی دوزخ تک بھی لے جاسکتی ہے۔

ماں، باپ کی سب سے زیادہ خدمت کا وقت ان کی ضعیفی کی عمر ہوتی ہے۔ جب اعضا کمزور ہوجاتے ہیں توانائی ختم ہوجاتی ہے۔ عمر کے ساتھ، ساتھ مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ اولاد کو اس وقت والدین کی باتیں ناگوار گزرتی ہیں ایسے دور کی خدمت جس حد تک واجب ہے اور جس انداز میں کرنی چاہیے اس کی وضاحت قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے کہ ''اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کردیا کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں، باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف بھی نہ کہو...... اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان کے ساتھ ادب سے بات کرنا۔''

اس سے اندازہ کیجیے سخت الفاظ میں بات کرنا تو درکنار اُف تک نہ کہنا...... گستاخی اور ان کو جھڑکنا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ان سے ادب و احترام سے گفتگو کی جائے۔ والدین پر روپیہ خرچ کرنا...... ان کی ضروریات پوری کرنا، مرنے کے بعد ان کا قرض ادا کرنا، ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا اولاد پر قرض ہے۔ ماں، باپ کے لیے بخشش کی دعا نبیوں کی سنت ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ اطاعت والدین کو ایک تمثیل کے ذریعے بیان فرمایا...... تین مسافر راہ میں چل رہے تھے کہ اچانک تیز بارش شروع ہوگئی۔ اب ان لوگوں نے ایک غار میں پناہ لی...... اتفاقاً غار کے منہ پر ایک بہت بڑا پتھر آگرا۔ اور غار کا منہ بند ہوگیا۔ ان لوگوں کو موت سامنے نظر آئی سوائے اللہ تعالیٰ کے اب کوئی سہارا نہیں تھا چنانچہ ان تینوں نے اپنی، اپنی نیکیوں کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے التجا کرنی شروع کی...... ایک شخص نے بتایا کہ میں بکریاں چراتا تھا جب شام کو گھر واپس آتا تو دودھ پہلے اپنے والدین کو پیش کرتا اور بعد میں بچوں کو دیتا۔ ایک دن میں بکریاں چراتے، چراتے دور نکل گیا اور دیر سے گھر واپس آیا میرے والدین سوچکے تھے۔ میں دودھ لے کر اُن کے سرہانے کھڑا ہوگیا میں انہیں جگانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ ان کے آرام میں خلل پڑے گا۔ مجھے یہ گوارا بھی نہیں تھا کہ میں والدین سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ دوں...... میرے بچے بھوک سے بلکتے رہے لیکن میں اسی طرح پیالہ لے کر اُن کے سرہانے کھڑا رہا۔ اے خدا......! تو یہ جانتا ہے کہ یہ کام میں نے صرف تیری ہی رضا اور خوشنودی کے لیے کیا ہے تو غار سے پتھر کو ہٹا دے چنانچہ وہ پتھر تھوڑا سا سرک گیا۔ اس کے بعد دوسرے مسافروں نے بھی اپنی، اپنی نیکیوں کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے التجا کرنی شروع کی یہاں تک کہ وہ پتھر مکمل طور پر ہٹ گیا اور ان کو نجات نصیب ہوئی۔

یوں تو ماں، باپ دونوں ہی اولاد کے لیے تکالیف اٹھاتے ہیں لیکن ماں کی تکالیف باپ کی نسبت زیادہ ہیں، چنانچہ ماں کا اسلام نے درجہ بھی زیادہ رکھا ہے۔ احادیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کی نافرمانی کو حرام قرار دیا ہے۔ اس طرح ماں کے قدموں کے نیچے جنت کی بشارت دی گئی ہے۔

ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور سوال کیا...... یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم......! میرے حُسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ اس نے یہی سوال تین بار دُہرایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تینوں بار جواب میں ''تیری ماں'' کہا اور چوتھی بار کے سوال پر ''تیرا باپ......'' کہا۔ اسلام میں جہاد کی بے حد اہمیت ہے لیکن ماں، باپ کی خدمت اس پر حاوی ہے۔

ایک بار ایک شخص جہاد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''تیری ماں زندہ ہے؟'' اس نے جواباً ہاں کہا تو فرمایا...... ''جا...... اسی کی خدمت کر یہی تیرا جہاد ہے۔''

ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا...... ''کیا میں بتاؤں کہ بڑے، بڑے گناہ کون سے ہیں؟'' صحابہ نے عرض کی...... ضرور...... یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تب فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا ...... ماں، باپ کی نافرمانی کرنا......'' ماں، باپ اگر مشرک ہوں تو بھی ان کے ساتھ بدسلوکی کی اجازت نہیں...... حضرت اسماءؓ کی والدہ ان سے ملنے کے لیے تشریف لائیں آپ اس وقت تک ایمان نہیں لے کر آئی تھیں۔ حضرت اسماءؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تشریف لائیں اور کہا۔ ''میری ماں میرے پاس آئی ہیں اور انہیں اسلام سے کوئی رغبت نہیں...... میں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں؟'' بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جواب آتا ہے کہ ''ان کے ساتھ نیک سلوک کرو......''

اللہ تعالیٰ ماں، باپ کی دعائیں اولاد کے حق میں قبول فرماتا ہے...... حضرت امام بخاریؒ کی بینائی بچپن میں ہی چلی گئی تھی۔ ان کی والدہ ان کے لیے سخت پریشان تھیں وہ اپنے بچے کے لیے گڑگڑا کر دعا کرتی تھیں۔ آخر ایک دن خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ بچے کی بینائی واپس آنے کی بشارت دے رہے ہیں جب صبح اٹھیں تو ان کے بچے کی آنکھیں روشن تھیں...... سبحان اللہ......

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعاؤں کی قبولیت کے لیے ماں، باپ سے رجوع کرنے کی نصیحت فرمائی ہے۔

ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا مجھ سے ایک گناہ کبیرہ ہوا ہے کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''کیا تیری ماں زندہ ہے؟'' اس نے عرض کیا نہیں...... دریافت کیا۔ ''تیری خالہ زندہ ہے؟'' جواب دیا ہاں...... فرمایا ''اس کے ساتھ نیکی کرو......''

حقیقی والدین کے ساتھ رضاعی والدین کے بھی حقوق بیان کیے گئے ہیں...... تو ماں، باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا نیکی کرنا بہت اہم ہے کہ ماں، باپ کو محبت اور شفقت کی نظر سے دیکھنا بھی ثواب

ہے...... اللہ تعالیٰ اس پر ایک نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ دیتا ہے اس پر صحابہ کرامؓ نے فرمایا...... اگر دن میں سو مرتبہ دیکھے تو فرمایا...... "ہاں اللہ تعالیٰ بڑا اور پاکیزہ ہے۔"

اولاد کے حقوق: دنیا کے مختلف مذاہب کی تعلیمات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تو تاکید ہے لیکن اولاد کے حقوق کے معاملے میں وہ سب خاموش ہیں۔ لیکن ہمارے مذہب اسلام میں معاشرے کے کسی طبقے کے حقوق کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ نہ صرف اولاد بلکہ تمام چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت ان کی مناسب دیکھ بھال کی تعلیم دی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مختصر سے فقرے میں انتہائی جامعیت کے ساتھ رغبت دلائی۔ "جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔" چھوٹوں پر جس شفقت کی تاکید ہے ان میں پہلا درجہ انسان کی اولاد ہے۔

اولاد کا پہلا حق جو تسلیم کروایا گیا وہ ان کا حق زندگی ہے۔ اسلام سے قبل بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا عام تھا...... یہ ظالمانہ کام ماں، باپ برضا و رغبت انجام دیتے تھے۔ اپنے بچوں کو دیوتاؤں کے نام چڑھاتے اور قربان کرتے تھے۔ دوسرا اپنی غربت کے پیشِ نظر بھی قتل کر دیتے تھے۔

تب قرآن نے وضاحت کر دی...... کہ ہر ایک کو رزق دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ہر ایک کی روزی اس کے پاس مقرر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "اپنی اولاد کو غربت کے خوف سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے۔"

تو اولاد کے قتل کو انتہائی سنگین جرم قرار دیا۔ اولاد کشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض قبائل لڑکیوں کی پیدائش کو شرمندگی اور بے عزتی کا باعث سمجھتے تھے اور انہیں زندہ دفن کر دیتے تھے۔

اولاد کی زندگی تسلیم کروانے کے بعد والدین کا یہ فرض بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان کی پرورش کا اہتمام کریں...... ماں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنے بچے کو دو سال تک دودھ پلائے۔ اگر کسی مجبوری کے باعث ایسا نہ کر سکے تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے اور باپ اس کی اجرت ادا کرے...... جب تک یہ بچہ بلوغ تک نہ پہنچ جائے اس کی کفالت باپ کی ذمے داری ہے۔

ایک صحابی کا آخری وقت تھا اور ان کے پاس کافی مال تھا انہوں نے اپنا پورا سرمایہ خیرات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "تم اپنے اہل و عیال کو غنی چھوڑ کر جاؤ یہ بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ تمہارے بعد دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔"

کفالت کے ساتھ اولاد کی تعلیم و تربیت بھی والدین کی ذمے داری ہے...... اولاد کی تعلیم و تربیت کے ساتھ، ساتھ ان سے محبت و شفقت کا سلوک بھی کیا جائے...... یہ محبت صرف لڑکوں کے لیے نہیں بلکہ لڑکیوں دونوں سے یکساں ہونی چاہیے...... اولاد کا یہ حق بھی والدین کو ہے کہ ان کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے لڑکوں کو لڑکیوں پر فوقیت نہ دی جائے۔ اسلام نے بیٹی کو بھی وراثت میں حقدار ٹھہرایا ہے۔

حقوق زوجین: انسان کے تمام رشتوں میں قانون ازدواج اس اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے کہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی انداز پر وہ اس سے دوچار ہوتا ہے۔ اسلام نے خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے عورتوں اور مردوں دونوں کے حقوق بیان کر دیے اور یہ لازم کر دیا کہ شوہر اور بیوی اپنے، اپنے دائرہ میں رہ کر ان کو ادا کریں...... عورت اور مرد کے تعلقات کے لیے قرآن کریم میں لباس کا اشارہ استعمال کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو......" (سورۂ بقرہ)

"اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے ہیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو...... اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی......" (سورۂ روم)

شوہر کے فرائض...... اسلام نے بیویوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے، ان سے محبت کا برتاؤ کرنے ان کی ضروریات کا خیال رکھنے ان کے جذباتی تقاضوں کی تکمیل کے لیے شوہروں کو خصوصی ہدایات دیں...... بیوی کا مقام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں کتنا بلند ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے یہ حدیث کافی ہے کہ "تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں بہتر ہیں۔"

حجۃ الوداع کے موقع پر بھی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیویوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے متعلق خصوصی احکامات دیے۔

"عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کے بارے میں میری وصیت قبول کرو، وہ تمہارے قبضے میں ہیں، تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں مگر یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں۔"

ایک اور جگہ فرمایا۔ "اپنی بیوی میں کوئی برائی پا کر اس سے نفرت مت کرو...... اگر تم غور کرو گے تو کوئی بھی اچھی بات بھی اس میں نکل آئے گی۔"

بیوی کے فرائض: بیوی کا یہ فرض ہے کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے لیکن مرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بیوی سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مطالبہ کرے کیونکہ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں...... اب اگر کوئی شوہر، بیوی کو فرض نماز، روزہ سے روکتا ہے یا ناجائز خواہش کا ارتکاب کرنے کا حکم دیتا ہے تو بیوی، شوہر کے ایسے احکامات ٹھکرا سکتی ہے۔

بیوی کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے مال، عزت اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا......

"عورت جب پانچ وقت کی نماز پڑھے اور رمضان کے روزے رکھے اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے تو وہ جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔" (اس کا اسے اختیار ہے)

رشتے داروں کے حقوق: ماں، باپ اور میاں، بیوی کے بعد انسان کا واسطہ قرابت داروں اور رشتے داروں سے پڑتا ہے۔ قرابت کی گرہ وہ ہے جسے اللہ نے لگایا ہے۔ اس میں بندے کی مرضی و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے...... یعنی ہمارے ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، خالہ، ماموں، چچا، پھوپی وغیرہ وہ ہستیاں ہیں جن سے ہمارا تعلق خالق نے ہماری پیدائش سے قبل ہی قائم فرما دیا۔ حقوق قرابت کی بہت اہمیت ہے...... ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "اور ماں باپ اور قرابت داروں کے ساتھ نیکی کرنا......"

"اے نبی......! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...... کہہ دیں کہ فائدے کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں، باپ، رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں کے لیے ہو......" قرابت کا حق ادا کرنے کو صلۂ رحم کہا جاتا ہے...... یعنی مستحق اور نادار رشتے داروں کی مالی مدد کی جائے تاکہ وہ باوقار زندگی بسر کر سکیں...... صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فطرہ، عشر وغیرہ) کا اولین حقدار رشتے داروں کو قرار دیا گیا ہے...... بشرطیکہ وہ مستحق ہوں اگر وہ صاحبِ نصاب ہوں تب بھی عطیات، تحائف اور ہدیوں کے ذریعے ان کی دلجوئی کرنا مستحسن ہے۔

صلۂ رحمی کا حکم صرف اس صورت میں نہیں ہے کہ دوسری جانب سے پہل ہو یا کم از کم حُسنِ سلوک کا مثبت جواب ملے بلکہ دوسرے کے مثبت یا منفی رویے کی پروا کیے بغیر اپنا فرض ادا کرتے رہنا چاہیے، یہ نہ ہو کہ محض ادلے کا بدلہ ہو...... قطع رحم کرنے والوں کے لیے قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ یہ لوگ گمراہ اور فاسق ہیں، یعنی قطع رحمی سخت قابلِ مذمت ہے اگر آج کے انسان کو قرآن کی تعلیم کا صحیح علم ہوتا اور شریعت کے

مفہوم سے واقفیت ہوتی تو آج کا انسان اپنے یار دوستوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور خونی رشتے داروں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور وہ ہمدردی اور غمخواری کو ترستے رہتے ہیں ان کے ساتھ بیگانگی اور غیروں کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ حدیث مبارکہ ہے کہ...... ''رشتے داری کو قطع کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا......''

اساتذہ کے حقوق: اسلام اور دنیا کے تمام مہذب معاشروں میں علم کی فضیلت مسلم ہے۔ کیونکہ علم معرفت الٰہی ہے......اور علم دین کا ہو تو انسان معرفت ربانی اور عشق رسالت کے خزانے سمیٹتا ہے......تو علم جیسی چیز اتنی اعلیٰ و ارفع اور افضل ہے تو اس کا ذریعہ اور واسطہ یعنی معلم اور استاد بھی اتنا محترم و معزز ہوگا......منصب معلم کوئی معمولی منصب نہیں ہے۔ استاد کی تعظیم، تکریم اور احترام شاگرد پر واجب ہے۔ کیونکہ ادب کے بغیر علم تو شاید حاصل ہو جائے لیکن فیضان علم، انوار علم اور برکات علم سے انسان یقیناً محروم رہتا ہے۔

پڑوسی کے حقوق ہمسایہ کے حقوق: وہ افراد جو ایک دوسرے کے قریب رہتے ہیں وہ ہمسائے کہلاتے ہیں......انسان بنیادی طور پر ایک دوسرے کی مدد کا محتاج ہے، لہٰذا ایسے مواقع پر وہی ہستیاں کام آتی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہوتی ہیں، دنیا کے دیگر مذاہب نے بھی ہمسائے کے حقوق کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً توریت میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ''تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے، اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر......''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا......''تو اپنے پڑوسی سے ایسی محبت کر جیسی اپنے آپ سے کرتا ہے۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف پڑوسی سے محبت کرنے یا اس کے گھر کا لالچ نہ کرنے پر خاموشی نہیں فرمائی بلکہ پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کو ایمان کے ساتھ مشروط کر دیا اور فرمایا ''خدا کی قسم مومن نہیں، خدا کی قسم مومن نہیں، خدا کی قسم مومن نہیں......'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کون؟ آپ نے جواب فرمایا...... ''وہ جس کے ہمسائے اس کی برائیوں سے محفوظ نہ ہوں......''

حضرت بایزید بسطامیؒ کا ایک آتش پرست ہمسایہ تھا جس کا ایک شیر خوار بچہ تھا وہ بچہ رات کی تاریکی پر مسلسل روتا رہتا تھا۔ آپؒ ہر روز چراغ اٹھا کر اس کے گھر لے جاتے تو بچہ خاموش ہو جاتا۔ جب وہ آتش پرست ہمسایہ اپنے سفر سے واپس آیا تو بچے کی ماں نے حضرت بایزید بسطامیؒ کے سلوک کے بارے میں سارا حال سنایا......اس نے کہا۔ افسوس ہے۔ جب شیخ کی طرف سے روشنی پہنچ گئی تو پھر ہم اپنے آپ کو غفلت کی تاریکی میں کیوں رکھیں۔ اس کے بعد وہ آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں دو خواتین تھیں ان میں سے ایک رات دن عبادت کرتی تھی لیکن بد زبان ایسی تھی کہ پڑوسیوں کو سخت پریشان کیے رکھتی تھی۔ دوسری طرف ایک عورت صرف فرض عبادات انجام دیتی اور غریبوں کو کچھ کپڑا بانٹ دیا کرتی تھی مگر کسی کو ستاتی نہ تھی۔ جب دونوں کے بارے میں آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلی کے بارے میں فرمایا......''اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی بد اخلاقی کی سزا بھگتے گی۔'' اور دوسری کے بارے میں فرمایا......''وہ جنتی ہوگی۔''

ہمسایوں سے بہتر تعلقات کے لیے ایک دوسرے کو تحائف وغیرہ دینا چاہیے اس کے علاوہ کوئی بھی چیز پکی ہو تو وہ بھی ایک دوسرے کو بھیجنا چاہیے جس سے آپس میں محبت بڑھتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ہمسایہ مالی طور پر کمزور ہے تو اس کا خیال رکھنا چاہیے اسے قرض کی ضرورت ہو تو اسے دینا چاہیے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''وہ شخص مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہے۔''

ایک یہودی نے حضرت مالک بن دینارؒ کے پڑوس میں مکان کرائے پر لیا جہاں آپ کا عبادت خانہ بالکل دیوار کے ساتھ تھا۔ یہودی نے بغض و عناد کے سبب اپنے مکان کی چھت پر ایک پرنالہ بنایا جو عین آپ کے عبادت خانے میں جا کر گرتا تھا۔ اور پھر اس پرنالے میں سے اپنے گھر کی تمام نجاست اور گندگی بہانی شروع کر دی۔ جس سے آپ کی عبادت گاہ ناپاک اور خراب ہو جاتی اور ایک مدت تک وہ یہودی یہ حرکت کرتا رہا مگر حضرت مالک بن دینارؒ نے کسی سے اس کا شکوہ اور شکایت نہیں کی......آخر کار وہ یہودی خود آپؒ کے پاس آیا اور کہا......اے ابن دینار! آپ کو میرے پرنالے سے کسی طرح کی تکلیف تو نہیں پہنچی......آپؒ نے فرمایا۔ وہ نجاست جو آپ کے پرنالے سے گرتی ہے اسے دھو ڈالتا ہوں اور بس......یہودی آپ کی بات پر سخت حیران ہوا اور کہا یا حضرت! آپ روزانہ اس تکلیف کو کیسے گوارا کرتے ہیں اور اس غم و غصے کو کیسے ضبط کرتے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا......میرے رب کا ارشاد ہے کہ جو لوگ غصے کو رد کرتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں خدا ان سے دوستی فرماتا ہے پس ہم لوگ دنیا میں اپنے اللہ سے دوستی کرنے کے لیے آئے ہیں۔ دشمنی پیدا کرنے کے لیے نہیں آئے......وہ یہودی آپ کی بات پر فوراً بول اٹھا کہ واقعی آپ اللہ کے پیارے ہو......مجھ سے خطا ہوئی اور اب میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہونا چاہتا ہوں......اور وہ آپ کے سلوک کے باعث مسلمان ہو گیا۔

☆☆☆

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاشرے کے ہر طبقے کے ساتھ رحم و ہمدردی کی تاکید فرمائی......محبت و نرمی، تہذیب و اخلاق کے جس طرز عمل کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے ہے۔ میرے آقا کا حسن سلوک ہر ایک کے ساتھ بے مثال تھا۔ جو کافر عورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوڑا پھینکتی تھی آپؐ نے اس کی مزاج پرسی فرمائی۔

اسی طرح ایک یہودی لڑکا بیمار ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی عیادت کے لیے گئے، نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ان کی مہمان نوازی فرمائی......غرض اسلام وہ دین ہے جو سراسر امن و سلامتی کا علمبردار ہے جس کا پیغام محبت اور مروت ہے جہاں ہر اس فرد کے لیے پناہ ہے جو فتنہ و فساد نہ پھیلانے والا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پر مخلوقِ خدا کے لیے حقوق عائد کر رکھے ہیں، جن کو اچھے طریقے سے ادا کرنے سے اللہ بہت راضی ہوتا ہے......اور اس شخص کو نعمتوں اور قربتوں سے نوازتا ہے۔ حقوق العباد کی ادائیگی اسلام میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

بھوکے کو کھانا کھلانا، رفاہ عام کے کام کرنا، پیاسے کو پانی پلانا، محتاجوں کی ضروریات پوری کرنا، ضرورت مندوں کو کپڑے پہنانا، کسی کی بیماری میں خدمت کرنا غرضیکہ ہر وہ کام جس سے دوسروں کی بھلائی مقصود ہے اس سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں اور یہ انسان کے گناہوں کا کفارہ بھی بن جاتا ہے۔

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک فرمان ہے کہ ''تم میں سے کوئی اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہ چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے دوسرے کے حوالے کرتا ہے جو شخص،

اپنے مسلمان بھائی کی حاجت برداری میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری کرتا ہے جو شخص کسی مسلمان سے تکلیف دور کرتا ہے اللہ اس کے بدلے قیامت کی تکالیف دور کرتا ہے جو ستر پوشی کرتا ہے اللہ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی کرے گا......"

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی سے یادِ خدا یا ذکرِ خدا کو منہا کر دیا جائے تو باقی جو کچھ بچتا ہے وہ حقوق العباد کی ادائیگی ہے۔ خدمتِ خلق ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا دینوی وسیلہ صرف یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا خادم بن جائے...... کیونکہ تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے...... اور اللہ کے نزدیک سب سے محبوب انسان بھی وہ ہے جو اس کی مخلوق کے حقوق ادا کرتے ہوئے ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کریں...... میرے آقا کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

☆☆☆

اتنے حقوق ایک دوسرے کے ہیں غور طلب بات یہ ہے کہ اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ کس قدر ہم ایک دوسرے کے حقوق پامال کر رہے ہیں جہاں جس کا موقع لگا اس کا حق مار لیا...... جھوٹ، دھوکا دہی، مار پیٹ، گالم گلوچ، چوری، زنا کاری، ناپ تول میں بے ایمانی غرضیکہ ہر برائی جو صرف کسی ایک قوم میں ہوتی تھی جس کی بنا پر پوری، پوری قومیں تباہ ہو گئیں...... انتہائی دکھ کی بات ہے کہ آج ہر برائی اس امت میں سرایت کر گئی ہے...... دینی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے انتہائی پستیوں میں جا گرے ہیں...... آج اپنی اخلاقی پستیوں کے باعث زوال کا شکار ہیں...... خدارا...... سنبھل جائیں اب تو سنبھل جائیں...... موت سر پر کھڑی ہے توبہ کا دروازہ بند ہونے سے پہلے اس کی بارگاہ میں توبہ کر لیں...... اور ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں، آپس میں محبت کریں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں...... اے کاش...... ہمیں ہوش آ جائے...... اللہ رب العزت ہمیں ہدایت دے ہماری رہنمائی فرمائے اور ہمیں گمراہیوں سے نکال کر اللہ کی بارگاہ میں سرخرو ہونے کا موقع دے۔

کیونکہ حقوق العباد کا معاملہ انتہائی سنجیدہ ہے اور اس کی معافی نہیں ہے جب تک مطلوبہ شخص آپ کو معاف نہ کرے...... تو اپنے، اپنے حقوق ادا کریں اور اپنے رب کو راضی کریں...... اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے...... آمین۔

حرفِ آخر:

اپنے عظیم رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی کوتاہی یا آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات میں کوئی غلطی دانستہ یا نادانستہ ہوگئی ہو تو اے میرے مہربان رب! اپنی اس کنیز کو معاف فرما دے۔ (آمین)

حقوق العباد بہت وسیع ٹاپک ہے جس پر بہت زیادہ لکھا جا سکتا تھا۔ میں نے مختصراً حقوق بیان کیے وہ بھی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ آج کل ہر کوئی اپنا حق مانگتا ہے مگر اپنا فرض ادا کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں اور ہم کس قدر ایک دوسرے کی حق تلفی کر رہے ہیں امید ہے اس مضمون کی روشنی میں شاید ہمیں اپنے چہرے، اپنے معاملات نظر آئیں اور ہم اپنے معاملات سدھار سکیں۔

اللہ کریم ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ جن قابلِ احترام ہستیوں کی کتب سے مضامین منتخب کیے اللہ کریم ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

☆☆☆

۱۔ احیاء العلوم...... حضرت امام ابو حامد محمد الغزالی
۲۔ مکاشفۃ القلوب...... حضرت امام ابو حامد محمد الغزالی
۳۔ تذکرۃ الاولیاء...... حضرت فرید الدین عطارؒ
۴۔ بستان اولیاء...... حافظ مولانا محمد اسحاق دہلوی
۵۔ ہمارا اخلاق...... حضرت علامہ عالم فقری
۶۔ اسلامیات لازمی...... پروفیسر مفتی منیب الرحمن صاحب
۷۔ دین کامل...... محترمہ نزہت رئیس

انداز نو

بنتِ زیب

آسٹریلیا میں مقیم ذہین، بذلہ سنج، خوش بیان، ملنسار اور بلند حوصلہ

ڈاکٹر طیبہ صفی علوی

بنتِ زیب

ڈاکٹر طیبہ صفی اپنے ہم سفر صفی علوی کے ساتھ

ڈاکٹر طیبہ صفی نہایت ذہین اور باصلاحیت خاتون ہیں۔ دورانِ تعلیم شادی ہوگئی۔ خوش بختی سے آپ بیاہ کر ایسے گھرانے میں گئیں جو علم پرور بھی ہے اور ادب نواز بھی آپ کے سسر پروفیسر رئیس علوی ممتاز ماہرِ تعلیم، دانشور اور شاعر تھے۔ طیبہ صفی کو ڈاکٹر طیبہ صفی بنانے میں آپ کا کردار بہت اہم ہے آپ کے مسلسل تعاون، رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے بالآخر طیبہ صفی کی پی ایچ ڈی کرنے کی خواہش پوری ہوئی۔ آپ کی ساس بلقیس رئیس صاحبہ بھی